میں نے کابُل بَستے دیکھا

محمد مقصود احمد



میں نے کابل بستے دیکھا

تحریک اسلامی طالبان اور امارتِ اسلامیہ افغانستان
کا تاریخی اور تحقیقی جائزہ

مصنف
محمد مقصود احمد

ناشر



نام .... میں نے کابل بستے دیکھا

مصنف .... محمد مقصود احمد شہید

اشاعت اول تا دوم .... تعداد ۲۲۰۰

اشاعت سوم .... محرم الحرام ۱۴۳۰ھ

تعداد ۱۱۰۰

صفحات ۲۱۰

قیمت .... ۱۱۰ روپے صرف

ہماری مطبوعات ملنے کے پتے

مکتبۃ الایمان دکان نمبر ۱۳۱، ندیم ٹریڈ سینٹر، محلہ جنگی، عقب قصہ خوانی بازار پشاور 0321-9013592

رحمانی کتاب گھر دکان نمبر 2، نزد نور سبحانی مسجد، لسبیلہ چوک کراچی 0300-2249928

مکتبہ ابن مسعودؓ، مدرسہ عبداللہ ابن مسعودؓ، چشمہ جات نزد کمپنی باغ کوہاٹ 0321-5782621

مکتبہ عثمانؓ وعلیؓ، نزد بندھن شادی ہال، کوثر کالونی بہاولپور 0321-6837145

کتب خانہ رشیدیہ، مدرسہ تعلیم القرآن، راجہ بازار راولپنڈی 051-5771798

مکتبۃ السلام، اعظم مارکیٹ کمیٹی چوک راولپنڈی 0333-5178392

ادارہ اشاعت الخیر، بیرون بوہڑ گیٹ ملتان 061-4514929



ناشر

اسٹاکسٹ مکتبہ ابن مبارک 37۔ حق سٹریٹ اردو بازار۔ لاہور

موبائل: 0321-4066827

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انتساب

اپنے والد، اپنے شیخ، اپنے محسن و مربّی

جناب **میجر (ر) احمد محمود** صاحب مدظلہ العالی

کے نام

جن کی توجہات وعنایات میرے لیے توشۂ حیات

اور جن کی دعواتِ صالحات میرے لیے ذریعہ نجات ہیں!

رب ارحمهما كما ربياني صغيراً

العبد الضعیف

محمد مقصود احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کچھ اپنی باتیں

۱۹۹۷ء کا موسم گرما گزر چکا تھا، لیکن افغانستان کے شمالی شہر مزار شریف کے اردگرد وسیع وعریض ریگستان کی ریت ابھی تک تپ رہی تھی۔ خاص طور پر دوپہر کے وقت جب سورج کی تپش جوبن پر ہوتی تو فضا اس قدر گرم ہو جاتی کہ گرمیاں گزر جانے کا احساس گم ہو جاتا۔ طالبان کے لشکر ان دنوں مزار شریف شہر کے دروازوں پر دستک دے رہے تھے۔ وہ ہر دوسرے، تیسرے دن رات کے آخری پہر اٹھتے، اسلحہ کندھوں پر لٹکاتے، گاڑیوں میں سوار ہوتے اور مزار شہر سے تقریباً تیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تاشقرغان نامی قصبے سے اپنے ہدف کی طرف روانہ ہو جاتے۔ ان کا ہر حملہ دشمن پر کاری ضرب ثابت ہوتا اور خود وہ دوپہر تک واپس تاشقرغان کی قرارگاہ میں واپس لوٹ آتے۔

ایسی ہی ایک تپتی دوپہر کو جب وہ محاذ جنگ سے واپس لوٹ رہے تھے، تو میں بھی اپنے پیشہ ورانہ فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں ان کے ساتھ تھا۔ دن بھر محاذ جنگ پر گزارنا بجائے خود ایک تھکا دینے والا عمل تھا، چنانچہ قرارگاہ واپس پہنچتے ہی ہر ایک کی خواہش ہوتی کہ وہ کچھ دیر ستا لے، میری اپنی حالت بھی اس وقت کچھ ایسی ہی تھی، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ کیوں؟...... اسی سوال کے جواب کی مہک ہی تھی، جس نے مجھے اس وقت بھی تر و تازہ کر دیا، اور آج بھی جبکہ اس واقعہ کو آٹھ سال کا طویل عرصہ بیت رہا ہے، میں ان لمحوں کی کیفیت بیان کر رہا ہوں تو اسی خوشبو نے مجھے مسحور کر رکھا ہے۔

ہوا کچھ یوں کہ میں محاذ جنگ سے واپس لوٹ کر تاشقرغان کی اس قرارگاہ میں داخل ہوا تو عمارت کے اندر سے آنے والی ایک عجیب سی جاں فزا خوشبو محسوس ہوئی، صرف مجھے نہیں بلکہ میرے ساتھ آنے والے سبھی طالبان کو! ہم نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا اور حیرت وتعجب کے قدم اٹھاتے عمارت کے اندر داخل ہو گئے۔ وہ کئی کمروں پر مشتمل ایک چھاؤنی

جیسی عمارت تھی، جس کے ہر گوشے میں اس وقت وہی خوشبو مہک رہی تھی۔ ہم ایک کمرے میں پہنچے تو چند طالبان کو افسردہ کھڑے پایا۔ وہ کیوں افسردہ تھے؟ ہم نے یہ پوچھنے کی بجائے ان سے سوال کیا کہ یہ خوشبو کہاں سے آ رہی ہے؟

''اس کمرے سے......'' انہوں نے انگلی کے اشارے سے ہماری ایک کمرے کی طرف راہنمائی کی تو ہم اس میں داخل ہو گئے۔

وہ ایک بڑا سا ہال نما کمرہ تھا، اس کے بیچوں بیچ ایک بستر بچھا تھا، اس بستر میں ایک حسین وجمیل نوجوان گہری پرسکون نیند سو رہا تھا، اس نوجوان کے سر پر سفید پٹی بندھی ہوئی تھی، جس پر تازہ خون کی ابھرتی ہوئی سرخی صاف محسوس ہو رہی تھی۔ ہم سب تیز قدموں کے ساتھ اس کی طرف بڑھے، وہ ایک بیس، بائیس سالہ نوجوان طالب علم تھا، جو اس دن سویرے سویرے ہمارے ساتھ ہی محاذ جنگ کی طرف گیا تھا، لیکن اس کی لاش ہم سے کچھ دیر پہلے ہی قرارگاہ پہنچ گئی تھی...... اور وہ مسحور کن، دل آویز خوشبو اسی کے بدن سے پھوٹ رہی تھی، ایسی خوشبو جو میں نے مشک میں سونگھی نہ عنبر میں، عود میں سونگھی نہ خس میں...... وہ جاں فزا اور دلربا مہک مجھے آج بھی اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے اور میں...... خوشی محسوس کر رہا ہوں کہ میں نے اپنی اس کتاب میں اس قدسی لشکر کا تذکرہ قلمبند کیا ہے، جس کا ایک سپاہی وہ شہید تھا۔



تحقیق وجستجو کی حد تک تحریک طالبان سے میری دلچسپیاں اسی وقت سے وابستہ ہیں، جب سے طالبان منظر عام پر آئے۔ لیکن آج ایسے وقت میں جبکہ میں نے طالبان پر یہ کتاب لکھ ڈالی ہے، اس حقیقت کا اظہار بہت عجیب محسوس ہوتا ہے کہ کسی دور میں، میں بھی طالبان کے مخالفین میں سے ایک تھا۔ میں نے جب ابتدائی طور پر ان کا آوازہ سنا تو دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح یہی سوچ لیا کہ طالبان بھی افغان بحران کے ایک نئے کردار کے طور پر سامنے آئے ہیں، مجھے یاد ہے کہ ان دنوں میں بہت زور وشور کے ساتھ اپنے ان دوستوں کے سامنے طالبان پر تنقید وتنقیص کرتا تھا جو جذباتی حد تک طالبان سے وابستگی رکھتے تھے، مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جب طالبان نے تاجکستان کے دارالحکومت دوشنبے سے کابل جانے والے تاجک راہنما سید عبداللہ نوری کا جہاز زبردستی قندھار میں اتار لیا تھا تو اس وقت بھی مجھے بہت افسوس ہوا تھا، کیونکہ بہت عرصے سے میں وسطی ایشیا کے اس مسلم راہنما سے

عقیدت کی حد تک محبت رکھتا تھا۔

لیکن آنے والے وقت نے حالات کے ساتھ میرے جذبات کو بھی بدل ڈالا!

ہوا کچھ یوں کہ میرے بعض قریبی دوست جن کا کردار آئینے کی طرح صاف وشفاف تھا، تحریک طالبان سے وابستہ ہوئے اور ان کی یہ وابستگی اس قدر بڑھ گئی کہ انہوں نے طالبان کے شانہ بشانہ چلتے ہوئے اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا، حتیٰ کہ جانیں بھی...... تب میرے خیالات نے ایک کروٹ لی اور میں یہ عزم کر کے خود افغانستان جا پہنچا کہ بہ چشم خود طالبان کو دیکھوں، ان کے نظام حکومت کا جائزہ لوں اور ان کے اُس افغانستان کا تجزیہ کروں جو مسلمان نوجوانوں کو یوں کشاں کشاں اپنی جانب کھینچ رہا ہے۔ بس یہی طالبان کے بارے میں میرے احساسات وخیالات بدلنے کا نقطۂ آغاز تھا۔

میں نے طالبان کے افغانستان کا پہلا سفر کیا، تو یہ وہ دن تھے جب طالبان کو اپنی تاریخ کا سب سے دردناک اور صبر آزما سانحۂ مزار شریف پیش آیا تھا، میں نے اس تاریخی حادثے کے تمام چشم دید واقعات تحریر کیے تھے، جو بعد میں ''خاک وخون'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔

آپ جانتے ہیں کہ جس چیز کو انسان بہت اچھا سمجھتا ہو وہ ہزار چاہتوں کے باوجود بھی اس کے حسن وخوبی کو کما حقہ بیان نہیں کرسکتا...... بالکل ایسا ہی معاملہ مجھے بھی اس وقت درپیش ہو گیا، جب میں نے طالبان کے بارے میں کچھ لکھنا شروع کیا۔ لیکن اس کے باوجود میں نے گیارہ ابواب پر مشتمل یہ کتاب لکھ کر آپ کے سامنے پیش کر دی۔ صرف اس خیال سے کہ ممکن ہے کوئی صاحب قلم مؤرخ اور صاحب طرز ادیب اسے ایک یادداشت کے طور پر قبول کر لے اور پھر وہ تاریخ اسلام کی اس عظیم الشان تحریک کی مفصل تاریخ مرتب کرے جس طرح کہ دوسری تحریکوں کی تواریخ قلمبند کی جاتی رہی ہیں۔



باوجود اس کے کہ میں نے طالبان کو بارہا دیکھا اور بہت قریب سے دیکھا، میں نے اس کتاب کو جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہو رہا ہے، صرف اپنے مشاہدات پر ہی منحصر نہیں رکھا، بلکہ طالبان کی پالیسیوں، ان کے طرز حکومت اور طریق کار کو ان الفاظ اور تعبیرات میں پیش کیا ہے جو طالبان کے بارے میں ان کے انتہائی مخالفین نے اپنی کتابوں میں لکھے ہیں۔ یہ کتابیں جن کے اقتباسات آپ کو اس کتاب میں جابجا بکھرے نظر آئیں گے، میں جب بھی پڑھتا ہوں تو بے ساختہ میری زبان پر عربی کا

یہ مشہور محاورہ مچلنے لگتا ہے:

والحق ماشهدت به الاعدآء

یعنی سچائی تو وہ ہے جس کی گواہی دشمن بھی دے۔

طالبان کے مخالف ان مصنفین نے اپنی ان کتابوں میں طالبان جیسے بے لوث حکمرانوں کیلئے جو زہر گھولا ہے، وہ روشن خیال اور ترقی پسند طبقے کے اصل چہرے کی بھرپور عکاسی کرتا ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ سچائی سو پردوں میں چھپائے نہیں چھپتی۔ مغربی تعصب و تنگ نظری کے دیمک زدہ ان قلموں نے انہیں صفحات میں، اسی سیاہی سے بہت سے ایسے حقائق کا اعتراف کیا ہے جو خود ان کی طرف سے طالبان پر عائد کیے گئے الزامات کے منہ بولتے جوابات ہیں اور بعض جگہ تو یہ حقائق اس انداز سے بیان کیے گئے ہیں کہ پڑھنے والوں کو ہنسی آ جاتی ہے کہ اگر معاملہ حقیقت میں یہی تھا تو طالبان کو اس قدر کوسنے اور برُا بھلا کہنے کا کیا جواز بنتا ہے؟

وہ مغربی مصنفین اور مغرب زدہ مشرقی اہل قلم جنہوں نے طالبان کے بارے میں کتابیں لکھیں ہیں اور ان کتابوں سے میں نے اہم ''گواہیاں'' اس کتاب میں درج کی ہیں، درج ذیل ہیں:

پیٹر مارسڈن...... برطانوی مصنف ہیں اور کوئین ایلزبیتھ ہاؤس اوکسفورڈ میں ریسرچ ایسوسی ایٹ ہیں۔ آٹھ سال تک برٹش ایجنسیز افغانستان گروپ کے اطلاعات کے رابطہ افسر رہ چکے ہیں۔ انہوں نے انگریزی میں طالبان کے منظر اور پس منظر کے حوالے سے ایک کتاب..................

The Taliban War, Religion and the new order in Afghanistan

لکھی۔ اس کتاب کا ترجمہ ۲۰۰۰ء میں اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن نے ''طالبان، افغانستان میں جنگ، مذہب اور نیا نظام'' کے نام سے شائع کیا۔ میرے پاس کتاب کا یہی نسخہ موجود ہے اور میں نے اسی کے اقتباسات اس کتاب میں درج کیے ہیں۔

کرسٹینا لیمب...... اسلام اور طالبان سے انتہائی عناد رکھنے والی یہ مغربی مصنفہ اپنی دروغ گو شخصیت کے حوالے سے مشہور ہے۔ حکومت پاکستان اس خاتون کو جھوٹی رپورٹنگ کے الزام میں ناپسندیدہ شخصیت قرار دے کر ملک بدر بھی کر چکی ہے۔ اس خاتون نے طالبان کی پالیسیوں اور طرز کار کیخلاف ایک کتاب لکھی، جس کا ترجمہ ۲۰۰۴ء میں ادارہ نگارشات، لاہور نے ''طالبان کا افغانستان'' کے نام سے شائع کیا۔ معلوم نہیں مترجم محمد یحییٰ خان کو اس کتاب کے ترجمے کی کیوں ضرورت پیش آئی؟

جبکہ کتاب کے مندرجات خود ان کی نظر میں بھی قابل اعتماد نہیں ہیں۔ کرسٹینا لیمپ نے اپنی اس کتاب میں شروع سے لیکر آخر تک جس طرح طالبان کیخلاف کہانیاں گھڑنے میں جھوٹ کی رنگ آمیزی کی ہے، اگر رپورٹنگ کے اسی طرز کو معیار مان لیا جائے تو کوئی وجہ نہیں رہ جاتی کہ جھوٹی کہانیوں اور فرضی افسانوں کو تحقیق و تجسس کے بہترین نمونے نہ قرار دیا جائے۔

احمد رشید...... ایک مستغرب مشرقی مصنف ہیں، جو افغانستان اور وسطی ایشیا کی اسلامی اور جہادی تحریکوں کے خلاف ملکی اور غیر ملکی اخبارات وجرائد میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ انہوں نے انگریزی میں طالبان کے حوالے سے کتاب لکھی، جس کا ترجمہ مشعل، لاہور نے ۲۰۰۱ء میں شائع کیا۔ مترجم حمید جہلمی ہیں اور اردو ترجمہ کا نام "طالبان، اسلام تیل اور وسط ایشیا میں سازشوں کا نیا کھیل" رکھا گیا ہے۔ اس کتاب میں طالبان تحریک اور اس کے راہنماؤں کا جس انداز میں تمسخر اڑایا گیا ہے، اس کا اندازہ اسی سے کیا جاسکتا ہے کہ طالبان کے خلاف صلیبی جنگ میں امریکہ کے سب سے بڑے اتحادی ملک برطانیہ کے وزیر خارجہ جیک اسٹرا نے پاکستان کا دورہ کیا تو انہوں نے احمد رشید سے خصوصی ملاقات کر کے اس کتاب کے لکھنے پر انہیں مبارکباد دی۔ میرا جی چاہتا ہے کہ احمد رشید سے ملاقات ہو تو میں انہیں اپنے پاس محفوظ ان کی کتاب کا وہ نسخہ دکھاؤں جس کے صفحہ اول پر ایک حقیقت پسند نے یہ جملہ لکھ دیا ہے کہ "یہ کتاب یہودی ایجنٹ نے لکھی ہے"۔ کتاب کے اس قاری نے جب اس کا مطالعہ کیا تو طیش میں آکر اس کا ورق ورق علیحدہ کر ڈالا۔ میں نے انہی بکھرے اوراق کو یکجا کر کے محفوظ کر رکھا ہے اور اسی نسخے سے اقتباسات اپنی اس کتاب میں نقل کیے ہیں۔

عبدالحمید مبارز...... ایک شاہ پرست افغان مؤرخ ہیں۔ ظاہر شاہ کے دور میں افغانستان کے کئی صوبوں کے گورنر رہ چکے ہیں۔ فرانس کے اخبارات کے باقاعدہ کالم نگار ہیں۔ انہوں نے فارسی میں "حقائق و تحلیل وقائع سیاسی افغانستان ۱۹۷۳ء تا ۱۹۹۹ء" کے نام سے افغانستان کے ماضی قریب میں بیتنے والے حالات سے متعلق کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب کا آخری باب طالبان کے حوالے سے ہے جبکہ کتاب کے بعض دیگر ابواب میں ربانی، احمد شاہ مسعود اور رشید دوستم کے حوالے سے کئی اہم انکشافات کیے گئے ہیں۔

جنرل عظیمی...... افغانستان کی کمیونسٹ انتظامیہ کے اہم رکن رہ چکے ہیں۔ ۱۹۹۲ء میں جب جنرل نجیب نے تختِ کابل کو خیر باد کہا تو جن تین جرنیلوں نے شہر میں مجاہدین کے داخلے تک کابل کا اقتدار

سنبھالا، جنرل عظیمی ان میں سے ایک ہیں۔ ۱۹۹۵ء میں طالبان نے ہرات پر لشکر کشی کی تو جنرل عظیمی کمانڈر اسماعیل کے قریبی اتحادیوں میں سے تھے۔ طالبان کے ہاتھوں ہرات کی فتح کے واقعات وحالات پر انہوں نے فارسی میں ایک کتاب ''طالبان چگونہ آمدند؟'' (طالبان کیسے آئے؟) کے نام سے لکھی۔ اس کتاب کے ایک دلچسپ باب کا ترجمہ کر کے میں نے اپنی اس کتاب میں شامل کیا ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ میں نے اہم واقعات کے ماہ وسن حاصل کرنے کیلئے بعض دیگر کتب، رسائل اور اخبارات سے بھی استفادہ کیا۔ میں ایسے تمام اداروں اور افراد کا شکر گزار ہوں جنہوں نے ''الف'' سے لے کر ''ے'' تک کسی بھی مرحلے پر اس کتاب کی تیاری میں میرے ساتھ تعاون کیا۔ فجزاہم اللہ احسن الجزاء فی الدارین۔



یہاں میں اس امر کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کتاب میں تحریک طالبان کی باقاعدہ تاریخ نہیں بیان کی گئی بلکہ طالبان سے متعلق بعض اہم معاملات ذکر کیے گئے ہیں، اور ان اعتراضات اور سوالات کے جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے جو طالبان مخالف مغربی میڈیا سے متاثر ہو کر دھندلا جانے والے ذہنوں میں پائے جاتے ہیں۔ تاہم ایک حد تک طالبان کے سات سالہ دور کے تمام اہم واقعات کی جھلکیاں بھی اس ضمن میں آ گئی ہیں۔ ہاں البتہ ایک بات جس کا خلاء یقیناً ہر قاری محسوس کرے گا وہ طالبان کی فتوحات کا تذکرہ ہے۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ راقم الحروف ''جہادِ طالبان'' کے نام سے ایک اور قلمی کاوش کا آغاز کر چکا ہے، جس میں قندہار سے لیکر مزار تک، امریکی حملوں کے دوران اور امریکی قبضے کے بعد طالبان کے اہم معرکوں کے حالات وواقعات کو یکجا کر دیا جائے گا۔ اگر قارئین کی دعائیں ساتھ رہیں اور زندگی نے ساتھ دیا تو یہ کتاب بھی عنقریب آپ کے ہاتھوں میں ہوگی۔ تب پھر ''میں نے کابل بستے دیکھا'' اور ''جہادِ طالبان'' کو ایک ہی کتاب کے دو حصے قرار دے کر آپ اسے ''تاریخِ طالبان'' کا نام دے سکیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ



اس کتاب کی ابتدائی ورق گردانی کے دوران آپ ایک اور چیز کی بھی کمی محسوس کریں گے، جسے عام طور پر تقریظ، تصدیق یا پیش لفظ کہا جاتا ہے۔ یہ ''کمی'' مجھے بھی عجیب محسوس ہوتی رہی، لیکن میں اس

احساس کے باوجود اپنی اس کتاب کیلئے کسی سے کچھ نہیں لکھوا سکا۔ شاید اس لیے کہ جن لوگوں تک میری رسائی ہے ان میں اچھے اچھے قلمکار ہونے کے باوجود کوئی نہیں جو طالبان کی قصیدہ گوئی کرتے ہوئے اپنے قلم میں عمل کی روشنائی بھر سکے اور وہ لوگ جو اپنے عمل اور کردار سے ملا محمد عمر مجاہد اور ان کے وفا شعار ساتھیوں کی روشن اور تابندہ روایات کو زندہ رکھے ہوئے ہیں، میری اُن تک پہنچ نہیں۔ محرومی کا یہی احساس، تقریظ وتصدیق کی کمی کے احساس پر غالب رہا اور میں نے کسی سے کچھ لکھوانے کی اپنے اندر ہمت نہ پائی۔

وصلی اللہ علی النبی الکریم محمد وعلی الہ واصحابہ اجمعین

محمد مقصود احمد

۱۸/ ربیع الاوّل ۱۴۲۶ھ

۲۸/ اپریل ۲۰۰۵ء

"عجیب بات ہے کہ میں نہ حواس باختہ ہوتا ہوں اور نہ ہی بے دینوں کے ساتھ اسلام کے خلاف راستہ اختیار کرتا ہوں، باوجودیکہ میرا اقتدار بھی خطرے میں ہے، میری سربراہی اور کرسی بھی خطرے میں ہے، میری زندگی بھی خطرے میں ہے، پھر بھی جان بھی قربان کرنے کیلئے تیار ہوں، اگر میں کافروں کے مطالبے پر ایسی راہ اختیار کرلوں جو اسلام کے خلاف ہو ان کے ساتھ موافقت کروں اور ان کے ساتھ معاملات ٹھیک رکھوں تو میری ہر چیز مستحکم ہوگی، میری بادشاہی اور سلطنت بھی برقرار رہے گی اور اسی طرح طاقت، پیسہ اور جاہ وجلال بھی خوب ہوگا، جس طرح دیگر ممالک کے سربراہوں کا ہے، لیکن میں اسلام کی خاطر ہر قربانی کیلئے حاضر ہوں، سب کچھ کرنے کیلئے حاضر ہوں، جان قربان کرتا ہوں، سب کچھ سے بے پرواہ ہو چکا ہوں، سلطنت، اقتدار، طاقت اور ہر چیز کی قربانی کا عزم کر چکا ہوں، اسلامی غیرت کرتا ہوں، اسلام پر فخر کرتا ہوں، اس پاک وطن پر غیرت کرتا ہوں۔"

(افغانستان پر امریکی حملوں سے قبل ملا محمد عمر مجاہد کا اپنی قوم سے خطاب)



امیر المؤمنین

یہ سن ۲۰۰۰ء کا ذکر ہے! میں اور میرے چند دوست افغانستان کے معلوماتی دورے پر تھے۔ ماہ جون کی ایک تپتی دوپہر میں جب ہم قندھار شہر میں واقع سپریم کورٹ کی عمارت میں اسلامی عدالتوں کے اعلیٰ عہدیداروں سے ملاقاتیں کرکے واپس سرکاری مہمان خانے میں پہنچے تو ہمیں بتایا گیا کہ طالبان کے راہنما امیر المؤمنین ملا محمد عمر مجاہد آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ طالبان کے دور میں افغانستان کا دورہ کرنے والے کسی بھی شخص کیلئے ملا عمر صاحب سے ملاقات سب سے پرکشش مرحلہ ہوتا تھا۔ حالانکہ یہ بات سبھی کو معلوم تھی کہ ملا عمر اپنی گوناگوں مصروفیات اور حفاظتی نقطہ نظر سے بہت ہی کم لوگوں سے ملا کرتے تھے۔ خاص طور پر غیر ملکیوں سے ان کی ملاقاتوں کو تو انگلیوں پر بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے غیر ملکی سرکاری نمائندوں سے ملاقاتیں بھی اپنے وزراء اور مشیروں پر چھوڑ رکھی تھیں۔ البتہ کبھی شاذ و نادر وہ خود بھی ان سے مل لیا کرتے تھے۔ مثلاً اقوام متحدہ کے نمائندے الاخضر الابراہیمی اور سعودیہ کے شہزادہ ترکی الفیصل ان چند افراد میں سے ہیں جن سے ملا عمر صاحب نے خود ملاقات کی تھی۔ مگر ملا صاحب سے ملاقات کی راہ میں ان مشکلات کے باوجود ہم نے اپنے طور پر طالبان راہنماؤں سے جن میں قندھار کے والی ملا محمد حسن صاحب اور ملا عمر کے مشیر خاص طیب آغا خاص طور پر قابل ذکر ہیں، پُرزور اصرار کر کے اپنا مطالبہ منوالیا تھا اور اب انہوں نے ہماری ملاقات کا بندوبست کر لیا تھا۔

طالبان کا سرکاری مہمان خانہ شہر سے باہر واقع تھا، جہاں سے میں اور میرے دیگر ساتھی طالبان

کی سرکاری گاڑیوں میں بیٹھ کر قندھار شہر کے اندر واقع شہداء چوک کے قریب اس مقام کی جانب روانہ ہو گئے جسے وہاں کے لوگ ''والی کوٹھی'' (گورنر ہاؤس) کہتے ہیں۔ والی کوٹھی دراصل قندھار کے گورنر ملا محمد حسن کا سرکاری دفتر تھا، مگر ۱۹۹۹ء میں جب ملا محمد عمر صاحب کو نشانہ بنانے کیلئے بعض بیرونی طاقتوں نے اپنے زرخرید ایجنٹوں کے ذریعے قندھار میں ایک طاقتور بم دھماکہ کیا تو اس کے بعد سے طالبان کے راہنما نے اپنے پرانے دفتر میں جانا ترک کر دیا اور اب وہ عموماً والی کوٹھی ہی میں بیٹھ کر فرائض منصبی سرانجام دیتے تھے۔ جس کی ایک بڑی وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ والی کوٹھی کے برابر ہی میں ملا صاحب کی رہائش گاہ واقع تھی۔

قندھار شہر کی مرکزی سڑک سے ہوتی ہوئی جب ہماری گاڑیاں والی کوٹھی کے سامنے پہنچیں تو قافلے کے بیشتر شرکاء دنگ رہ گئے۔ کیونکہ والی کوٹھی کی عمارت ان کی توقع سے کچھ زیادہ ہی سادگی سے بنائی گئی تھی۔ یہ درست تھا کہ ہمارے قافلے کے بیشتر شرکاء ایسے تھے جنہوں نے طالبان کو اس سے پہلے دیکھا نہیں تو سُن ضرور رکھا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بہرحال ان کیلئے باعث حیرت تھا کہ افغانستان کے پچانوے فیصد علاقے پر حکمرانی کرنے والے طالبان کے گورنر ہاؤس کے باہر نہ کوئی سیکورٹی فورسز کا گشت تھا، نہ حفاظتی انتظامات اور نہ ہی انہیں پروٹوکول دینے کیلئے مسلح اہلکاروں کے چاق وچوبند دستے۔ والی کوٹھی کی عمارت بھی انتہائی سادہ طرز تعمیر کا نمونہ تھی۔ جس کے بیشتر حصے کو بم دھماکے میں منہدم ہو جانے کیوجہ سے دوبارہ تعمیر کیا گیا تھا۔

والی کوٹھی کے دروازے پر پہنچتے ہی گورنر قندھار ملا محمد حسن صاحب نے جو اس وقت ہمارے ساتھ ہی تھے، اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے چھوٹے سے وائرلیس سیٹ پر مخصوص فریکوئنسی سیٹ کی اور والی کوٹھی کے اندر رابطہ کر کے مہمانوں کے پہنچنے کی اطلاع دی اور اس رابطے کے چند لمحے بعد ہی ہماری گاڑیوں کیلئے والی کوٹھی کا آہنی دروازہ کھول دیا گیا۔ دروازے سے اندر داخل ہونے کے بعد والی کوٹھی کا سامنے والا حصہ ہمارے سامنے تھا جو ابھی تعمیری مراحل سے گزر رہا تھا۔ ہمارے طالبان ڈرائیوروں نے گاڑیاں ایک بغلی راستے سے گزاریں اور اب ہم والی کوٹھی کے عقبی حصے میں پہنچ گئے۔ جہاں چند کمرے تھے اور ان کے برآمدے میں کھڑے چند طالبان راہنما مہمانوں کے منتظر تھے۔ گاڑیاں رکتے ہی انہوں نے آگے بڑھ کر مہمانوں کو خوش آمدید کہا، اور پھر ان میں سے ملا محمد عمر صاحب کے مشیر خصوصی سید طیب آغا صاحب نے آگے بڑھ کر ہماری ایک کمرے کی طرف راہنمائی کی۔ اس کمرے سے گزر کر ہم ایک

اور کمرے میں داخل ہو گئے۔ ملا محمد عمر صاحب سے ملاقات کیلئے پرانی افغان طرز کے مطابق بنے ہوئے موٹی موٹی دیواروں والے ان کمروں سے گزرتے ہوئے ہمیں لمحہ بھر کیلئے پراسراریت کا احساس ضرور ہوا لیکن جونہی ہم دوسرے کمرے میں داخل ہوئے تو ایک انجانے مگر پروقار نورانی ماحول نے ہم سب کے دلوں کو گویا مسحور کر کے رکھ دیا۔

ہمارے سامنے امیر المؤمنین ملا محمد عمر مجاہد کھڑے تھے۔ دراز قد، وجیہ شکل وصورت، سر پر سیاہ عمامہ رکھے، سادہ سے کپڑوں میں ملبوس ملا صاحب نے سب مہمانوں سے معانقہ کیا اور پھر انہیں بیٹھنے کی دعوت دیتے ہوئے، خود بھی اس مسہری کا سہارا لے کر بیٹھ گئے جس پر گدا تو بچھا ہوا تھا مگر چادر غائب تھی۔ ملا صاحب نے خود اسی مسہری سے ٹیک لگائی اور مہمانوں کو گاؤ تکیے پیش کیے۔ بیٹھنے کے بعد کچھ دیر تک تو سبھی مہمان اس عظیم شخص کی جانب دیکھتے ہی رہے جو اتنے بڑے ملک پر حکمرانی کرتے ہوئے بھی اس قدر سادہ طرز میں زندگی بسر کر رہا تھا۔

جی ہاں! امیر المؤمنین کے کمرۂ ملاقات میں نہ آرام دہ صوفے تھے، نہ خوبصورت کرسیاں، نہ کاغذات صدارت سے سجی دھجی میز تھی اور نہ ہی کمرے کی چھت پر کوئی چمکتا دمکتا فانوس لٹکتا نظر آ رہا تھا۔ بس ایک افغانی قالین تھا جو پورے کمرے میں بچھا ہوا تھا اور اس کی چاروں جانب افغان طرز کے مطابق روئی کے گدے رکھے ہوئے تھے۔ افغانستان کے اکثر علاقے اگرچہ گرمیوں میں بھی مناسب موسم رکھتے ہیں مگر قندھار ان میں سے نہیں۔ شہر کے آس پاس پھیلے ہوئے وسیع وعریض ریگستانی علاقے کی وجہ سے گرمیوں میں اس شہر میں شدید گرم موسم ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود امیر المؤمنین کے دفتر میں ہماری متلاشی نگاہوں کو ایک بھی ایئر کنڈیشن دکھائی نہیں دیا۔ کیونکہ ملا محمد عمر اور ان کے دیگر عہدیدارانِ امارت ایسے ہی موسم میں گزر بسر کرتے رہے ہیں۔

امیر المؤمنین نے مہمانوں سے انتہائی دھیمے انداز میں خیر وعافیت دریافت کی اور پھر باقاعدہ گفتگو کا آغاز ہوا۔ گفتگو کے دوران طالبان حکومت کی داخلی وخارجی پالیسیوں کے بارے میں مختصر مگر سیر حاصل بات چیت ہوئی۔ ملا عمر صاحب نے آنے والے مہمانوں کے مشورے خندہ پیشانی سے سنے اور مختصر الفاظ میں ان کے سوالات کے جوابات دیئے۔ گفتگو کے دوران جب بعض مہمانوں نے طالبان کے راہنما کو مشورہ دیا کہ وہ بیرونی دنیا میں طالبان کیلئے رائے عامہ ہموار کرنے کیلئے طالبان کے اعلیٰ عہدیداروں پر مشتمل ایک باقاعدہ وفد ترتیب دیں تو ملا صاحب نے جواب دیا کہ یہ

کام اگر آپ لوگ کریں تو زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ طالبان کے حق میں اپنوں سے زیادہ غیروں کی گواہی مؤثر ہو سکتی ہے۔

ملا صاحب سے ہمارے وفد کی گفتگو تقریباً آدھے گھنٹے تک جاری رہی اور پھر ہم نے ان سے رخصت ہونے کیلئے اجازت چاہی۔ رخصت کرتے ہوئے انہوں نے ایک مرتبہ پھر سب سے معانقہ کیا۔ اس موقع پر ہمارے ایک دوست نے جب اِن سے کہا کہ ''دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے شہادت عطا فرمائیں'' تو انہوں نے بڑی سنجیدگی سے کہا ''اللہ تعالیٰ آپ کو وہ مقام عطا فرمائیں جو انہیں پسند ہو۔'' اور پھر ہم سب امیر المؤمنین سے رخصت ہو گئے۔

امیر المؤمنین سے ملاقات کے بعد ہم والی کوٹھی سے نکلے...... پھر دو چار دن بعد افغانستان سے بھی لوٹ آئے اور بالآخر ایک دن ایسا بھی آیا جب یہ اندوہناک خبریں سننے کو ملیں کہ طالبان قندھار سے چلے گئے ہیں، اب والی کوٹھی کی عمارت ان کے بجائے ان کے دشمنوں کے قبضے میں ہے اور شہر کی سڑکوں پر اب طالبان کی بجائے امریکی فوجیں گشت کر رہی ہیں۔ ان اطلاعات نے ہم سب پر بجلیاں گرائیں، دل خون کے آنسو رویا اور آنکھیں نم ہو گئیں۔ مگر مجھے یقین ہے اور بھرپور یقین ہے کہ وہ مردِ درویش آج بھی بالکل ویسے ہی سنجیدہ اور پُروقار شکل وصورت کے ساتھ، سر پر عمامہ رکھے اور سادہ لباس پہنے افغانستان کے کسی پہاڑ یا صحراء میں ویسے ہی سکون واطمینان سے بیٹھا ہوگا جیسا ہم نے اس کو والی کوٹھی میں بیٹھا دیکھا تھا۔ کیونکہ وہ زمین کے ٹکڑوں اور انسانوں کے سروں پر نہیں بلکہ دلوں پر حکمرانی کرتا ہے اور اس کی یہ حکمرانی آج بھی باقی ہے۔ اس کے ساتھی آج بھی اسے ایک قابل فخر امیر سمجھتے ہیں، ہزاروں نہیں لاکھوں افغان عوام اس کی راہیں تک رہے ہیں اور کروڑوں مسلمانوں کے دل صبح وشام اس کیلئے دھڑکتے ہیں۔

طالبان کے راہنما ملا محمد عمر مجاہد آج منظر عام پر نہیں ہیں، اور نہ ہی کسی کو یہ معلوم ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت سے ٹکر لینے والا یہ طاقتور اور بہادر انسان کہاں بیٹھ کر اپنی انمٹ جماعت کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہے لیکن پھر بھی دنیا والے اس مردِ آہن کو جاننا چاہتے ہیں، اس کی طاقت کا راز سمجھنا چاہتے ہیں اور اس کے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں واقفیت حاصل کرنے کے خواہشمند ہیں۔



بھلے وقتوں میں افغانستان کا جنوبی شہر قندھار ملک کا دوسرا بڑا شہر سمجھا جاتا تھا، جس کی اپنی آبادی

لاکھوں سے متجاوز تھی اور آس پاس کے گاؤں دیہاتوں میں بھی سینکڑوں قبائل بستے تھے۔ انہی قبائل میں سے ایک پشتونوں کا مشہور قبیلہ ''ہوتک'' بھی تھا جس کا اصل مسکن تو صوبہ زابل تھا مگر اس کی ایک شاخ کے افراد گزشتہ ایک صدی سے قندھار کے قریب آ کر آباد ہو گئے تھے۔ امیر المؤمنین کا آبائی تعلق اسی قبیلہ سے ہے۔ آپ کے والد مرحوم کا نام مولوی محمد ایاز اخوند تھا۔

امیر المؤمنین کا صحیح سن پیدائش تو ریکارڈ میں درج نہیں تاہم ان کی عمر سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ پیدائش کے کچھ عرصے بعد جب آپ کی عمر ابھی صرف تین سال ہی تھی کہ آپ کے چالیس سالہ والد محترم اپنے اکلوتے بیٹے اور بیوی کو سوگوار چھوڑ کر اس عالم سے کوچ کر گئے۔ والد سے پہلے آپ کا ایک چھوٹا بھائی اور تین بہنیں بھی کم سنی کے عالم میں ہی اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔

مولوی غلام نبی مرحوم کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد ان کی بیوہ یعنی ملا محمد عمر صاحب کی والدہ محترمہ نے اپنے شوہر مرحوم کے بھائی مولوی محمد انور سے عقد نکاح کر لیا۔ یوں ننھے ملا عمر کو حقیقی والد کے بعد ایک ایسا مشفق مربی مل گیا جس نے اپنے بھتیجے اور سوتیلے بیٹے کی بھرپور طریقے سے پرورش کی اور کسی بھی قدم پر اسے یتیمی کا احساس نہ ہونے دیا۔

مولوی محمد انور کے علاوہ ملا محمد عمر صاحب کے باقی تین چچاؤں مولوی محمد حنفیہ اخوند، حاجی مولوی محمد جمعہ اخوند اور حاجی مولوی محمد ولی اخوند نے بھی اپنے اس بھتیجے کی پرورش و تعلیم میں بھرپور کردار ادا کیا، جس کے چہرے پر کم سنی ہی سے سعادت و خوش بختی کے آثار نمایاں تھے۔ ان چچاؤں میں سے مولوی محمد ولی اخوند اپنے علاقے کی اہم روحانی شخصیت بھی سمجھے جاتے تھے اور لوگ انہیں ''پیر صاحب'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ویسے عام طور پر لوگوں کا کہنا یہی ہے کہ ملا عمر صاحب کا خاندان آبائی طور پر ہی علمی اور روحانی خاندان سمجھا جاتا ہے۔ جس کے فرزندوں سے ماضی میں بھی لاکھوں بندگان خدا نے راہ ہدایت پائی۔ ملا محمد عمر صاحب کے تین سگے بھائی ہوئے اور چار بہنیں۔ بھائیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سبھی جہاد میں شریک رہے۔

ہوش سنبھالنے کے بعد ملا محمد عمر صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے سوتیلے والد اور حقیقی چچا مولوی محمد انور سے حاصل کی۔ جو صوبہ ارزگان میں ایک مسجد کے امام و خطیب تھے اور ان کی وجہ سے ملا عمر صاحب اور ان کی والدہ قندھار سے نقل مکانی کر کے یہیں آ بسی تھیں۔ یہاں ارزگان میں مولوی محمد انور کے پاس

مقیم اور مسافر طلبہ کی ایک بڑی تعداد بھی حصول علم کی غرض سے مقیم رہتی تھی۔ ملا محمد عمر نے اپنے سوتیلے والد کے علاوہ دیگر کئی اساتذہ کرام سے بھی علمی فیض حاصل کیا مگر افسوس کہ ان میں سے سوائے ان کے دوسرے چچا مولوی محمد جمعہ اخوند کے کسی کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔

ملا محمد عمر کی تعلیم ابھی جاری تھی اور وہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ''ہدایہ'' پڑھ رہے تھے کہ اچانک حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ ان کو تعلیم چھوڑ کر عملی میدان میں اترنا پڑا اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ملا ہی رہ گئے۔ (یاد رہے کہ افغانستان اور وسطی ایشیا کے علاقوں میں دینی طالب علم جب تک اپنی تعلیم پوری نہیں کر لیتا اسے ''ملا'' کہا جاتا ہے اور جب وہ تعلیم مکمل کر لے تو اسے ''مولوی'' کا لقب دیا جاتا ہے۔ ملا محمد عمر کے نام کے ساتھ بھی ''ملا'' اسی وجہ سے بولا جاتا ہے کیونکہ وہ تا حال باقاعدہ طور پر اپنی تعلیم مکمل نہیں کر سکے، البتہ پاکستان کے صوبہ سرحد میں واقع دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک نے اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ طالبان کے راہنما امیر المؤمنین ملا محمد عمر مجاہد کی اسلامی خلافت کے احیاء اور شریعت اسلامیہ کے نفاذ کے سلسلے میں گرانقدر خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کیلئے اعزازی طور پر سند فراغت جاری کی)

۱۳۹۸ھ مطابق ۱۹۷۸ء میں جب ملا محمد عمر مجاہد کی عمر اٹھارہ سال کے لگ بھگ تھی اور وہ ابھی تعلیم حاصل کرنے میں مگن تھے کہ اچانک ان کے ملک میں بد دین عناصر کی شہہ پر کمیونسٹ انقلاب برپا ہو گیا جس کے نتیجے میں روس کو افغانستان میں مداخلت کا موقع ملا اور اس نے اپنی افواج وہاں داخل کر دیں۔ روسی افواج کی آمد کے ساتھ ہی پورے افغانستان میں غیرتمند افغان مسلمانوں نے اجنبی جارحیت کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے اور جانیں ہتھیلیوں پر رکھ کر کمیونسٹوں کا مقابلہ شروع کر دیا۔ اس موقع پر علماء اور طلباء نے اپنی ذمہ داری نبھاتے ہوئے قوم کی راہنمائی میں مرکزی کردار ادا کیا اور اپنی دیگر مصروفیات ترک کر کے وہ میدان جہاد میں نکل آئے۔ ملا محمد عمر صاحب بھی ایسے ہی طلبہ میں سے ایک تھے، جنہوں نے اپنے ملک وملت کی بقاء کیلئے کتابیں رکھ کر ہتھیار اٹھا لیے تھے، اور پھر ارزگان کے باشندوں نے دیکھا کہ مولوی محمد انور کا ہونہار شاگرد جیسے حصول علم کا شوقین تھا ویسے ہی وہ میدان عمل کا شہسوار بھی نکلا۔

ملا محمد عمر نے اپنی جہادی زندگی کا آغاز ارزگان ہی سے کیا جہاں وہ سکونت پذیر تھے۔ انہوں نے یہاں اپنے مجاہد ساتھیوں کے ساتھ مل کر روسی افواج پر حملوں کا سلسلہ شروع کیا اور یہ حملے اس قدر کامیابی کے ساتھ کیے کہ روسی افواج کو انتہائی جدید اسلحہ سے لیس ہونے کے باوجود ان کے ہاتھوں شدید نقصان اٹھانا پڑا۔ ملا محمد

عمر مجاہد کی اسی جنگی صلاحیت کی وجہ سے آپ مجاہدین کے ہردلعزیز کمانڈر بن گئے۔ روسی افواج پر حملوں کے دوران آپ کے جسم پر شدید زخم بھی آئے۔ چنانچہ ایک دفعہ روسی فوج کی طرف سے فائر کیے گئے راکٹ کا ایک پارچہ آپ کی ٹانگ پر لگا، جس کی وجہ سے آپ زخمی ہوگئے اور دوسری مرتبہ جنگ کے دوران شدید فائرنگ کی بارش میں ایل ایم جی کی گولیوں کا برسٹ ملا عمر مجاہد کو لگا جس سے جسم کے مختلف حصوں پر شدید زخم آئے۔ تاہم علاج کے بعد آپ صحت یاب ہوگئے اور دشمن کے خلاف اپنی جدوجہد کو جاری رکھا۔

ارزگان میں ملا عمر اور ان کے ساتھیوں کی کارروائیاں جاری تھیں کہ مولوی محمد انور اخوند کو تشویش لاحق ہوئی کہ کہیں کمیونسٹ ان کے بھتیجے کی روز بروز بڑھتی ہوئی جہادی سرگرمیوں سے تنگ آ کر انہیں کوئی گزند نہ پہنچا دیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بھتیجے سے کہا کہ وہ جنگی حکمت عملی کے تحت اپنا ٹھکانہ بدل لیں اور ارزگان کو چھوڑ کر قندھار کے مضافات میں چلے جائیں۔ چچا کا حکم سن کر ملا عمر نے اس پر عمل کیا اور قندھار پہنچ کر اپنی عسکری کارروائیوں کا دوبارہ آغاز کر دیا۔ قندھار میں ملا محمد عمر نے کمیونسٹوں کیخلاف گوریلا جنگ کیلئے موضع پنجوائی کا انتخاب کیا، کیونکہ یہاں سے گزرنے والی بڑی سڑک کمیونسٹ افواج کی سپلائی لائن بھی تھی جس سے انہیں زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچایا جاسکتا تھا۔ پنجوائی میں مختلف معرکوں میں ملا محمد عمر نے اپنی بھرپور جنگی اور عسکری صلاحیت کا ثبوت دیتے ہوئے دشمن پر کئی کاری اور کامیاب وار کیے۔ جس کے نتیجے میں وہ علاقے بھر میں مشہور اور معروف جہادی کمانڈر بن گئے۔ اسی دوران ملا محمد عمر صاحب ایک معرکے میں شدید زخمی بھی ہوگئے۔ جس سے آپ کی ایک آنکھ بھی شہید ہوگئی۔ ملا صاحب کے بعض قریبی ساتھیوں کا کہنا ہے کہ اس مرتبہ جب آپ زخمی ہوئے تو آپ کو پاکستان کے سرحدی شہر کوئٹہ لیجایا گیا۔ جہاں ڈاکٹروں نے آپریشن کر کے آپ کو ہدایت کی کہ اپنے زخموں کو پانی سے بچائیں اور تیمم کر کے نماز پڑھیں۔ مگر ملا صاحب نے وضو چھوڑنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ ناممکن ہے کہ میں زخموں کی وجہ سے وضو نہ کروں۔

ملا محمد عمر مجاہد دشمن سے باقاعدہ جنگ کیلئے معروف افغان جہادی راہنما مولوی محمد نبی محمدی کی تنظیم حرکت انقلاب اسلامی سے منسلک ہوگئے تھے اور حرکت کی جانب سے آپ کو علاقائی کمانڈر مقرر کیا گیا تھا۔ ملا محمد عمر صاحب کے پرانے جہادی دوستوں میں سے ایک نے دیرینہ یادیں تازہ کرتے ہوئے بتایا کہ آپ کو آر پی جی سیون (اینٹی ٹینک راکٹ لانچر) چلانے میں خصوصی مہارت حاصل تھی، چنانچہ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ پنجوائی کے علاقے میں روسی افواج کا ایک ٹینک زمین میں چھپا ہوا تھا اور اس کی گولہ

باری سے مجاہدین کو شدید نقصان اٹھانا پڑ رہا تھا۔ مجاہدین نے کئی بار اس ٹینک کو تباہ کرنے کی کوشش کی مگر روسیوں نے اس کو ایسی جگہ کھڑا کر رکھا تھا جہاں سے اس کو نشانہ بنانا تقریباً ناممکن تھا۔ ملا محمد عمر صاحب کو جب یہ صورتحال معلوم ہوئی تو انہوں نے بذات خود اس کو تباہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اب کی بار خود انہوں نے راکٹ فائر کیا تو وہ سیدھا نشانے پر جا لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے روسی ٹینک سے نکلنے والے شعلے فضا میں بلند ہونے لگے۔



ملا محمد عمر صاحب اور ان جیسے دیگر جانباز مجاہدین کی قربانیوں ہی کا نتیجہ تھا کہ افغان سرزمین پر روس اور اس کے ایجنٹوں کو عبرتناک شکست کا سامنا کرنا پڑا اور پھر ایک دن آیا جب روسی افواج اپنی پیشانیوں پر شکست کا بدنما داغ لیے افغانستان سے واپس لوٹ گئیں۔ روسی افواج کے واپس لوٹنے اور روسی ایجنٹوں کی حکومت کے خاتمے کے بعد جب بدقسمتی کے مارے مختلف جہادی راہنماؤں نے اقتدار کی رسہ کشی میں پڑ کر ایک دوسرے کا گریبان پکڑنا شروع کیا تو اس کڑے وقت میں ملا محمد عمر صاحب بھی ان چند خوش نصیب مجاہدین میں سے تھے جنہوں نے اس آگ میں کودنے کی بجائے کنارہ کشی اختیار کرنے کو ترجیح دی۔ چنانچہ جہاد افغانستان کے اختتام پر آپ نے کلاشنکوف رکھ کر دوبارہ کتاب اٹھالی اور ایک مرتبہ پھر اپنی ادھوری پڑھائی مکمل کرنے میں مشغول ہوگئے۔ مگر یہ تکمیل اب بھی ان کا مقدر نہ بن سکی، شاید اس لیے کہ اللہ تعالیٰ دنیا والوں کو دکھانا چاہتا تھا کہ بڑے بڑے انقلاب برپا کرنے والے عظیم لوگوں کیلئے علم سے زیادہ عمل ضروری ہے اور قابلیت سے زیادہ جرأت واستقامت ضروری ہے۔

جہاد کے اختتام کے بعد ہی ملا محمد عمر نے اکتیس سال کی عمر میں شادی کی، جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اولاد بھی عطاء کی۔

کلاشنکوف رکھ کر دوبارہ کتاب اٹھاتے ہوئے ملا محمد عمر صاحب نے شاید کبھی سوچا بھی نہ ہوگا کہ اب انہیں پھر کلاشنکوف اٹھانی پڑے گی، مگر حالات نے ایک مرتبہ پھر انہیں مدرسہ سے میدان کی جانب پلٹنے پر مجبور کردیا۔ جہاد افغانستان کے اختتام پر شروع ہونے والی افغان راہنماؤں کے مابین اقتدار کی رسہ کشی اور ہوائے نفسانی اس قدر زیادہ بڑھی کہ پورا افغانستان دیکھتے ہی دیکھتے ایک تنور کی شکل اختیار کرگیا جس کے نتیجے میں ہونے والی خانہ جنگی نے گلی گلی بستی بستی شہر شہر میں تعصب وقوم پرستی کے شعلے

بڑھکا دیئے اور افغان قوم جو کافروں سے بچی کچھی رہ گئی تھی اب اپنوں کے ہاتھوں لقمہ اجل بننے لگی۔ یہ صورتحال یوں تو سبھی مسلمانوں کیلئے غم والم کا باعث تھی مگر افغان قوم تو خاص طور پر ان حالات سے آزردہ تھی۔ لیکن اصل مشکل یہ تھی کہ ان حالات میں کون ہوسکتا تھا جو ہمت کر کے آگے بڑھتا، اس دہکتے الاؤ میں کودتا اور اپنی قوم کو اس سے نکالنے کی جرأت کا مظاہرہ کرتا۔ بلاشبہ یہ ایک کٹھن مرحلہ تھا اور اس سے وہی شخص گزر سکتا تھا جس کو اس کے رب نے خداداد صلاحیتوں سے نوازا ہو۔

دنیا اس وقت عالمی طاقتوں پر نظریں گاڑے ہوئی تھی کہ دیکھئے ان میں سے کون آگے بڑھ کر افغان بحران کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر اس میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ مگر سولہ لاکھ شہداء کے رب نے یہ عزت اس مرد خدا مست کے مقدر کر رکھی تھی جسے قندھار والے ملا محمد عمر مجاہد کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

قندھار شہر کے قریب میوند کے مقام پر ایک مدرسے میں اپنی تعلیم مکمل کرنے میں مگن ملا محمد عمر مجاہد نے جب نام نہاد راہنماؤں کی باہمی خانہ جنگی میں اپنے مسلمان بھائیوں کا خون رائیگاں جاتا دیکھا تو وہ زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکے اور بالآخر انہوں نے ذاتی محنت اور جدوجہد سے اپنے ساتھی طلبہ پر مشتمل ایک جماعت تیار کر لی جسے آنے والے وقتوں میں ''تحریک طالبان'' کا نام دیا گیا۔ تحریک طالبان کی بنیاد کیسے رکھی گئی اور اس میں ابتدائی طور پر کون لوگ شامل تھے اس کا تفصیلی ذکر ہم آئندہ صفحات میں کریں گے، تاہم فی الحال ملا عمر صاحب کی ذات کے حوالے سے یہ عرض ہے کہ ملا صاحب خود ہی اس تحریک کے بانی ہیں اور انہوں نے اپنے اخلاص جدوجہد قربانی اور کوشش کے نتیجے میں اس بے سروسامان تحریک کو بام عروج تک پہنچایا۔ یہی وجہ ہے کہ اس تحریک کے ماضی پر گہری نظر رکھنے والے لوگ اس حقیقت کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں کہ اس کی کامیابیوں اور کامرانیوں میں بانی تحریک کے ذاتی کردار کا بہت بڑا عمل دخل تھا۔

ملا محمد عمر مجاہد کا وہ شوقِ جنوں پرور اور جہدِ مسلسل کیسی تھی، جس نے تحریک طالبان کو جنم دیا، آیئے ابتدائی دنوں کی یہ کہانی خود انہیں کی زبانی سنتے ہیں۔ تحریک کے آغاز کی یہ داستان انہوں نے خود ۴/ اپریل ۱۹۹۶ء کو قندھار میں افغان علماء کے ایک بہت بڑے مجمع کو سنائی تھی:

''تحریک کا آغاز اس طرح ہوا کہ ایک دن میں مدرسے میں طلبہ کے درمیان بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ اچانک میں نے کتاب بند کر دی، اپنے ساتھ

ایک اور طالب علم کو لیا اور ہم دونوں مدرسے سے نکل آئے۔ ہم سنگ حصار سے زنگاوات آ گئے، وہاں ہم نے ایک شخص سے موٹر سائیکل مانگی۔ اس شخص کا نام سرور تھا اور وہ طولقان کا رہنے والا تھا۔ پھر میں نے اپنے دوست کو اپنے ساتھ موٹر سائیکل پر بٹھایا اور اسے بتایا کہ ہم مختلف مدارس کے طلبہ کے پاس جائیں گے۔ چنانچہ شام کو ہم ترخو آ گئے۔ اس دوران میں نے اپنے رفیق سفر سے کہا کہ ہم گھومتے رہیں گے اور یہ راستے یاد رکھو کہ ان شاء اللہ ایک انقلاب اور تبدیلی ضرور آئے گی۔ اگلی صبح ہم پھر موٹر سائیکل پر سوار ہوئے اور ایک مدرسے میں جا پہنچے، جہاں چودہ طالب علم سبق پڑھ رہے تھے۔ ہم نے ان سب کو جمع کیا اور ان سے بات کی کہ آپ لوگ توکل محض کو ذہن سے نہ نکالیں۔ میں نے انہیں کہا کہ دیکھیں اللہ کا دین پائمال ہو رہا ہے اور کچھ لوگوں نے اس کو ایسا بنا دیا ہے کہ دوسرے لوگ بھی برباد ہو رہے ہیں، برے بنتے جا رہے ہیں، ایک مخصوص طریقے سے مسلمان تباہ کیے جا رہے ہیں۔ یہ لوگ دوسرے مسلمانوں کو بھی فسق وفجور کا عادی بنا رہے ہیں اور فسق کو عام کر کے جاری رکھنا چاہتے ہیں، بدمعاش اور بدقماش لوگ تمام علاقوں پر قابض ہو چکے ہیں، راہزنی اور لوٹ مار جاری ہے، ہر راستے پر لوگوں کی عزتیں لوٹی جا رہی ہیں، لوگوں سے مال زبردستی چھین لیا جاتا ہے اور قتل ہو رہے ہیں۔ میں نے ان طلبہ سے کہا کہ ظلم وستم کے ایسے ماحول میں درس وتدریس کا سلسلہ جاری نہیں رکھا جا سکتا۔ اس انداز سے یا زندہ باد، مردہ باد کے نعروں سے یہ مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ ہم آپ سے یہ کہتے ہیں کہ اگر آپ دین کا علم واقعی اللہ کی رضا کیلئے حاصل کر رہے ہیں تو اللہ کی رضاء ہی کیلئے اب آپ کو یہ سلسلہ چھوڑنا ہوگا اور اب یہ تعلیم جاری نہیں رہے گی۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ ہم سے کسی نے پیسے کا وعدہ نہیں کیا ہے، ہم اپنے وطن کے مسلمانوں سے روٹی مانگیں گے، معلوم نہیں وہ روٹی دیں گے بھی یا نہیں؟ ہمیں پھر پڑھنے کا موقع بھی نہیں ملے گا، کیونکہ یہ کام ایک دن یا ہفتے کا نہیں اور نہ مہینے یا سال کا ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ تبدیلی کسی کے بس کی بات

بھی ہے یا نہیں؟ میں نے ان طلبہ کو غیرت اور حوصلہ دلانے کیلئے یہ بھی کہا کہ جب یہ فاسق اور فاجر لوگ اس شدید گرمی میں ان گرم پتھروں پر بیٹھ کر اللہ کی نافرمانی اور اللہ کے ساتھ دشمنی کر رہے ہیں اور کھلے عام یہ کام کر رہے ہیں تو پھر ہم اور آپ تو اپنے آپ کو اللہ والے اور دین والے کہتے ہیں، لیکن اس کے باوجود ہم دین کی خدمت کرنا چاہتے ہیں تو اعلانیہ نہیں کر سکتے۔ آپ لوگ اتنی غفلت نہ برتیں اور اتنی بے حمیتی کا مظاہرہ نہ کریں۔ پھر میں نے اپنے منصوبے کو ذرا مزید مشکل انداز میں پیش کرتے ہوئے ان طلبہ سے یہ بھی کہا کہ اگر ہم نے کسی جگہ پر قبضہ کرلیا تو وہاں بیٹھے رہیں گے، لیکن یہ گلے شکوے نہیں شروع کردیں گے کہ جی ہماری تعلیم نہیں ہے، ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں، اسلحہ نہیں ہے یا روٹی نہیں ہے۔ ان سب باتوں کے بعد میں نے ان سے پوچھا کہ بتایئے آپ لوگ یہ کام کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اللہ کی قسم ان چودہ طلبہ میں سے ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ میں یہ کام کر سکتا ہوں یا کرنے کیلئے تیار ہوں۔ ان سب نے مجھے یہی کہ اگر جمعہ کی رات (جب مدارس میں چھٹی ہوتی ہے) آپ کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو ہم ساتھ دے سکتے ہیں ورنہ نہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ جمعہ کے بعد یہ کام کون کرے گا؟ اللہ گواہ ہے، بات بالکل اسی طرح ہے، اگر یہ کام ہم اسلحہ یا دوسرے وسائل کے بھروسے پر کرنا چاہتے تو دوسرے مدارس کے طلبہ کو بھی انہیں کی طرح سمجھ کر واپس سیدھا اپنے مدرسہ میں آجاتے، لیکن میں نے اللہ کے ساتھ عہد کیا تھا اور محض توکل اختیار کیا تھا، لہذا میں نے اپنے عہد کو پورا کیا۔ یہ سب توکل کی برکت ہے، اللہ تعالیٰ نے میری مدد فرمائی اور میرے ساتھ وہ معاملہ کیا جو آپ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ بہرحال ان طلبہ سے رخصت ہو کر ہم دوسرے مدرسے میں آگئے۔ وہاں کے طلبہ سے بھی ہم نے اسی انداز سے بات کی، بلکہ ان کے سامنے کام کو مزید مشکل بنا کر پیش کیا اور انہیں باور کرایا کہ یہ کام آسان نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہاں کے سب طلبہ نے جو پانچ یا سات تھے، اپنے نام میرے پاس لکھوائے اور میرا ساتھ دینے کیلئے

تیار ہو گئے۔ یہ اور پہلے مدرسے کے طلبہ سب ایک ہی امت اور قوم سے تعلق رکھتے تھے اور ایک ہی علاقے میں رہتے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ یہ کسی دوسری امت کے تھے اور وہ دوسری امت کے، یہ بھی نہیں تھا کہ یہ مولوی تھے اور وہ جاہل، ایسا بھی نہیں تھا کہ یہ مرد تھے اور وہ عورتیں، یہ سفید ریش تھے اور وہ بچے۔ ابتداء ہی میں یہ عجیب حکمت تھی کہ مجھے ایک زبردست آزمائش سے گزرنا پڑا۔ یہی نقطہ آغاز تھا اور یہیں سے ہم نے تحریک شروع کی۔ ہم اسی طرح موٹر سائیکل پر گھومتے رہے، حتیٰ کہ عصر تک ہم نے ۵۳ افراد کو اپنے ساتھ کام کرنے کیلئے تیار کر لیا۔ صرف توکل کرنے والے افراد۔ میں نے ان سب سے کہا کہ آپ لوگ صبح سویرے ہمارے پاس آ جائیں اور پھر میں اپنے ٹھکانے پر چلا آیا۔ لیکن وہ سب طلبہ رات ہی کو ایک بجے ہمارے محلے میں آ گئے، حالانکہ ابھی چوبیس گھنٹے بھی پورے نہیں ہوئے تھے، ہمارے ایک مولانا صاحب صبح سویرے مسجد میں گئے تو دیکھا کہ وہ سب طلبہ وہاں پہلے سے پہنچے ہوئے ہیں۔ اسی دن صبح دس بجے ہم اپنے ساتھ دو ڈرائیور بھی لے آئے۔ پھر ہم نے اپنا ایک آدمی حاجی بشر نامی شخص کے پاس بھیجا اور اس سے دو گاڑیاں مانگیں۔ اس نے گاڑیاں فراہم کر دیں۔ پھر ہم اپنے ان ساتھیوں کو ''کشک نخود'' لے آئے، کچھ اور افراد بھی ہمارے ساتھ ہو گئے۔ جب تعداد بڑھی تو ہم نے اپنے ٹھکانے سے پانچ میل کے فاصلے پر اسلحہ اکٹھا کیا اور کام شروع کر دیا۔''

☆ ☆

بانیٔ تحریک کے ذاتی کردار میں ان کے حالات زندگی کے کئی روشن پہلو بہت اہم اور واضح ہیں جن کے ذکر کے بغیر ان کا تذکرہ یقیناً ادھورا سمجھا جائے گا۔ ملا محمد عمر مجاہد کی شخصیت کا سب سے اہم پہلو ان کا تقویٰ اور پرہیزگاری ہے۔ اپنے اس وصف کی بناء پر انہیں طالبان میں انتہائی محترم مقام حاصل ہے۔ ملا محمد عمر کے تقویٰ اور پرہیزگاری کی اسی شہرت کا تذکرہ کرتے ہوئے پیٹر مارسڈن نے لکھا ہے:

''یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ (ملا محمد عمر) ایک متقی آدمی ہیں اور سادہ سی زندگی بسر کرتے ہیں۔''

راقم الحروف کو طالبان کے ایک قدیم ساتھی نے بتایا کہ تحریک طالبان کے منظم ہونے کے بعد

جب پہلی مرتبہ باقاعدہ امیر المؤمنین منتخب کرنے کیلئے مشاورت کی گئی تو اکثریت نے ملا محمد عمر کے پرانے ساتھی ملا یار محمد شہید رحمہ اللہ کے بارے میں مشورہ دیا کہ انہیں امیر منتخب کیا جائے۔ مگر پھر ملا یار محمد شہید نے کہا کہ اگرچہ میں عمر میں بڑا ہوں لیکن میری نظر میں ملا محمد عمر تقویٰ اور پرہیزگاری میں سب سے آگے ہیں لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ ملا محمد عمر صاحب ہی کو امیر منتخب کیا جائے۔ یہ سن کر تمام ارکان شوریٰ نے ملا محمد عمر کو امیر تسلیم کیا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔

غالباً اسی تقویٰ ہی کا نتیجہ ہے کہ ملا محمد عمر بہت ہی کم گو واقع ہوئے ہیں اور وہ لوگ جن کو ان سے ملاقات کا موقع ملا ہے اچھی طرح جانتے ہیں ملا عمر صاحب مختصر الفاظ میں جامع بات کرتے ہیں اور انتہائی دھیمے لہجے میں پست آواز سے بولتے ہیں۔

انہیں لوگوں سے اختلاط اور میل جول کا بھی قطعاً شوق نہیں صرف ضرورت کے وقت لوگوں سے ملتے ہیں اور کسی غیر مسلم سے ملنا تو انہیں بالکل ہی گوارا نہیں۔ غیر ممالک سے آئے ہوئے سرکاری نمائندوں سے بھی ان کی ملاقاتیں نہ ہونے کے برابر رہی ہیں۔ شاید وہ واحد سربراہ مملکت رہے ہیں جنہوں نے سات سال حکمرانی کی لیکن اس دوران ایک بار بھی وہ اپنے ملک سے باہر نہیں گئے۔ سعودی عرب کے شہزادے ترکی الفیصل نے جب ایک ملاقات کے دوران انہیں سعودی حکومت کی جانب سے اپنے وزراء اور مشیروں سمیت حج وعمرہ کی دعوت دی تو انہوں نے جواب دیا کہ ”ابھی ہم پر جہاد فرض ہے حج وعمرہ نہیں، جب ہم جہاد سے فارغ ہو جائیں گے تو پھر حج وعمرہ بھی ادا کرلیں گے۔“

اپنے پورے دور حکومت میں وہ صرف دو مرتبہ ملک کے دارالحکومت کابل گئے اور اس کے علاوہ ان کے کسی تفصیلی سفر کے بارے میں معلومات نہیں۔

ملا محمد عمر صاحب علماء کرام، بزرگوں اور مشائخ سے خصوصی عقیدت رکھتے ہیں اور اپنے دور میں انہوں نے ایسے لوگوں کی بھرپور خدمت کی ہے۔ اسلام کی سربلندی اور ملت کی بقاء کیلئے اپنی جانوں کا نذرانہ دینے والے شہداء سے بھی انہیں حد درجہ محبت تھی، چنانچہ وہ بارہا ان دو قبرستانوں پر فاتحہ خوانی اور مراقبہ کی حالت میں دیکھے گئے جن میں سے پہلے قبرستان میں وہ شہداء مدفون ہیں جنہیں روسی افواج نے گمنامی کے عالم میں شہید کر کے ایک ہی قبر میں دفن کر ڈالا تھا، کہا جاتا ہے کہ ان میں اکثر شہداء علماء دین تھے۔ دوسرا قبرستان قندھار کے شمال میں واقع ہے جس میں ۱۹۹۷ء میں مزار شریف میں ازبکوں اور شیعوں کے ہاتھوں شہید ہونے والے ہزاروں طالبان کی قبریں ہیں۔ قندھار سے

طالبان کے انخلاء کے کچھ دنوں بعد قندھار کے کچھ لوگوں نے ایک دن اچانک ہی ملا عمر صاحب کو اول الذکر قبرستان میں حسب سابق فاتحہ خوانی کرتے ہوئے دیکھا، اس واقعہ کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے علاقے میں پھیل گئی مگر جب امریکی افواج نے ملا صاحب کو گرفتار کرنے کیلئے اس قبرستان کا رخ کیا تو وہاں ملا عمر کا نام ونشاں تک نہ تھا، علاقے کی ناکہ بندی کے باوجود امریکیوں کو وہ نہیں مل سکے۔

ملا عمر صاحب کی کامیاب قیادت کا ایک راز ان کی طبیعت کا استغناء بھی ہے۔ وہ اگر چاہتے تو افغانستان جیسے ملک کی حکمرانی کے دوران بھی عیش وعشرت کی زندگی بسر کر سکتے تھے مگر انہوں نے سات سال کے طویل عرصے میں کبھی بھی اپنی بات چیت، رہن سہن، کھانے پینے یا سفر وحضر سے یہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی کہ وہ امارت اسلامیہ افغانستان کے حکمران ہیں۔

میری ذاتی معلومات کے مطابق انہیں پاکستان کے بعض حلقوں کی جانب سے اعلیٰ رہائش گاہ کی پیشکش کی گئی مگر انہوں نے بے نیازی کے ساتھ اس درخواست کو رد کر دیا۔ تحریک طالبان کے ابتدائی دنوں میں انہوں نے قندھار کے مضافات میں ایک کچے مکان میں رہائش رکھی اور پھر جب سرکاری مصروفیات بڑھ گئیں تو وہ قندھار شہر میں بنے ہوئے ایک بڑے مگر سادہ سے مکان میں منتقل ہو گئے۔ اس مکان کے دروازے کی دونوں جانب مندرجہ ذیل عبارت جلی حروف میں لکھی تھی:

لله الأمر

(حکمرانی صرف اللہ ہی کیلئے ہے)

ملا عمر صاحب کو کئی مرتبہ ان کے مخالفین نے بڑی بڑی رقوم پیش کرنے کی بھی کوشش کی مگر انہوں نے ہمیشہ ایسی پیشکش کو رد کر دیا۔ تحریک طالبان کے ابتدائی دنوں میں کابل پر حکومت کرنے والے صدر ربانی نے اپنا ایک وفد ملا عمر صاحب سے اظہار یکجہتی کے نام پر روانہ کیا جس میں کابل حکومت کے وزیر اطلاعات اور وزیر معارف وتربیت شیخ جلیل بھی شامل تھے۔ اس وفد نے ملا عمر صاحب کو ربانی کی جانب سے چار ہزار ملین افغانی کرنسی کا ہدیہ پیش کیا اور کہا کہ یہ صدر ربانی کی جانب سے تھوڑا سا تحفہ ہے۔ مگر ملا محمد عمر نے اس تحفہ کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہوئے ان سے اپنے علاقوں میں امن وامان قائم کرنے اور شریعت نافذ کرنے کا مطالبہ کیا۔

صحیح مؤقف پر پختگی سے ڈٹے رہنا اور اصولوں پر سودے بازی نہ کرنا بھی ان کی طبیعت اور مزاج

کا خاص عنصر رہا ہے۔ ان کو اپنے دور میں کئی مواقع ایسے پیش آئے جب انہیں اپنے صحیح موقف کے مقابلے میں دنیا بھر سے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، حتی کہ بعض اوقات ان کے قریبی وزراء اور مشیروں نے بھی انہیں مؤقف میں لچک پیدا کرنے پر مجبور کیا، مگر وہ پھر بھی اپنی کہی ہوئی بات پر ڈٹے رہے۔ ملا عمر صاحب کے دور میں ہمیں اس ثابت قدمی کی کئی مثالیں نظر آتی ہیں۔ جن میں سے چند ایک درج ذیل ہے:

شیخ اسامہ بن لادن کے حوالے سے طالبان کو اپنے سات سالہ عہد میں سے پانچ سال تک شدید اشکالات اور اعتراضات کا سامنا رہا ہے اور اس سلسلہ میں بیرونی دنیا کی جانب سے انہیں بار بار بری طرح مشکلات جھیلنی پڑیں اور یہ مشکلات بعض اوقات اس قدر بڑھ جاتیں کہ طالبان کے کئی بڑے بڑے عہدیدار اس مشکل سے چھٹکارا حاصل کرنے کیلئے شیخ اسامہ کی میزبانی کے مؤقف پر لچک میں آجاتے مگر اس سلسلہ میں ملا عمر صاحب نے ہمیشہ دوٹوک مؤقف کا اظہار کیا اور اسی پر وہ شروع سے لے کر آخر تک قائم رہے۔ حتی کہ جب شیخ اسامہ کی میزبانی کی پاداش میں افغانستان پر ۱۹؍۲۰ ؍اگست ۱۹۹۸ء کی درمیانی شب بمباری کی گئی تو اس وقت بھی ملا عمر صاحب کے مؤقف میں کوئی لچک نہیں آئی۔ ان حملوں سے چند دن قبل بی بی سی پشتو سروس نے ملا عمر صاحب سے اس موضوع پر انٹرویو کیا جس میں ملا صاحب نے اپنا مؤقف مندرجہ ذیل انداز میں پیش کیا:

> ''تمام حکومتیں ہمارے مقابلے پر آئیں تو بھی دنیا کی کوئی طاقت ہمیں اسامہ کو حوالے کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ اسامہ ہمارا مہمان ہے اسے ہم کسی دباؤ یا لالچ پر کسی کے بھی حوالے نہیں کر سکتے، کوئی بھی غیرت مند مسلمان کسی مسلمان کو کسی کافر کے حوالے نہیں کر سکتا۔ ہم اسامہ کی حفاظت آخر دم تک کریں گے اور ضرورت پڑی تو اس کی حفاظت اپنے خون سے کریں گے۔ امریکی سی آئی اے نکمی اور بے کار ہو چکی ہے جبھی وہ اپنی خراب کارکردگی کو چھپانے کیلئے ہر بم دھماکے کا الزام اسامہ پر لگاتی ہے۔ اسامہ کے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں کہ وہ اتنے دور دراز علاقوں میں بم دھماکے کرائے۔''

اس انٹرویو کے چند دن بعد ہی امریکہ نے افغانستان پر رات کے اندھیرے میں حملہ کر دیا۔ کروز میزائلوں سے کیے جانے والے ان حملوں کے نتیجے میں افغانستان میں زبردست تباہی پھیلی مگر

اس مرد قلندر کا اب بھی وہی مؤقف تھا۔ چنانچہ حملوں کے بعد جب بی بی سی نے دوبارہ انٹرویو کیا تو انہوں نے کہا:

"پورا افغانستان بھی اُلٹ جائے اور ہم تباہ و برباد بھی ہو جائیں تو بھی شیخ اسامہ کو کسی کے حوالے نہیں کریں گے۔ میری غیرت برداشت نہیں کرتی کہ کسی مسلمان کو کافر کے حوالے کروں۔ ہماری قوم اسلامی غیرت سے سرشار ہے اور ہم ہر قسم کے خطرات برداشت کرنے کیلئے تیار ہیں۔ امریکہ جو کرنا چاہتا ہے کر لے، ہم بھی جو کر سکتے ہیں کریں گے۔"

ملا محمد عمر مجاہد نے شیخ اسامہ کے مؤقف پر لچک رکھنے والے اپنے کئی وزراء مشیروں اور سفیروں کو بھی برطرف کر دیا یا انہیں معطل کر دیا۔ مگر خود آخر وقت تک اپنی بات پر ڈٹے رہے اور پھر اسی کی پاداش میں افغانستان کا اقتدار ان سے چھین لیا گیا۔ لیکن یہ بات اب بھی پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ آج بھی افسردہ نہیں ہوں گے۔ کیونکہ انہوں نے خود ایک مرتبہ سعودی شہزادے ترکی الفیصل سے کہا تھا:

"جب تک ہمارے اندر خون کا ایک قطرہ بھی باقی ہے ہم اسامہ کی حفاظت کریں گے، خواہ افغانستان کے سب گھر تباہ ہو جائیں، پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں اور لوہا پگھل جائے ہم پھر بھی اسامہ کو حوالے نہیں کریں گے۔"

ملا عمر مجاہد کے عزم و استقلال کے کڑے امتحان کا ایک اور موقع اس وقت پیش آیا جب ۱۹۹۹ء کے آخر میں انڈین ائیر لائن کے ایک مسافر طیارہ کو بعض نامعلوم افراد اغوا کر کے قندھار لے آئے اور اس کے بدلے انہوں نے بھارتی جیلوں میں قید کشمیری جہادی راہنما مولانا محمد مسعود اظہر اور ان کے اسیر رفقاء شیخ عمر سعید اور مشتاق زرگر کی رہائی کا مطالبہ کر دیا۔ طیارہ ہائی جیکنگ کے واقعہ کا حل تلاش کرنا طالبان کیلئے ایک چیلنج کی شکل اختیار کر گیا کہ اگر وہ اس میں جانبداری کا مظاہرہ کرتے تو سارا الزام ان پر آتا اور اگر وہ اس سے دستبردار ہوتے تو وہ بھی انہیں پسند نہیں تھا، کیونکہ اغواء کے بدلے میں اغواء کار جن لوگوں کی رہائی چاہتے تھے وہ سب مجاہدین تھے اور طالبان دنیا کے کسی بھی خطے کے مجاہدین کیلئے خیر خواہی کے بھرپور جذبات رکھتے تھے۔ اس موقع پر طالبان کے کئی راہنماؤں نے ملا محمد عمر صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ اس معاملے سے بیدخل ہو جائیں اور طیارے کو کہیں اور روانہ کر دیں۔ مگر ملا عمر نے اس سے

انکار کر دیا اور کہا کہ کچھ بھی ہو جائے وہ اس مسئلے کو حل کرنے میں ضرور دلچسپی لیں گے۔ان کے اس فیصلے کے بعد دنیا نے دیکھا کہ طالبان نے جس دانائی اور ہوشیاری سے یہ مسئلہ حل کیا پوری ہائی جیکنگ کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔خود بھارتی حکام نے بھی اس موقع پر ملا محمد عمر مجاہد اور ان کے ساتھیوں کی حکمت عملی کا اعتراف کیا۔

ملا محمد عمر مجاہد کے مؤقف پر ڈٹے رہنے کی تیسری واضح مثال اس وقت سامنے آئی جب ۲۰۰۰ء میں طالبان نے بامیان کے بتوں کو مسمار کرنے کا فیصلہ کیا۔اس فیصلے کے بعد دنیا بھر کے ممالک نے طالبان کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی۔مگر ملا عمر صاحب نے بیرونی دنیا کے پروپیگنڈے کی نہ پرواہ کی اور نہ ہی ذرائع ابلاغ کا مخالفانہ رویّہ انہیں اس سے روک سکا۔انہوں نے ان مشکل حالات میں بھی اپنے مؤقف پر ثابت قدمی دکھاتے ہوئے بتوں کو وقت مقررہ پر مسمار کروایا، اور پھر اس پر شکرانے کے طور پر سو گائیں کی قربانی بھی پیش کی۔بتوں کی مسماری کے بعد امیر المؤمنین نے مسلمانوں کے نام ایک خصوصی پیغام جاری کیا، جس میں کہا گیا تھا کہ:

''بلاشبہ بتوں کو معبود کے طور پر یا کسی اور حیثیت سے رکھنا منکرات کے سوا کچھ نہیں اور منکرات کی حفاظت حرام ہے۔یہ عبرت کا سامان نہیں بلکہ شرک اور بت پرستی کی یاد تازہ کرنے کے اسباب ہیں۔اور اگر بت عبرت کے اسباب ہوتے تو ان کو دیکھنے کیلئے آنے والے سیاح عبرت کے خزانے ہوتے۔جو لوگ بتوں کی حفاظت میں مصلحت سمجھتے ہیں ان کی مصلحت تو محض یہ ہے کہ کافروں کو خوش کیا جائے اور کافر تو قرآن کے فیصلے کے مطابق مسلمانوں سے ہرگز راضی نہیں ہوں گے۔اِلّا یہ کہ ان کی راہ اختیار کی جائے۔نعوذ باللہ۔بلاشبہ یہ بت تو جاہلیت کی باقیات اور آثار ہیں۔کون احمق ان کو اپنے غیرت مند آباء واجداد کی یادگار مان سکتا ہے بلکہ غیرت مند مسلمان ان کے وجود کو اپنے لیے عار اور طعنہ سمجھتے ہیں اور اس کو ہٹانے کیلئے بے چین۔کیا ایسا بھی کوئی ہے جو آج اپنے گھر سے کوئی بت نکال کر فخر سے کہے کہ یہ میرے باپ دادا کا معبود ہے؟ ہمارے آباء واجداد کی نشانیاں اور آثار تو ان کے علمی، صنعتی، تعمیری اور بصیرت سے لبریز کارنامے ہیں، ان کی بیدار مغزی اور سمجھداری کی ایک شاندار تاریخ ہے اور

امارت اسلامی افغانستان خود کو اس ورثے کی حفاظت کا ذمہ دار سمجھتی ہے۔اس لیے ہم اپنے افغان بھائیوں اور دیگر مسلمان بھائیوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ افغانستان کی اسلامی امارت کی حیثیت اور اغراض واہداف کو اچھی طرح سمجھیں اور جان لیں کہ امارت اسلامی افغانستان اسلامی شریعت کو حق اور سچ سمجھتی ہے اور اسی کے نفاذ سے بہرہ مند ہے۔اور شرعی احکام کو توڑنا،ان کا مذاق اڑانا اپنے ایمان کے ساتھ کھیل کھیلنے کے مترادف ہے اور اس کیلئے وہ کبھی تیار نہیں ہوگی۔''

ملا محمد عمر مجاہد کی استقامت وعزیمت کا ایک بے مثال مظاہرہ اس وقت ہوا جب گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کے حملوں کے بعد امریکہ نے افغانستان پر باقاعدہ حملوں کا اعلان کر دیا۔یہ وقت سخت مشکل اور کٹھن تھا کیونکہ ایک طرف کمزور سا افغانستان تھا اور دوسری جانب امریکہ جیسی طاقتور حکومت،لیکن اس صورتحال میں بھی ملا محمد عمر اپنے موقف پر پوری طرح ڈٹے رہے اور انہوں نے ثابت کر دیا کہ بے غیرتی کی زندگی کی نسبت عزت کے ساتھ مر جانا زیادہ بہتر ہے۔افغانستان کے خلاف امریکی جارحیت کے آغاز کے موقع پر امیر المؤمنین نے افغان عوام سے آخری خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''موجودہ حالات میں ہر مسلمان کو اس کا ایمان اور اس کی غیرت للکارتی ہے کہ ہر گھڑی ثابت قدم رہے،اگر ایمان اور غیرت نہ ہو تو مسلمان ہمیشہ خوف زدہ ہوں گے اور پھر ان کا احترام روئے زمین پر نہ ہوگا،چنانچہ وہ آخر کار مریں گے بھی لیکن بے ایمانی اور بے غیرتی کی حالت میں مریں گے،لہٰذا اول تو پوری دنیا کے مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنے ایمان کے متعلق غیرت کا اظہار کریں، چاہئے کہ افغانستان کے بارے میں غیرت کا اظہار کریں،اور چاہئے کہ مسلمانوں کے معاملے میں غیرت کا اظہار کریں،اسلام کی خاطر قربانی میں ہر ایک کو ہر کام کیلئے حاضر ہونا چاہئے اور اگر بالفرض وہ ایسا نہیں کرتے تو نہ کریں، وہ تو ہر کسی کا اپنا معاملہ ہے لیکن افغانستان کے عوام کو تو اپنی تاریخ،غیرت اور ایمان پر قائم رہنا چاہئے،انگریزوں اور روسیوں کے وقت تو میں نہیں تھا،نہ طالبان تھے،نہ اسامہ تھا،تو پھر وہ کیوں آئے؟افغانستان کے لوگوں نے قربانی دی،تو نہ میں نے ان کو کہا تھا نہ اسامہ نے ان کو کہا تھا۔نہ انہیں کندھے سے ہلا

کر کہا گیا تھا کہ لیجئے یہ کام کریں۔اس وقت افغانستان کے عوام نے جہاد کیا اور غیرت اور ایمان کا کام کیا۔اب بھی اسی طرح کا ایک معاملہ ہے۔ ہر مسلمان کو اس وقت ثابت قدمی دکھانی چاہئے، چاہے مرے یا زندہ رہے لیکن راستہ یہی ہے اور ضرور بالضرور کامیابی اسی صورت میں حاصل ہوتی ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے، مسلمان کو اپنے خدا پر اعتماد کرنا چاہئے، اپنے خدا کے قول اور خبر پر یقین رکھنا چاہئے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین" (آپ لوگ کامیاب ہوں گے اگر آپ مومن ہوں گے) مومن کے معنی یہ تو نہیں کہ بس میں تو کچھ نہیں کر سکتا، بس محض مؤمن ہیں، صرف ''ہم مومن ہیں'' پر تو آپ کی نجات نہیں ہوسکتی، ہاں! جب آپ خود کو سچا مومن بنالیں تو پھر آپ کیلئے ضرور بالضرور کامیابی ہوگی، یہ اللہ جل جلالہ کا وعدہ ہے اور خدا تعالیٰ کبھی اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔عجیب بات ہے کہ میں نہ حواس باختہ ہوتا ہوں اور نہ ہی بے دینوں کے ساتھ اسلام کے خلاف راستہ اختیار کرتا ہوں، باوجودیکہ میرا اقتدار بھی خطرے میں ہے، میری سربراہی اور کرسی بھی خطرے میں ہے، میری زندگی بھی خطرے میں ہے، پھر بھی جان بھی قربان کرنے کیلئے تیار ہوں، اگر میں کافروں کے مطالبے پر ایسی راہ اختیار کرلوں جو اسلام کے خلاف ہو ان کے ساتھ موافقت کروں اور ان کے ساتھ معاملات ٹھیک رکھوں تو میری ہر چیز مستحکم ہوگی، میری بادشاہی اور سلطنت بھی برقرار رہے گی اور اسی طرح طاقت، پیسہ اور جاہ وجلال بھی خوب ہوگا، جس طرح دیگر ممالک کے سربراہوں کا ہے، لیکن میں اسلام کی خاطر ہر قربانی کیلئے حاضر ہوں، سب کچھ کرنے کیلئے حاضر ہوں، جان قربان کرتا ہوں، سب کچھ سے بے پرواہ ہو چکا ہوں، سلطنت، اقتدار، طاقت اور ہر چیز کی قربانی کا عزم کر چکا ہوں، اسلامی غیرت کرتا ہوں، اسلام پر فخر کرتا ہوں، اس پاک وطن پر غیرت کرتا ہوں، تو ایک عام فرد کو کیا ضرورت پیش آئی کہ وہ بے غیرتی اور بزدلی دکھائے جس کی کوئی بھی چیز خطرے میں نہیں ہے؟ صرف اسے ایک وقت

جہاد میں حاضر ہونا ہوگا یا حاضر نہیں ہوگا اور پھر بھی حواس باختہ ہوتا ہے، اس طرح جو غیر ممالک میں بیٹھے ہوئے ہیں ان کو کیا حادثہ پیش آیا ہے؟ یہ لوگ کس وجہ سے بوکھلائے ہوئے ہیں، اور کس چیز سے خوفزدہ ہیں؟ جبکہ ان کی کوئی بھی چیز خطرے میں نہیں ہے، میری زندگی، تمام طاقت اور اقتدار خطرے میں ہے اور پھر بھی غیرت کرتا ہوں تو آپ کو کیا ہوا کہ آپ ایسا نہیں کر سکتے یا نہیں کرتے؟ آپ کا ایمان ضعیف ہے اس لیے آپ ایسا نہیں کرتے، اگر آپ میں ایمان ہے اور آپ کو اپنے ایمان پر فخر ہے یا آپ مضبوط ایمان کے طلبگار ہیں تو پھر آپ کو بھی ضرور ایسا ہی کرنا چاہئے، جب میں اس قربانی کیلئے خود کو پیش کرتا ہوں اور کسی چیز کی پروا نہیں کرتا تو آپ کیوں ایسا نہیں کر سکتے؟ میں آپ پر حیران ہوں۔ اگر آپ میں ایمان ہو اور آپ کا ضمیر زندہ ہو تو چاہئے کہ آپ اٹھ کھڑے ہوں اور اگر ایمان اور ضمیر آپ میں نہیں تو پھر مجھے بھی آپ کی پروا نہیں، پھر میں آپ کی کیا بات مانوں؟ کیوں مانوں؟ اور کس طرح مانوں؟ آپ مجھے مشورہ دیتے ہیں یا مجھے کہتے ہیں کہ ایسا کرو ایسا کرو۔ اگر آپ میں مضبوط ایمان ہے تو آپ ایسی چیز کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتے جس میں ایمان کا نقصان ہو، جس میں اسلام کا نقصان ہو، جس میں ملکی حدود کا نقصان ہو یا اس میں دیگر نقصانات ہوں، یہ جو آپ سب کچھ برداشت کرتے ہیں تو محض اس لیے کہ آپ کا ایمان کمزور ہے، آپ کا اسلام کمزور ہے، آپ کو چاہئے کہ اپنی اصلاح کریں اور آپ کو چاہئے کہ ایمان اور اسلام کو مضبوط کریں، آپ خود اپنے طریقہ کار پر نظر ثانی کریں، ایمان اور اسلام کو تھامے رکھیں، اگر آپ اس کی خواہش کریں کہ میں اپنے ایمان اور اسلام کی حفاظت کروں اور اپنی غیرت کو محفوظ کروں تو کبھی ایسی چیز وجود میں نہیں آسکتی جس میں دین یا ملت کا نقصان ہو، لہٰذا ہر مسلمان اس بارے میں غور کرے اور پکا عزم کرے، اپنے اسلام اور قرآن پر غیرت کرے، اللہ جل جلالہ کی مہربان ذات آپ کو کامیابی دے۔ کامیابی صرف یہ ہے کہ ایمان پر موت آئے۔ یہی بڑی کامیابی ہے، اور اگر کچھ

بھی نہ ہو تو صرف یہی بڑی کامیابی ہے۔ اسلام کے پرچم کی سربلندی اسی میں ہے، اس میں نہیں کہ دنیاوی چیزیں باقی رہ جائیں۔ مسلمان کی حقیقی کامیابی اس میں ہے کہ اسلام کی ناموس اور غیرت اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا کلمہ اور اسلام کا پرچم اسی طرح اونچا اور بلند رہے، اگر ہم ایسی چیزوں پر راضی ہو جائیں جو کفار کو پسند ہوں تو ہم نے اسلام کے نام کو ڈھا دیا اور اسلامی غیرت کو ملیامیٹ کر دیا، یاد رکھئے! بہادری اور قربانی سے اسلام کا پرچم نہیں جھکتا، اسلام کا پرچم ان چیزوں سے جھکتا ہے جن چیزوں سے ایمان اور اسلام کو نقصان پہنچتا ہو۔ اسی طرح کفار کی بات ماننے سے اسلامی پرچم جھک جاتا ہے۔ اگر آئندہ دنوں جہاد کی ضرورت پیش آجائے تو ضروری ہے کہ ہر مسلمان آمادہ ہو، چاہئے کہ اپنی جان کی قربانی کیلئے تیار ہو، ہر شخص یہ سمجھ لے کہ جب میں کسی کو جہاد پر ابھارتا ہوں اور اس کی ترغیب دیتا ہوں تو اپنے اقتدار کیلئے نہیں دیتا، میرے اقتدار کی حفاظت تو اس میں نہیں ہے، اس کی حفاظت تو اس میں ہے کہ جس طرح دیگر ممالک کفار کے راستے پر عمل پیرا ہیں میں بھی ان کے راستے پر عمل پیرا ہو جاؤں، اس وقت یہ لوگ میری بہت زیادہ اور مکمل حمایت کریں گے، حتی کہ فوج بھی دیں گے، مالی امداد بھی دیں گے، سب کچھ دیں گے، تو اقتدار کی حفاظت ان کی بات ماننے میں ہے، اس میں نہیں ہے کہ سر ننگا کر کے قربانی کیلئے حاضر ہو جاؤں۔''



امیر المؤمنین ملا محمد عمر مجاہد کی عسکری صلاحیتوں اور جنگی چالوں کا بھی تحریک طالبان کی فتوحات میں بہت بڑا کردار ہے۔ چنانچہ یہ بات بھی جانتے ہیں کہ ملا محمد عمر مجاہد اگرچہ خود قندھار میں رہتے تھے مگر وائرلیس کے ذریعہ بڑی بڑی جنگوں میں برابر کے شریک رہے۔ وہ جنگی میدانوں میں ہر قدم پر طالبان کی راہنمائی کرتے اور مسلسل انہیں آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے سے متعلق ہدایات جاری کرتے رہتے۔ طالبان کے کئی اہم جنگی کمانڈروں نے خود کئی بار ان کی اس صلاحیت کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔ جس کی سب سے اہم وجہ شاید یہ تھی کہ بعض اوقات جب انہوں نے ملا محمد عمر کی ہدایات کو نظر انداز کرنے کی

کوشش کی تو انہیں بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ ایسا ہی ایک واقعہ ۱۹۹۷ء کے آخر میں اس وقت پیش آیا جب طالبان کی افواج قندوز سے نکل کر دوسری مرتبہ مزار شریف پر حملہ آور ہوئیں۔ جب طالبان تاشقرغان شہر میں پہنچے جو مزار شریف سے تقریباً ۴۰ کلومیٹر کی مسافت پر واقع ہے تو ملا عمر صاحب کی جانب سے انہیں ہدایت ملی کہ آئندہ کل وہ مزید پیش قدمی کر کے مزار شہر سے باہر واقع دوراہے کے مقام پر جمع ہو جائیں لیکن اس سے آگے مزید پیش قدمی اس وقت تک نہ کریں جب تک قندھار سے مزید ہدایات نہ مل جائیں۔ اگلے دن جب طالبان نے مزار شریف کی جانب سے بڑھنا شروع کیا تو دشمن نے اپنے مورچے چھوڑ کر شہر کی جانب پسپائی شروع کر دی اور پسپا ہوتے ہوئے وہ دوراہے سے بھی آگے گزر کر شہر کے اندر داخل ہو گئے۔ طالبان نے جب دشمن کو یوں فرار ہوتے دیکھا تو وہ امیر کی ہدایت بھول گئے اور دشمن کا تعاقب کرتے ہوئے دوراہے سے آگے بڑھ گئے۔ مگر کچھ ہی دیر بعد انہیں احساس ہوا کہ دشمن ہر دو طرف سے انہیں گھیرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دشمن کی اس چال کو سمجھتے ہی طالبان کو کسی قدر پسپائی اختیار کرنی پڑی، جس کے نتیجے میں اگلے دن شام کے وقت وہ واپس اسی دوراہے کے مقام پر پہنچ گئے جہاں رکنے کا انہیں حکم ملا تھا۔

قندھار میں بیٹھ کر جنگوں میں شمولیت ہی کی وجہ سے ملا محمد عمر صاحب ان دنوں جب طالبان کسی جنگ میں مصروف ہوتے تھے قندھار میں آنے والے کسی بھی مہمان سے ملنے سے معذرت کر لیتے تھے۔ ایسے دنوں میں ان کے مشیر اور وزیر یہی بتاتے تھے کہ ملا صاحب بہت مصروف ہیں اور سارا دن نقشہ سامنے رکھ کر برسرِ پیکار مجاہدین کو ہدایات جاری کر رہے ہیں۔

ملا محمد عمر کا امریکہ طالبان جنگ کے دوران دشمن کے اندھا دھند حملوں کے درمیان زندہ رہنا بھی کسی کرامت سے کم نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کے بعد اس حفاظت میں ملا صاحب کی اپنی عسکری صلاحیت کا بھی خوب دخل تھا، جس کا اظہار مختلف مقامات پر ہوتا رہا۔ مجھے طالبان کے ایک ساتھی نے بتایا کہ اس جنگ کے دوران ایک دن ملا صاحب اپنے چند معتمد ساتھیوں کے ساتھ کسی خفیہ ٹھکانے پر تھے کہ وہیں بمباری شروع ہو گئی۔ ملا صاحب نے جلدی سے وہ مقام بدل دیا، مگر فوراً ہی دوسری جگہ بھی بمباری شروع ہو گئی۔ ملا صاحب نے پھر جگہ بدل لی لیکن پھر وہی معاملہ ہوا۔ یہ صورتحال دیکھ کر ملا صاحب نے اپنے ہاتھ سے وائرلیس سیٹ پھینک دیا اور پھر جب ٹھکانہ بدلا تو بمباری نہ ہوئی۔

سخت سے سخت وقت میں نہ گھبرانا بھی ملا محمد عمر صاحب کا ایک اہم وصف ہے۔ ان پر جیسے کیسے بھی حالات آتے وہ اسے خندہ پیشانی سے برداشت کرتے۔ مجھے بعض طالبان نے بتایا کہ ۱۹۹۸ء میں ایک مرتبہ طالبان کا عیشہ (خرچہ پانی) بند ہوگیا۔ جب کمانڈروں نے ملا صاحب سے اس سلسلہ میں بات کی تو انہوں نے بتایا کہ سرکاری خزانہ بالکل خالی ہے اور ان کے پاس طالبان کو دینے کیلئے کچھ نہیں۔ انہوں نے ان حالات میں اپنے کمانڈروں سے کہا:

''آپ میں سے جو مجھے چھوڑ کر جانا چاہتا ہے وہ چلا جائے اور جو ان حالات میں میرے ساتھ رہنا چاہتا ہے وہ رہے۔ آپ کو اختیار ہے لیکن میں کسی بھی موقع پر جہاد سے دستبردار نہیں ہوں گا۔''

ملا محمد عمر صاحب اسی جذبۂ جہاد کی وجہ سے عالم اسلام کے سبھی مظلوم مسلمانوں کا بھی درد اور غم رکھتے ہیں اور اسی جذبے کے تحت انہوں نے بعض بین الاقوامی واقعات پر اپنے جذبات کا بھرپور اظہار کیا اور کئی موقعوں پر خلافِ عادت احتجاجی بیانات بھی جاری کیے۔ خاص طور پر کشمیر، فلسطین، چیچنیا اور کوسوو کے مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم پر انہوں نے سخت ردعمل کا اظہار کیا۔ قندھار میں ایک عید کے موقع پر لاکھوں مسلمانوں کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے ملا عمر صاحب نے کہا:

''مسلمان بھائیو! آج افغانستان کے ایک بڑے حصے پر اسلامی حکومت قائم ہے جس کی وجہ سے تم اطمینان اور خوشحالی کے ساتھ عید کی خوشیاں منا رہے ہو، مگر اس موقع پر تم ان مظلوم مسلمانوں کو نہ بھولو جو مختلف علاقوں میں ظالموں کے زیر تسلط ہیں اور اپنی جان و مال اور عزت کے دفاع کی طاقت نہیں رکھتے۔ تم اس مبارک موقع پر ان مظلوم مسلمانوں کی مدد کرنے کا عہد کرو اور اگر تم ان کی مدد نہیں کر سکتے تو کم از کم ان کیلئے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ان کو ظالموں سے نجات عطاء فرمائیں۔''

مسلمانوں سے اسی قلبی تعلق کی بناء پر انہوں نے پوری دنیا میں سب سے پہلے چیچنیا میں قائم ہونے والی اسلامی حکومت کو تسلیم کیا۔ حالانکہ کسی بھی دوسری حکومت نے ایسے اقدام کی جرأت نہ کی۔ ملا محمد عمر سے جب اس بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ ایسا کرنا ہمارا شرعی فرض تھا۔

یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ملا محمد عمر صاحب اور ان کی برپا کردہ تحریک کی تیز تر

کامیابیوں میں ملا صاحب کے ان فرامین کا بھی بہت زیادہ عمل دخل ہے جو انہوں نے اپنے دور حکومت میں مختلف مواقع پر جاری کیے۔ ان فرامین سے نہ صرف یہ کہ طالبان اور افغان عوام کو بہتر طریقے سے راہنمائی ملتی رہی بلکہ طالبان کے مخالفین بھی کم از کم اس بات کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے کہ ملا محمد عمر صاحب ایک عقلمند، باخبر اور باشعور حکمران ہیں جو انتہائی دانشمندانہ اور منجھے ہوئے انداز سے کاروبار مملکت چلا رہے ہیں۔ ہم آنے والی سطور میں ملا محمد عمر صاحب کے چند اہم اور تاریخی فرامین کے اقتباسات بطور نمونہ کے درج کرتے ہیں۔

سرکاری ملازمین کی جانب سے رشوت خوری کے سدباب کے پیش نظر ملا محمد عمر صاحب نے مندرجہ ذیل فرمان جاری کیا:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک اسلامی نظام حکومت میں غدر، خیانت اور رشوت جیسے مالی جرائم میں ملوث ہونا، اسلامی نظام کے بلند اہداف کے منافی اور اسکی بقاء کیلئے انتہائی مضر ہے۔ اور یہ چیز اللہ جل جلالہ کے غضب اور نظام حکومت کی ناکامی کا سبب بن سکتی ہے۔ افغانستان میں اسلامی تحریک طالبان کا قیام اور جد و جہد ایسے مفاسد کے قلع قمع کیلئے ہے تاکہ ان کا رفع دفع ہو سکے۔ اسی مقصد کو روبہ عمل لانے کیلئے مندرجہ ذیل دفعات منظور کی جاتی ہیں:

(۱)...... امارت اسلامیہ کی حدود میں کسی شخص کے بارے میں رشوت میں ملوث ہونے کا ثبوت مل جائے تو اسے بطور سزا پانچ سال قید کی سزا دی جائے گی۔

(۲)...... امارت اسلامیہ کی ساری عدالتیں اس بات کی پابند ہیں کہ رشوت میں ملوث مجرموں کے بارے میں دفعہ بالا کو نافذ کریں۔

(۳)...... یہ فرمانِ وقت اجراء سے نافذ العمل ہے ملک کے تمام ذرائع ابلاغ کے ذریعے اس کی تشہیر کی جائے۔''

عوام کی شکایات سننے اور لکھنے کے متعلق امیر المؤمنین نے امارت اسلامیہ کے گورنروں کے نام مندرجہ ذیل فرمان جاری کیا:

''السلام علیکم ورحمۃ اللہ! دینی اور ملی ذمہ داری کی بجا آوری کے تحت آپ حضرات اپنے صوبوں میں لوگوں کے مسائل اور جائز شکایات سننے کا

اہتمام کریں۔ اس امر کی نگرانی کیلئے ایک باصلاحیت اور فعال شوریٰ تشکیل دی جائے جو تحقیق کر کے لوگوں کے ساتھ گورنروں کے رویے کا جائزہ لیں اور خامیوں کی نشاندہی کریں، ان کی تیار کردہ رپورٹ میرے پاس بھیجی جائے۔ اس کام کی طرف اچھی طرح توجہ دیں اور اپنے اپنے صوبوں میں ایک ایک ''شکایت بکس'' رکھیں تا کہ وہ آپ کی اصلاحی جدوجہد میں مددگار رہو۔''

(واضح رہے کہ افغانستان کے صوبے صرف ایک بڑے شہر اور نواحی دیہاتوں پر مشتمل ہوتے ہیں)

افغانستان کے بحران کی سب سے بڑی وجہ وہاں کے لوگوں میں رچی بسی قوم پرستی اور علاقہ پرستی تھی۔ یہی وہ ناپاک جذبات تھے جنہوں نے ہنستے بستے افغانستان کو آگ میں دھکیل دیا۔ ملا محمد عمر صاحب نے اسی حوالے سے طالبان کیلئے ایک خصوصی فرمان جاری کیا:

''محترم طالبان! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ تحریک طالبان کے منشور میں قوم پرستی اور علاقہ پرستی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ جس شخص کو بھی ذمہ داری سونپی جاتی ہے وہ اس کی اہلیت اور دینداری پر پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد کی جاتی ہے تا کہ وہ دین وملت کی خدمت کرے خواہ وہ کسی بھی علاقے یا قوم سے تعلق رکھتا ہو، بعض اطلاعات کے مطابق سننے میں آیا ہے کہ بعض فسادی لوگ اس طرح کے مفسدانہ افکار کو رواج دینے کے خواہاں ہیں، ان کو حتمی طور پر یہ مفسد خیالات چھوڑنے چاہئیں، ورنہ یہ ان کی دین ودنیا کی تباہی ورسوائی کا سبب بنے گا۔ مذکورہ بات پر ضرور عمل کیا جائے کیونکہ ایک تو یہ امر واجب ہے، اس کے علاوہ اس کے خلاف کرنے میں ملت اسلامیہ کے بہت سے نقصانات بھی ہیں، بطور عبرت گزشتہ زمانے کی تاریخ پر غور وفکر کر لیا جائے۔''

ملا محمد عمر نے اپنے پیروکار طالبان کو یہ بھی ہدایت کی کہ چونکہ وہ لوگ ملک گیری کی ہوس میں نہیں بلکہ ایک مقدس مشن کی مقدس جنگ لڑ رہے ہیں لہٰذا ہر دم انہیں اپنے اعمال کی اصلاح کرتے رہنا چاہئے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے جو فرمان جاری کیا وہ اس طرح ہے:

''جیسا کہ آپ کا اور ہمارا مقصد جہاد اور اللہ کی زمین پر اللہ کا مقدس نظام قائم کرنا ہے تو اس مقدس ہدف کو حاصل کرنے کیلئے ضروری ہے کہ ہر جگہ

اور ہر وقت اسلامی اصولوں کے مطابق عمل کیا جائے۔ حالت جنگ میں اگر نامناسب کام اور منکرات صادر ہوں گے تو وہ جنگ میں ناکامی اور زخمیوں اور شہداء کی کثرت کا سبب بنتے ہیں، لہذا آپ سب ان منکرات کے سدباب کی جانب متوجہ ہوں اور ہر قیمت پر ان کا سدباب ہونا چاہئے تاکہ شریعت کے مطابق اور اخلاص سے جہاد کا فریضہ سرانجام دیا جا سکے۔''

کہا جاتا ہے کہ دنیا بھر میں استعمال ہونے والی چرس کا ۷۵ فیصد حصہ افغانستان میں پیدا ہوتا ہے۔ اور یہی چرس کی کاشت ہی افغانوں کا سب سے بڑا معاشی سہارا ہے۔ لیکن چونکہ شریعت اسلامیہ میں اس کی اجازت نہیں لہذا ملا محمد عمر صاحب نے پورے ملک میں چرس کی کاشت کو ممنوع قرار دیتے ہوئے مندرجہ ذیل فرمان صادر کیا:

''چونکہ چرس کا استعمال شرعی نقطہ نظر سے ایک ناجائز عمل ہے جس کی وجہ سے انسانی عقل وحواس کمزور ہو جاتے ہیں بلکہ بسا اوقات زائل بھی ہو جاتے ہیں۔ لہذا وزارت امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے وزیر اور تمام ذمہ داروں کو یہ اختیار دیا جا رہا ہے کہ جہاں کہیں چرس کا کاروبار یا اس کے کارخانے قائم ہیں ان کا مکمل خاتمہ کر دیں اور عوام سے اپیل ہے کہ اسلامی اور انسانی ہمدردی کے تحت ان کا بھرپور ساتھ دیں تاکہ کسی کو ان کی مزاحمت کا موقع نہ ملے۔''

ملا محمد عمر صاحب کے اس فرمان کے اجراء کے بعد خود اقوام متحدہ کے نمائندوں نے اس بات کی گواہی دی کہ افغانستان میں چرس کی کاشت کا ننانوے فیصد خاتمہ ہو چکا ہے۔

مغربی دنیا نے طالبان کو حقوق نسواں کی تلفی کے حوالے سے بھی سخت مورد الزام ٹھہرایا ہے۔ حالانکہ طالبان نے انہیں افغان تاریخ میں سب سے زیادہ حقوق فراہم کیے۔ امیر المؤمنین نے امارت اسلامیہ میں حقوق نسواں کے متعلق مندرجہ ذیل پیغام جاری کیا:

''جیسا کہ شریعت میں عورت کی عزت وعصمت کے مستقل حقوق ہیں جن پر عمل پیرا ہونے سے عورت کی عزت وعصمت محفوظ رہتی ہے، مگر افغان معاشرے میں بے انصافی پر مبنی غیر شرعی رسم ورواج کے تحت عورت اپنے حقوق سے محروم اور مختلف مظالم کا شکار ہے۔ اس قسم کے مظالم کے سدباب کیلئے

مندرجہ ذیل دفعات منظور کی جاتی ہیں:

(۱)...... ملک کا کوئی بھی شخص عورت کو دیت، ہرجانہ، صلح وغیرہ میں ہرگز نہیں دے سکتا۔

(۲)...... (الف) کسی بھی مسلمان کو اجازت نہیں کہ بیوہ عورت کو خاوند کے گھرانے ہی میں نکاح کرنے پر مجبور کرے۔ (ب) شرعی اصول کے مطابق بیوہ اپنی مرضی سے نکاح کرسکتی ہے۔

(۳)...... امارت اسلامیہ کے ججوں اور ذمہ داروں کو اجازت ہے کہ درج بالا دفعات کی خلاف ورزی پر سخت سزا دیں۔''

اقوام متحدہ کی جانب سے طالبان پر بار بار اعتراضات عائد کرنے اور اشکالات کرنے پر ملا محمد عمر صاحب نے اس بین الاقوامی ادارے کے رویے اور حیثیت کے حوالے سے ایک تفصیلی فرمان جاری کیا۔ جس کے آخر میں انہوں کہا:

''ہم اقوام متحدہ کے ساتھ بات چیت کیلئے اس شرط پر تیار ہو سکتے ہیں جب وہ اسلام کی حدود اور شریعت کے دائرے کے اندر ہو، کیونکہ اقوام متحدہ کا قانون اگر قرآن کے کسی حکم سے متعارض ہو جائے تو کسی مسلمان کے شایان شان نہیں کہ وہ اس کو تسلیم کرے کیونکہ مسلمانوں کی سلامتی کی واحد راہ اسلام ہے۔ جو لوگ اقوام متحدہ سے بہرحال اتفاق کرنے پر مصر ہیں تو یہ صرف اور صرف ان کی جہالت کا کرشمہ ہے۔''

ملا محمد عمر کے ان گرانقدر اور پرمغز فرامین سے ان کی قائدانہ صلاحیتوں کا بھی بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔



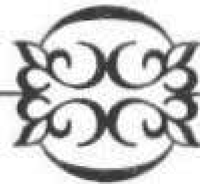
امریکہ طالبان جنگ کے نتیجے میں جب طالبان اقتدار کے ایوانوں کو خیر آباد کہہ رہے تھے تو اس وقت بھی ملا محمد عمر بالکل پرسکون تھے اور انہیں ذرا بھی غم نہ تھا کہ ان کے سات سالہ دور حکمرانی کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ انہوں نے بالکل پرسکون طریقے سے شہر چھوڑا اور درویشوں کی طرح اپنے کسی ٹھکانے کی جانب چلدیے۔ مجھے طالبان کے ایک قریبی ساتھی نے بتایا کہ جب طالبان نے قندھار چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا تو ملا صاحب نے تحریک کے سرکردہ افراد کو بلایا اور بیت المال کے اموال ان کے درمیان تقسیم کر دیے اور کہا

کہ یہ اموال امارت اسلامیہ کی آپ کے پاس امانت ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب کبھی پھر ہمیں موقع دے گا تو یہ واپس جمع کروانے ہوں گے۔ پھر انہوں نے اپنا اسلحہ بھی یہ کہہ کر ان کے حوالے کر دیا کہ یہ بھی بیت المال ہی کا ہے۔ بیت المال کو محفوظ ہاتھوں تک پہنچانے کے بعد ملا عمر صاحب اٹھے، اپنی چادر کندھے پر ڈالی اور دو قریبی رشتہ داروں کے ساتھ موٹر سائیکل پر سوار ہو کر نا معلوم مقام کی جانب روانہ ہو گئے۔ اس موقع پر جب طالبان نے ان سے کہا کہ ہم آپ کے ساتھ رہ کر آپ کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں تو انہوں نے کہا:

''میرا اللہ میرا حافظ ہے''

جرأت واستقامت کا پہاڑ، ہمت و بہادری کا پیکر، اللہ کا یہ برگزیدہ بندہ دنیا بھر کی مخالفتوں کے باوجود الحمدللہ آج بھی زندہ ہے اور کوہساروں گھاٹیوں اور صحراؤں میں کھڑا ہوا بانگ دہل یہ اعلان کر رہا ہے:

''امریکہ کے خلاف ہمارا جہاد جاری رہے گا''



۲

افغانستان تاریخ کے آئینہ میں

افغانستان براعظم ایشیا کے وسطی ممالک میں سے ہے۔ اس کے شمال میں سوویت یونین تھا جواب ٹوٹ کر ترکمانستان اور ازبکستان کی شکل میں بکھر چکا ہے۔ جبکہ شمال مشرق میں تاجکستان، مشرق میں چین، جنوب مشرق میں پاکستان اور مغرب میں ایران واقع ہے۔ افغانستان کا کل رقبہ چھ لاکھ باون ہزار کلومیٹر ہے۔ آبادی کا انسٹھ فیصد حصہ پشتون، انیس فیصد تاجک، پانچ فیصد ازبک اور تین فیصد حصہ ہزارہ قوم پر مشتمل ہے۔ آمو، ہلمند، بامون اور فرخ رود مشہور دریا ہیں جو سرزمین افغانستان کے بیشتر علاقوں کو سیراب کرتے ہیں۔

افغانستان ایک قدیم، تاریخی ملک ہے۔ لیکن اٹھارویں صدی تک اس میں سیاسی وحدت ناپید تھی۔ یہ علاقہ مختلف حصوں میں تقسیم تھا۔ جہاں الگ الگ حکومتیں قائم تھیں۔ ۳۳۰ ق،م میں سکندراعظم نے اس سرزمین کو فتح کیا اور اس کے کچھ عرصہ بعد یوچی قبائل نے اس پر قبضہ کرلیا۔ ۴۰۰ء کے لگ بھگ یہ علاقہ غزنی کے چینیوں کے قبضہ میں تھا جنہیں بعد میں ایرانی حکمران نوشیرواں نے شکست دے کر اپنا باجگزار بنالیا۔

خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں مسلم سپہ سالار احنف بن قیسؓ نے خراسان کے کئی علاقے فتح کرلیے۔ عہد عثمانیؓ میں عبداللہ بن عامرؓ نے کابل فتح کرلیا، لیکن یہ تمام علاقے بالخصوص کابل ایک عرصہ تک مسلمان فاتحین کیلئے معمہ بنے رہے، کیونکہ یہاں کے جفاکش باشندے ہمیشہ بغاوت کردیتے۔ چنانچہ ۴۴ھ (۶۶۴ء) میں حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہؓ نے کابل کو از سرنو فتح کیا۔ ۴۷ھ میں

یہاں کے والی ربیع الحارثی نے پہلی مرتبہ اس علاقے میں اسلامی قوانین نافذ کیے۔

۹۷ھ (۶۹۴ء) میں قتیبہ بن مسلمؒ خراسان کے والی مقرر ہوئے تو انہوں نے شمالی افغانستان کے تمام باغی عناصر کو کچل ڈالا۔ اس کے بعد ۲۰۷ھ (۸۳۲ء) تک یہ علاقے بنو امیہ اور ان کے بعد بنو عباسؓ کے زیر قبضہ رہے۔ چنانچہ اس عرصے میں اس پورے خطے پر اسلامی تہذیب کی گہری چھاپ لگ چکی تھی اور دینِ اسلام نے یہاں کے تمام باطل مذاہب کی جڑ کاٹ کر رکھدی تھی۔

۲۰۷ھ (۸۳۲ء) میں بنو عباسؓ کے مقرر کردہ امیر خراسان طاہر بن حسین نے بغاوت کر کے شمالی افغانستان میں اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔

۲۰۹ھ (۸۳۳ء) میں یعقوب خارجی نے اس آل طاہر کی حکومت کا خاتمہ کر کے کابل سمیت موجودہ افغانستان کے تمام علاقوں پر قبضہ کر کے اس سرزمین پر پہلی مرتبہ واحد حکومت قائم کی۔

۲۸۷ھ (۹۰۰ء) میں اسماعیل بن احمد بن سامان نے تخار، مرو اور ہرات اور اس کے بعد مغربی افغانستان کا علاقہ فتح کرلیا۔ اس کے بعد ۳۹۵ھ (۹۷۶ء) میں جبکہ ابھی افغانستان کے بیشتر علاقے سامانیوں کے قبضے میں تھے۔ غزنی پر سبکتگین لودھی نے اپنی حکومت قائم کرلی۔ اسی کے بیٹے سلطان محمود غزنوی نے شمالی افغانستان کو فتح کر کے بلخ (مزار شریف) کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ ۵۵۲ھ (۱۱۵۷ء) تک موجودہ افغانستان کا تمام علاقہ سلطنت غزنوی میں شامل رہا۔ (اگر چہ بعض علاقوں پر مختلف حکمران غزنویوں کے باجگزار بن کر حکومت کرتے رہے)

۴۵۵ھ (۱۰۶۳ء) تک طغرل بیگ سلجوقی نے غزنویوں سے بلخ (مزار شریف) اور تخار سمیت کئی علاقے چھین لیے۔ اس کی اولاد آل سلجوق یا سلاجقہ کہلائی۔

۶۱۳ھ (۱۲۱۵ء) تک یہاں آل خوارزم شاہ حکمرانی کرتے رہے لیکن اس دوران غور کے علاقے کے غوری حکمرانوں سے برابر ان کی کشمکش چلتی رہی۔

۶۱۶ھ (۱۲۲۰ء) میں تاتاری حملہ آور چنگیز خان نے خوارزم شاہ کو شکست دیکر اسلامی مملکت کو تاخت و تاراج کرنا شروع کیا۔

۶۲۴ھ (۱۲۲۷ء) میں چنگیز خان کی ہلاکت کے بعد افغانستان پر اس کا بیٹا طولی خان حکمران ہوا۔ ۶۴۳ھ (۱۲۴۵ء) میں چنگیز خان کے پوتے ہلاکو خان نے اپنے دادا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اسلامی اقدار کو ملیا میٹ کیا اور تاتاری قوانین نافذ کیے۔

۶۴۵ھ (۱۲۴۷ء) میں تاتاریوں کی طرف سے ملک شمس الدین سندھ سے خراسان تک کا حاکم مقرر ہوا جس کا خاندان آل کرت کے نام سے مشہور ہوا۔

۷۸۷ھ (۱۳۴۷ء) میں امیر تیمور لنگ نے اس حکومت کا خاتمہ کر کے کابل، غزنی اور قندھار سمیت افغانستان کے تمام علاقوں پر اپنی حکومت کی بنیاد رکھی۔ جو اس کے خاندان میں ۹۱۱ھ (۱۵۰۶ء) تک چلتی رہی۔

۹۱۰ھ (۱۵۰۴ء) میں کابل پر شہنشاہ بابر نے قبضہ کر لیا۔

۹۵۲ھ (۱۵۰۴ء) میں ہمایوں نے قندھار فتح کیا اور اگلے ہی برس کابل بھی اس کے قبضے میں آ گیا۔

۱۰۳۱ھ (۱۶۲۰ء) میں شاہ عباس صفوی نے قندہار فتح کر لیا لیکن صرف سولہ سال بعد ۱۰۴۷ھ (۱۶۳۷ء) میں شاہ جہان نے صفویوں سے قندھار واپس لے لیا۔

۱۱۵۱ھ (۱۷۳۵ء) میں ایران کے بادشاہ نے تیموری سلطنت کا خاتمہ کرنے کے بعد ہرات اور اس کے بعد قندہار اور کابل پر بھی قبضہ کر لیا۔

۱۱۶۳ھ (۱۷۴۷ء) کے بعد احمد شاہ ابدالی افغانستان کے بلا شرکت غیرے حکمران بن گئے۔ احمد شاہ ابدالی کا خاندان تاریخ میں ''درانی'' کے لقب سے مشہور ہے۔ اس خاندان کا تعلق ''سدوزئی'' قبیلہ سے تھا۔ احمد شاہ ابدالی کے پوتے زمان شاہ کے بعد زمام سلطنت سدوزئی قبیلے کے ہاتھوں سے نکل کر بارک زئی خاندان کے دوست محمد نامی شخص کے ہاتھوں میں چلی گئی۔

۱۲۵۴ھ (۱۸۳۲ء) میں ہندوستان پر قابض انگریزوں نے افغانستان کی طرف پیش قدمی شروع کی اور درہ بولان کے راستے سے حملہ آور ہو کر قندہار فتح کر کے شاہ شجاع کو حکمران بنا دیا جبکہ امیر دوست محمد خان نے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔

لیکن افغانستان کے غیور مسلمانوں نے انگریزی اقتدار رد کرتے ہوئے محمد اکبر خان کی قیادت میں جہاد کا آغاز کر دیا۔ جس کے نتیجے میں حملہ آور انگریز فوج کا مکمل صفایا ہو گیا۔ صرف ایک شخص ڈاکٹر برائڈن اپنی قوم کو افغانوں کی شجاعت اور سرفروشی کی داستان سنانے کیلئے زندہ واپس پہنچا۔

لیکن ۱۸۴۲ء میں انگریز کابل پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس مرتبہ انہوں نے خود ہی امیر دوست محمد خان کو جو اب ان کا وفادار بن چکا تھا کابل کا حکمران بنا دیا۔

۱۸۷۸ء سے ۱۸۸۰ء تک ایک مرتبہ پھر افغانوں اور انگریزوں کے درمیان جنگوں کا سلسلہ چلتا رہا

کیونکہ دوست محمد کے بیٹے شیر علی نے روس سے دوستی کر کے انگریزوں سے دشمنی مول لے لی۔ان جنگوں کے نتیجے میں کابل پھر سے انگریزوں کے قبضہ میں چلا گیا۔جنہوں نے اس مرتبہ عبدالرحمٰن کو حکمران بنایا۔ کچھ عرصہ کے بعد انگریزی فوجوں نے قندھار بھی فتح کر کے عبدالرحمٰن کے حوالے کیا اور خود واپس ہندوستان لوٹ گئے۔

۱۹۱۹ء میں عبدالرحمٰن کا بیٹا امیر امان اللہ خان تخت نشین ہوا اور انگریزوں سے اپنے مقبوضہ علاقے واپس لینے کیلئے جنگ شروع کر دی۔اس طرح افغانوں اور انگریزوں کے درمیان ایک طویل جنگ کا سلسلہ چل نکلا جس کا نتیجہ ٹل (ضلع کوہاٹ) کے مقام پر افغان سپہ سالار نادر شاہ کے ہاتھوں انگریزوں کی شرمناک شکست کی صورت میں نکلا۔اس کے بعد انگریزوں نے اندرونی سازشوں کے ذریعہ امان اللہ خان کے خلاف فضاء بنانی شروع کی اور بالآخر وہ ۱۹۲۹ء میں ایک تاجک سردار حبیب اللہ بچہ سقہ کو کابل پر قبضہ دلانے میں کامیاب ہو گئے۔جس نے انگریزوں کی مدد سے بغاوت کر کے امان اللہ خان کا تختہ الٹا اور اسے اٹلی کی طرف فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔بچہ سقہ کی حکومت اگرچہ صرف نو ماہ تک رہی لیکن یہ عرصہ تاریخ افغانستان کا سیاہ ترین دور تھا۔انگریزوں نے جب بچہ سقہ کی ناکامی دیکھی تو فرانس میں متعین افغان سفیر نادر شاہ کو بلایا گیا جس نے اکتوبر ۱۹۲۹ء میں کابل پر قبضہ کر لیا۔

لیکن نومبر ۱۹۳۸ء میں نادر شاہ بھی ایک طالب علم کی گولی کا نشانہ بن کر قتل ہو گیا۔نادر شاہ کے قتل کے بعد اس کے بھائیوں نے اس کے کم عمر بیٹے ظاہر شاہ کو بادشاہت سونپ دی۔

سرزمین افغانستان کے ساتھ روس کی دلچسپی بہت پرانی ہے۔گزشتہ چار صدیوں سے ماسکو کے حکمران کابل پر حکمرانی کے خواب دیکھتے آئے تھے،لیکن روس کو مکمل طور پر افغانستان میں اثر ورسوخ حاصل کرنے کا موقع ظاہر شاہ کے دور میں ملا،جب ظاہر شاہ نے وزارت عظمٰی کی ذمہ داریاں اپنے قریبی عزیز سردار داؤد کو سونپ دیں۔

اس شخص نے برسر اقتدار آتے ہی روس سے اس قدر تعلقات بڑھائے کہ روس کو اس سرزمین میں مکمل طور پر نفوذ کا موقع مل گیا۔سردار داؤد نے اپنے پاس روسی مشیر بلوائے اور افغان فوجی اور سول افسروں کو تربیت کیلئے ماسکو بھیجا۔دوسری طرف اس نے اپنے قریبی ہمسایہ ملک پاکستان سے بھی دشمنی کے بیج بو کر اپنے آقا روس اور بھارت کو خوش کیا۔سردار داؤد کی روز بروز بڑھتی ہوئی طاقت سے عیاشیوں میں مست ظاہر شاہ کو خطرہ محسوس ہوا تو اس نے اسے برطرف کر دیا۔لیکن اب پانی سر سے گزر چکا تھا۔

سردار داؤد روس کی مدد سے حکومت افغان میں اس قدر اثر انداز ہو چکا تھا کہ اس نے برطرفی کے کچھ ہی عرصہ بعد جولائی ۱۹۷۳ء میں ظاہر شاہ کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قبضہ کر لیا اور بادشاہت کے خاتمے کا اعلان کر کے خود ہی صدر اور وزیر اعظم بن بیٹھا۔ داؤد کا زمانہ مسلمانان افغانستان کیلئے بہت تاریک ثابت ہوا۔ اقتدار میں آنے کے کچھ ہی عرصے بعد اس نے بہت سے با اثر اور اسلام دوست راہنماؤں پر پاکستان اور امریکہ دوستی کا الزام لگا کر جیل بھیج دیا اور بہت سے لوگوں کو گولی مار کر شہید کر دیا۔ مسلمان نوجوانوں پر طرح طرح کے ظلم وستم ڈھا کر انہیں جبر واستبداد کا نشانہ بنایا جس سے افغانستان کے بیشتر مسلمان راہنما ہجرت کر کے چلے گئے۔ داؤد نے اپنے بیرونی آقاؤں کو خوش کرنے کیلئے شاہی جھنڈا تبدیل کیا، قومی نشان بدل ڈالا اور کرنسی تبدیل کر دی۔ وہ افغانستان کے راسخ العقیدہ مسلمانوں کے دلوں سے اسلام کی عظمت بھی ختم کرنا چاہتا تھا لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ روسیوں کی منزل نہیں، چنانچہ اب اس نے روسیوں کے جال سے نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیئے، لیکن اب افغانستان مکمل طور پر روسی ایجنسیوں کے قبضے میں تھا۔

۲۷ اپریل ۱۹۷۸ء کی صبح ۹ بجے کے قریب پل چرخی کی فوجی چھاؤنی سے فوج کا دیوہیکل ٹینکوں پر مشتمل ایک دستہ ایوان صدر کی طرف بڑھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے صدارت اور وزارت عظمی کے عہدے نور محمد ترہ کئی کی طرف منتقل ہو گئے۔ سردار داؤد اپنے کئی رشتہ داروں سمیت اس بغاوت میں مارا گیا۔

۲۷ اپریل ۱۹۷۸ء کی شام ترہ کئی ایوان صدر میں پہنچا تو روسیوں کی دیرینہ خواہش پوری ہو گئی، اس خونی سازش کو ''سرخ انقلاب'' سے تعبیر کیا گیا۔ ترہ کئی نے افغانستان کا نام ''ڈیموکریٹک دی ری پبلک آف افغانستان'' رکھا لیکن اقتدار میں آنے کے بعد اسے ایک دن بھی سکون نصیب نہ ہوا۔ کیونکہ ملک بھر کے عوام میں ترہ کئی کی اسلام دشمن پالیسیوں سے بے چینی کی لہر دوڑ گئی تھی جس کے نتیجے میں بہت سے مقامات پر غیرتمند افغانوں نے علماء کی قیادت میں روس نواز حکومت کیخلاف بغاوت کر دی۔ روس نواز ترہ کئی کو اپنی فوج میں بھی کئی مرتبہ بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ جنہیں اگرچہ اس نے طاقت کے بل بوتے پر دبا دیا لیکن جگہ جگہ شروع ہونے والے جہاد نے اس کی حکومت کو بالکل کمزور بنا کر رکھ دیا۔ ترہ کئی کے پاس ان مجاہدین کا کوئی علاج نہ تھا۔ بالآخر اس کا اقتدار بھی اختتام کو پہنچا۔ ۱۹۷۹ء میں جب ترہ کئی کیوبا کی ایک کانفرنس سے واپس آ رہا تھا تو حفیظ اللہ امین نے اسے گرفتار کر کے صداراتی محل میں نظر بند کر دیا اور خود

اقتدار پر قبضہ کر بیٹھا۔ (اس کے بعد تره کئی کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ کس حالت میں ہے؟ البتہ کچھ عرصہ بعد امین کی انتظامیہ کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ نور محمد تره کئی مر گئے ہیں اور انہیں ان کے آبائی گاؤں میں دفن کر دیا گیا ہے)

حفیظ اللہ امین نے اپنے پیش رو کی پالیسیوں کو ترک نہیں کیا۔ بلکہ بے گناہ لوگوں پر ظلم وستم کے شکنجے اور سخت کر دیئے۔ بستیاں بمباری سے تباہ ہوتی رہیں جیل خانے قیدیوں سے بھرتے رہے، عقوبت خانوں اور قتل گاہوں میں مظلوموں کی آہیں اور کراہیں گونجتی رہیں، ملک بھر میں سرکاری ادارے روسی دوستی کے راگ الاپتے رہے، ادھر روسی فوجی مشیروں کے اختیارات بڑھتے رہے، ادھر مجاہدین کے گوریلا دستے بپھرتے ہوئے طوفان میں ڈھلتے رہے۔

جوں جوں امین نے جبر واستبداد کی آگ تیز کی فوج کے چھوٹے چھوٹے یونٹ بھی بغاوت کر کے مجاہدین سے ملنے لگے۔ مجاہدین کی قوت نا قابل تسخیر ہوگئی تو روس کے اشارے پر امین کی انتظامیہ نے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کیے۔ سرکاری اہلکار اور روسی ایجنٹ دیہاتی بستیوں میں گھروں، اسکولوں اور مساجد کو آگ لگاتے اور پھر ڈھنڈورا پیٹتے کہ مجاہدین نے فلاں مسجد اور فلاں اسکول کو جلا دیا اور فلاں بستی کو لوٹ لیا ہے جو لوگ اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے ان کے دلوں میں مجاہدین کی محبت کم ہونے کے بجائے اور گہری ہوتی چلی گئی۔

بالآخر حفیظ اللہ امین کے اقتدار کی مدت بھی پوری ہوئی اور ماسکو کی عدالت سے اس کی حکومت کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی کا فیصلہ بھی صادر ہوگیا۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۷۹ء کی ایک یخ بستہ رات میں حفیظ اللہ امین کو اس کے محل میں انتہائی بے بسی کے عالم میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی ریڈیو تاشقند نے یہ خبر نشر کر دی کہ ببرک کارمل نے حفیظ اللہ امین کا تختہ الٹ کر افغانستان کا اقتدار سنبھال لیا ہے۔ حالانکہ ببرک کارمل اس وقت چیکوسلواکیہ میں مقیم تھا وہ اس واقعہ کے چھ روز بعد افغانستان پہنچا۔

۲۷ دسمبر ۱۹۷۹ء کی رات کابل شہر اچانک ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ سے لرزنے لگا۔ اس کے بعد توپوں نے گولے اگلنے شروع کیے جن کی آواز دور دور تک شدت سے سنائی دیتی رہی۔ ایک طرف دیوہیکل ٹرانسپورٹ طیارے ہزاروں روسی فوجیوں کو کابل ایئر پورٹ پر اتار رہے تھے تو دوسری طرف روسی سرحد سے ہزاروں ٹینک دریائے آمو عبور کر کے افغانستان کی سرزمین روند رہے تھے۔

امین کے قتل پر لوگ سکون کی نیند سوئے تھے لیکن جب صبح بیدار ہوئے تو انہوں نے شہر کی سڑکوں پر

روسی ٹینکوں کو گشت کرتے ہوئے دیکھا، روسی ساخت کے مگ طیارے اور ہیلی کاپٹر نیچی پرواز کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔ یہ نماظر دیکھ کر کابل کے شہری سکتے میں آ گئے۔ اسی روز دوپہر سے پہلے روسی فوج کو شہر سے باہر نکل کر اہم پوزیشنوں پر متعین کر دیا گیا کہ مبادا روسی فوجوں اور افغان عوام میں تصادم نہ ہو جائے جو اچانک گھس آنے والی اس اجنبی فوج سے طرح طرح کی نفرت کا اظہار کر رہے تھے۔

نیا روسی ایجنٹ (ببرک کارمل) ایک لاکھ سے زائد روسی فوج، سینکڑوں طیارے اور ہزاروں ٹینک لے کر کابل پہنچا۔ اس کی آمد افغانستان پر روسی قبضے کا رسمی اعلان تھی۔ چنانچہ کارمل کے دور میں کابل شہر ماسکو اور پیرس کا نظارہ پیش کرنے لگا۔

وہی کابل جہاں کوئی عورت بغیر پردے کے گھر سے باہر نہیں نکل سکتی تھی اب اس کی گلیوں بازاروں میں لڑکیاں اسکرٹ پہن کر نکلتی تھیں، شہر میں نائٹ کلب چلنے لگے، شراب کا دور دورہ ہو گیا۔ کمیونزم اپنی تمام تر خباثتوں کے ساتھ افغانستان کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ کابل شہر میں آوارگی پھیلانے والی یہ نوجوان نسل وہ تھی جس کی تعلیم و تربیت ماسکو کے بے راہ روی کے معاشرے میں ہوئی تھی۔

دوسری طرف شراب کے نشے میں مدہوش اور عیاشی کے نشے میں چور ببرک کارمل نے روسی آقاؤں کے اشارے پر افغانستان کے مسلمانوں پر وہ مظالم ڈھائے جنہوں نے سابقہ ''غلاموں'' کو بھی شرما دیا۔ اس نے علماء و مشائخ کو گرفتار کر کے جیل کی تاریک کوٹھڑیوں میں قید کیا۔ ایک ایک دن میں ہزاروں مسلمانوں کو شہید کیا، ایک ایک قبر میں چار چار ہزار مسلمانوں کو زیر زمین دفن کر دیا گیا، مساجد و مدارس کو بمباری سے تباہ کیا گیا۔ علماء کرام کو ٹینکوں تلے روند ڈالا، توپوں میں داغا گیا، قرآن پاک کو جلایا گیا، یہی نہیں بلکہ قرآن پاک کے مبارک اوراق سے استنجے کیے گئے، یہ دستور بنایا گیا کہ کمیونسٹ پارٹی کی رکنیت صرف اسی کو ملے گی جو جوتوں سمیت قرآن پاک پر کھڑا ہو کر مذہب اسلام سے مکمل برائت اور اشتراکیت کا دل و جان سے اقرار کرے۔

کہنے والوں نے کہا کہ اب تو افغانستان ہی نہیں پاکستان کی بھی خیر نہیں۔ روس کا جدید اسلحہ اور تازہ دم فوجیں چند ہی دنوں میں افغانستان عبور کر کے پاکستان میں داخل ہو جائیں گی۔ خود روسیوں کا اندازہ بھی یہی تھا کہ افغانستان کو چند روز میں عبور کر لیا جائے گا۔ کیونکہ اس قوم نے گزشتہ ایک صدی سے شکست کا منہ بھی نہ دیکھا تھا۔

لیکن اچانک اقوام عالم نے ایک عجیب نظارہ دیکھا...... لمبی لمبی پگڑیاں باندھے، چہروں پر

ڈاڑھیاں سجائے کچھ خدا مست لوگ ہاتھوں میں پتھر، ڈنڈے، پرانے خنجر، فرسودہ تلواریں اور ناکارہ بندوقیں لیے میدان میں نکلے اور سینے تان کر روسی ٹینکوں کے سامنے کھڑے ہو گئے اور پھر دنیا والوں نے دیکھا کہ افغان مجاہدین خالی ہاتھ ٹینک پر چڑھتے ہیں اور اس کے شیشے پر گارا لگا کر ٹینک میں داخل ہوتے ہیں اور اس میں دبکے ہوئے روسی فوجیوں کو چوہے کی طرح نکال کر ٹینک پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ اسلحہ نہ ہو تو پتھروں سے مقابلہ کرتے ہیں۔ عورتیں بھی اسلحہ لیکر میدان میں نکل آتی ہیں۔ ایک نو سالہ بچی کئی گھنٹے دشمن کے ایک لشکر کو روکے رکھتی ہے اور درجنوں فوجیوں کو ہلاک کر کے خود جام شہادت نوش کر لیتی ہے۔

یہ افغانستان کی غیرت مند قوم تھی جس نے اسلام کے خلاف کسی بھی نظام کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان مجاہدین اسلام کی کارروائیوں کا آغاز اگرچہ انقلاب ثور کے فوراً بعد ہی ہو گیا تھا جنہیں افغانستان کے کمیونسٹ حکمران تمام تر کوششوں کے باوجود دبانے میں ناکام رہے تھے لیکن روسی افواج کے افغانستان میں داخلے نے ان کے جذبہ جہاد کو اور مہمیز دی تھی۔

بس یہیں سے ایثار و وفا جہاد و قربانی کی اس داستان کا آغاز ہوتا ہے جس کی انتہاء پر سوویت یونین ختم ہو گیا، کمیونزم ذلیل و رسوا ہو کر دفن ہو گیا، دنیا کا نقشہ بدل گیا، نو مسلم ممالک آزاد ہو گئے، دیوار برلن گر گئی، مشرقی و مغربی یورپ ایک ہو گیا، کشمیر کا جہاد شروع ہوا، دنیا بھر میں اسلامی تحریکوں میں نئی روح پیدا ہو گئی، مسلمانوں نے راہ عزت ''جہاد'' سے آشنائی حاصل کی اور دنیائے کفر افغانستان کے کوہساروں سے اٹھ آنے والے اس نئے طوفان سے لرزہ براندام ہو گئی۔

روس دس سال تک افغانستان میں اس لیے جنگ کرتا رہا کہ وہ افغانستان کو ختم کر کے آگے بڑھ سکے لیکن جب اس راہگزر ہی میں افغانستان کے مجاہدین نے اس کی کمر توڑ دی تو اسے اپنا وجود بھی خطرے میں نظر آنے لگا اور پھر جب ۱۴ فروری ۱۹۸۹ء کو روسی شکست خوردہ فوج کا آخری قافلہ دریائے آمو پار کر رہا تھا تو دنیا کے کتنے ہی ٹیلی ویژنوں نے یہ عبرتناک نظارہ دکھا کر افغان مجاہدین کا دنیا سے لوہا منوایا:

غبار رہگزر ہیں، کیمیا پر ناز تھا جن کو
جبینِ خاک رکھتے تھے جو، اکسیر گر نکلے

روس نے ۱۹۸۹ء ہی میں اپنی فوجیں افغانستان سے نکال لی تھیں لیکن کابل میں اب بھی ببرک کارمل اور روسیوں کا مشترکہ وارث جنرل نجیب روس کے فراہم کردہ جدید ترین اسلحہ کے ذخائر کے ساتھ موجود تھا۔ چنانچہ روس کے نکلنے کے بعد مجاہدین کا ٹکراؤ براہ راست افغان کمیونسٹ حکومت سے ہوا اور

پھر تین سال تک جنرل نجیب کی کمیونسٹ افواج سے جہاد کے بعد بالآخر مجاہدین نے نجیب کو حکومت سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا۔

۲۳ اپریل ۱۹۹۲ء کا دن اس لحاظ سے تاریخ اسلام کا ایک یادگار دن ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی مدد ونصرت سے سولہ لاکھ شہداء کی قربانیاں پیش کر کے مجاہدین افغانستان سرخرو ہو کر کابل میں فاتحانہ انداز میں داخل ہوئے۔ اس موقع پر نہ صرف مسلمانان افغانستان میں بلکہ پوری امت مسلمہ میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ پوری دنیا کے مسلمانوں کے سر فخر سے بلند ہو گئے۔ فلسطین، کشمیر، برما، بوسنیا، چیچنیا، صومالیہ اور دیگر مظلوم ممالک کے مسلمان اپنی تکلیفوں اور زخموں کی کسک بھول گئے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ آج جس طرح افغان مجاہدین نے جہاد کے ثمرات کو حاصل کیا ہے کل ہماری جدوجہد بھی اسی طرح رنگ لائے گی۔ چنانچہ امام الحرمین عبدالرحمٰن السدیس کے یہ الفاظ آج بھی مسلمانوں کے کانوں میں گونج رہے ہیں کہ:

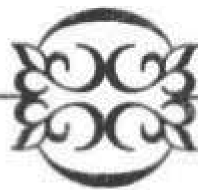
"الحمدللہ! اللہ تعالیٰ نے اس سال افغانستان کی شکل میں مسلمانوں کو تحفہ عطا فرمایا ہے، اگلے سال بیت المقدس کی فتح کی شکل میں مسلمانوں کو فلسطین کی آزادی کا تحفہ ملے گا۔"

غرضیکہ دنیا بھر میں مظلوم مسلمانوں کی نظریں اب مجاہدین افغانستان پر لگی ہوئی تھیں کہ وہ ایک پائیدار اسلامی حکومت قائم کر کے مسلمانان عالم کی مدد ونصرت کیلئے کمربستہ ہوں گے، بالکل اسی طرح جیسا کہ جہاد افغانستان کے دوران بیرونی دنیا کے مسلمانوں نے اپنے افغان بھائیوں کی مدد کی تھی۔

لیکن امت مسلمہ کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ اس کی آرزوئیں اس وقت خاک میں مل گئیں جب وہ مجاہدین جنہوں نے چودہ سال تک دشمنوں سے جہاد کیا تھا، اقتدار کی رسہ کشی میں ایک دوسرے کے دست بگریبان ہو گئے۔ افسوس کہ انہوں نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ ان کا دشمن میدان میں شکست کھانے کے بعد اب چھپ کر سازشوں کے ذریعے ان پر وار کر رہا ہے۔ چنانچہ وہ لوگ جو کچھ عرصہ پہلے تک روسی اور نجیب حکومت کی "کمیونسٹ فوجوں" کے خلاف متحد ہو کر جہاد کر رہے تھے آج صرف اقتدار حاصل کرنے کیلئے دوستم جیسے کمیونسٹ سے اتحاد کر کے ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہو رہے تھے۔

قومی راہنماؤں کے درمیان اس کشمکش نے افغانستان میں طوائف الملوکی کو جنم دیا، جس سے ہر

طرف بدامنی، قتل وغارت گری پھیل گئی، اور پھر انہی نام نہاد مجاہدین کے ہاتھوں سرزمین افغانستان پر ایسے ایسے جرائم کا ارتکاب ہوا جنہیں بیان کرنے کی زبان وقلم تاب نہیں رکھتے اور نہ ان کا احاطہ کیا جاسکتا ہے۔ جگہ جگہ عوامی راستوں پر پھاٹک لگا کر غریب عوام سے ظالمانہ ٹیکس وصول کیا جاتا، عورتوں کو اغواء کر کے انہیں ان کے گوہر عفت سے محروم کیا جاتا، ذرا ذرا سی دشمنی پر ایک دوسرے کو قتل کر دیا جاتا، لیکن کوئی پوچھنے والا نہ ہوتا۔ مگر یہ سب کچھ ان لیڈروں کو کیسے نظر آسکتا تھا جن کی باہمی جنگوں سے کابل اور اس کا گرد ونواح جل کر راکھ ہو چکے تھے۔ ملت افغان کے سفینے کے یہ ناخدا بیرونی طاقتوں کے اشاروں پر کھیلتے ہوئے اپنی بچی کھچی قوم کو خود ہی تباہ وبرباد کر رہے تھے۔



۳

طالبان سے پہلے

اپنے سب سے بڑے پشت پناہ روس کی طرف سے مایوس کن رویّہ دیکھ کر ۱۸ر مارچ ۱۹۹۲ء کو دل برداشتہ جنرل نجیب نے یو این نمائندے بینن سیوان سے کئی دن کے مذاکرات کے بعد مجوزہ عبوری حکومت کیلئے جگہ خالی کرنے کا اعلان کر دیا۔

اس وقت مزار شریف میں جنرل عبدالرشید دوستم اسماعیلی ملیشیا کو ساتھ ملا کر اپنی وفاداریاں بدل چکے تھے۔ ایک نگران فوجی کونسل بنانے کے بعد جنرل دوستم نے مزار شریف کا کنٹرول احمد شاہ مسعود کے سپرد کر دیا۔ دوستم کے ایماء پر اس مخلوط کونسل کو قومی اسلامی تحریک (جنبش ملی اسلامی) کا نام دیدیا گیا۔

ماضی میں دوستم کی جوز جان ملیشیا روسی ہتھیاروں کے سہارے افغان مجاہدین کے ساتھ لڑتی بھڑتی آئی تھی۔ اس ملیشیا نے جو اپنی خون خواری میں مشہور تھی ۱۹۸۸ء میں مجاہدین کے مقابلے میں جلال آباد کا دفاع کیا تھا۔ خوست اور گردیز کی لڑائیوں میں بھی اس ملیشیا نے اہم کردار ادا کیا۔ سید جعفر نادری کی اسماعیلی ملیشیا جس نے مزار شریف پر کنٹرول کیلئے دوستم کے ساتھ مل کر کارروائی کی۔ اس کے علاوہ ایران کی مدد سے قائم شیعوں کی دو بڑی تنظیموں حرکت اسلامی اور حزب وحدت نے مزار شریف پر قبضے کیلئے دوستم کا ساتھ دیا۔ ہرات اور ہزارہ جات میں ایران کے غالب اثرات پہلے سے موجود تھے۔ یہاں کی شیعہ ملیشیائیں ایران سے برابر ہتھیار لیتی آئی تھیں۔ مزار شریف پر ازبک کنٹرول کے بعد ایران کا دائرۂ اثر پورے شمال مغربی افغانستان تک پھیل گیا۔ اس لحاظ سے ایران وسط ایشیا کی سرحدوں تک ایک نئے راستے سے نفوذ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

۹/اپریل ۱۹۹۲ء کو نجیب نے غیر متوقع بیان دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ عبوری حکومت کی تشکیل کا انتظار کیے بغیر اپریل کے آخر میں اقتدار چھوڑ دے گا۔ ۱۰/اپریل کو یو این سیکریٹری جنرل مسٹر بطروس غالی نے جنیوا میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔ یو این سیکریٹری جنرل نے اعلان کیا کہ مسئلہ افغانستان کے تمام فریق کابل میں ایک عبوری حکومت کے قیام پر متفق ہو چکے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ عبوری حکومت ۱۵ ارکنی کونسل پر مشتمل ہوگی۔ مجوزہ پروگرام کے مطابق یہ کونسل ایک لویہ جرگہ بلانے کے بعد بننی تھی۔ امریکہ، ایران اور پاکستان نے یو این منصوبہ کی حمایت کی۔

۱۳/اپریل کو نجیب نے کابل میں ایک میٹنگ کی صدارت کی۔ یہ ایک الوداعی میٹنگ تھی۔ حالت یہ تھی کہ اس وقت کابل کے نواح میں فوجی جھڑپیں جاری تھیں۔ سرکاری فوجوں کا مورال پست ہو چکا تھا۔ ۱۴/اپریل کو حزب اسلامی حکمتیار نے کابل سے ۳۷ میل دور واقع صوبہ پروان کے دارالحکومت چاریکار پر قبضہ کرلیا۔ بگرام ایئربیس بھی اسی دن مجاہدین کے ہاتھ لگی۔ مجاہدین کے مختلف گروپوں نے پیش قدمی کر کے کابل کے اردگرد گھیرا تنگ کرلیا۔

۱۶/اپریل کو افغان حکومت کے وزیر خارجہ عبدالوکیل نے نجیب اللہ کو صدارت سے ہٹائے جانے کا اعلان کیا۔ بیرون ملک فرار کی کوشش میں ناکامی کے بعد نجیب نے اقوام متحدہ کے مقامی دفتر میں پناہ لے لی۔ اس کے ساتھ ہی افغان مجاہدین نے جو مختلف تنظیموں سے تعلق رکھتے تھے کابل کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔

نجیب کے رخصت ہونے کے بعد کابل کا اقتدار وطن پارٹی کے چار نائب صدور کو منتقل کر دیا گیا تھا جو کہ فوجی جنرل تھے۔ یہ چاروں کمیونسٹ جنرل بعد میں افغان کمانڈر احمد شاہ مسعود سے مل گئے۔ دوسرے مجاہدین کی پیش قدمی کو روکنے کیلئے کابل ایئرپورٹ پر جنرل مومن، جنرل دلاور اور جنرل نبی عظیمی نے قبضہ کرلیا۔ بعد میں اسے ازبک ملیشیا کے سپرد کر دیا گیا۔

۱۸/اپریل ۱۹۹۲ء کو ریڈیو کابل نے نائب صدر عبدالرحیم ہاتف کے عبوری صدر بنائے جانے کا اعلان کیا۔ وہ برائے نام صدر تھے۔ ان کا حالات پر کوئی کنٹرول نہیں تھا۔ یو این فارمولا جسے یکطرفہ طور پر آگے بڑھانے کی کوشش کی گئی اس وقت تک اپنی موت آپ مر چکا تھا۔ مختلف افغان گوریلا گروپ دارالحکومت کابل پر قبضہ کیلئے منصوبہ تیار کر رہے تھے۔

۱۸/اپریل کو وزیر خارجہ عبدالوکیل نے اعلان کیا کہ احمد شاہ مسعود کے ساتھ ان کا ایک باہمی سمجھوتہ

طے پا چکا ہے اور فریقین قیام امن کیلئے آئندہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں گے۔ یہ کابل پر قبضے کیلئے پہلا باقاعدہ ''تاجک'' اتحاد تھا۔ احمد شاہ مسعود کے گوریلوں، فوجی جرنلوں اور دوسرے رہنماؤں کے اس اتحاد کو اسلامی جہاد کونسل کا نام دیا گیا۔

گلبدین حکمتیار نے پاکستان میں متعین سات مجاہدین تنظیموں میں سے ۶ مجاہد تنظیموں کے کمانڈروں پر مشتمل ایک ۳۸ رکنی انقلابی کونسل بنائی۔ اس میں احمد شاہ مسعود کا نام شامل نہ تھا۔ اس کونسل کو بھی کابل کا کنٹرول سنبھالنا تھا۔ اس وقت حزب اسلامی افغانستان کے مسلح دستے کابل کے جنوبی نواح میں موجود تھے۔

پاکستان نے افغانستان میں نسلی بنیاد پر اٹھنے والے خون خرابے کے خطرہ کو فوری طور پر محسوس کیا۔ پاکستان کے وزیر اعظم محمد نواز شریف ۱۸/ اپریل کو پشاور آئے جہاں انہوں نے افغان مجاہدین کے رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں۔ ان ملاقاتوں کا بظاہر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ مگر اختلافات کے باوجود وزیر اعظم پاکستان کے ایماء پر مجاہدین کے باہمی مذاکرات جاری رہے۔ ۲۴/ اپریل ۱۹۹۲ء کو پشاور میں ۱۰ افغان مجاہدین تنظیموں میں ایک ۵۱ رکنی عبوری کونسل کے قیام پر اتفاق رائے ہو گیا۔ اس کا اعلان اتحاد اسلامی کے رہنما عبدالرب رسول سیاف نے ایک پریس کانفرنس میں کیا۔ مذاکرات میں حزب اسلامی حکمتیار کا ایک نمائندہ شامل تھا۔ اسی دن اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل مسٹر بطروس غالی اسلام آباد پہنچے۔ حزب اسلامی نے بعد میں ایک اعلامیہ کے ذریعے معاہدہ پشاور کو بعض شرائط کے ساتھ تسلیم کر لیا۔ معاہدہ پشاور کے اہم نکات یہ تھے:

☆ ایک ۵۱ رکنی عبوری کونسل تشکیل دی جائے گی۔ اس کے صدر صبغت اللہ مجددی ہوں گے۔ ان کی میعاد عہدہ دو ماہ ہوگی۔

☆ دو ماہ بعد ایک شورائے قیادی (لیڈر شپ کونسل) بنے گی۔ اس کے سربراہ جمعیت اسلامی کے رہنما برہان الدین ربانی ہوں گے۔ ان کی حکومت کی میعاد چار ماہ ہوگی۔

☆ وزیر اعظم حزب اسلامی گلبدین حکمت یار گروپ میں سے لیا جائے گا۔

☆ جمعیت اسلامی کے کمانڈر احمد شاہ مسعود وزیر دفاع ہوں گے۔

☆ وزیر داخلہ سیاف گروپ سے وزیر تعلیم یونس خالص کی جماعت سے اور وزیر خارجہ سید احمد گیلانی گروپ سے لیا جائے گا۔

☆ انتقال اقتدار سے لے کر عبوری حکومت کے قیام تک کا سارا عمل چھ ماہ کیلئے ہوگا۔ اس کے بعد ایک اسلامی کونسل مستقبل کی عبوری حکومت کا فیصلہ کرے گی۔

☆ اٹھارہ ماہ کے اندر ایک منتخب پارلیمنٹ افغانستان کی مستقل حکومت تشکیل دے گی۔

جمعیت اسلامی کے گوریلا کمانڈر احمد شاہ مسعود جسے عبدالرشید دوستم، سید جعفر نادری اور جنرل عبدالمؤمن کی حمایت حاصل تھی اسلامی جہاد اتحاد کے نام سے کابل کے شمال میں جبل السراج میں موجود تھے۔ ۱۸/اپریل ۱۹۹۲ء کو انہوں نے بیرونی صحافیوں کو بتایا کہ وہ جلد ہی کابل میں مجاہدین کی حکومت قائم کریں گے۔ ادھر گلبدین حکمت یار نے کابل کے حکمران فوجی افسروں کو وارننگ دی کہ وہ ۲۶/اپریل تک غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیں۔

۲۰/اپریل تک اسلامی جہاد اتحاد اور حزب اسلامی افغانستان کے گوریلوں کے درمیان کابل پر کنٹرول کیلئے لڑائی چھڑ چکی تھی۔ اسی دوران افغان وزیر خارجہ عبدالوکیل نے احمد شاہ مسعود کے ساتھ بات چیت کی۔

۲۲/اپریل کو گلبدین حکمت یار نے احمد شاہ مسعود کے گوریلوں اور ان کے ساتھ تعاون کرنے والی جماعتوں کو ۲۴/اپریل تک کابل کی حفاظتی پٹی سے نکل جانے کا الٹی میٹم دیا۔ اس الٹی میٹم کو مسترد کر دیا گیا۔ اگلے روز احمد شاہ مسعود کے سینکڑوں غیر مسلح گوریلے کابل کی گلیوں میں داخل ہو گئے جبکہ حزب وحدت نے جو کہ ہزارہ کے شیعہ مسلک گوریلوں پر مشتمل تھی، کابل کے مغربی حصے پر قبضہ کر لیا۔ اسی دن اقوام متحدہ کے نمائندہ خاص مسٹر بینن سیوان نے چاریکار میں احمد شاہ مسعود سے ملاقات کی۔

۲۵/اپریل کو الٹی میٹم کی مدت ختم ہوتے ہی حزب اسلامی افغانستان (حکمت یار) کے گوریلے سرعت سے کابل کی طرف بڑھے۔ انہوں نے شہر کے اہم حصوں کا کنٹرول سنبھال لیا۔ ان میں وزارت دفاع اور وزارت داخلہ کی عمارتیں شامل تھیں۔ جبکہ صدارتی محل، ریڈیو ٹیلی ویژن اسٹیشنوں، کابل ایئرپورٹ اور دوسری کئی حساس تنصیبات پر احمد شاہ مسعود، جنرل دوستم اور جنرل مومن کے فوجیوں کا قبضہ برقرار رہا۔

اس سے اگلی شب حزب اسلامی اور جمعیت اسلامی کے گوریلوں میں کابل پر مکمل قبضے کیلئے شدید جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ زبردست فضائی حملوں اور بھاری توپ خانے کی گولہ باری کے نتیجے میں حزب اسلامی کے گوریلے کابل کی پوزیشنوں سے پیچھے ہٹ گئے۔ تاہم دو دن بعد فریقین میں عارضی جنگ

بندی عمل میں آ گئی۔

۲۸ راپریل کو صبغت اللہ مجددی نے کابل پہنچ کر عبوری صدارت کا عہدہ سنبھال لیا۔ پاکستان نے اسی دن نئی حکومت کو تسلیم کرلیا۔ اس سے اگلے دن محمد نواز شریف وزیراعظم پاکستان ایک سرکاری وفد لے کر کابل آئے۔ اس دورے کی دعوت صبغت اللہ مجددی نے دی تھی۔

۲۹ راپریل ۱۹۹۲ء کو عبوری کونسل کے نامزد وزیر دفاع احمد شاہ مسعود جنہیں جنرل کا عہدہ مل چکا تھا ۱۴ برس کی خانہ جنگی کے خاتمہ پر کابل پہنچے۔ وہ ۱۰۰ ٹینکوں اور ۵۰۰۰ گوریلوں کے ہمراہ شہر میں داخل ہوئے۔ دوسرے دن انہوں نے اخبار نویسوں سے ملاقات کے بعد کہا کہ وہ عبوری حکومت کے ''باغیوں'' اور ''تخریب پسندوں'' کی سرگرمیوں کو کچل دیں گے۔ لیکن جنرل دوستم کی ملیشیا نے کابل کے شہریوں سے جو سلوک کیا وہ اس کا مداوانہ کر سکے۔ ایک خبر رساں ایجنسی کی اطلاع کے مطابق کابل کے جنوبی علاقے پر کنٹرول کے بعد دوستم کے فوجیوں نے گھروں کو خوب لوٹا۔ ایک پوری مارکیٹ لوٹ مار کر کے اجاڑ دی گئی۔ بیرونی سفارت خانے تک محفوظ نہ رہے۔ ان کی قیمتی کاریں اور دوسرا بیش قیمت ساز وسامان لوٹ لیا گیا۔ حتیٰ کہ پاکستان کا سفارت خانہ بھی ان کی دستبرد سے محفوظ نہ رہا۔ وہاں سے آٹھ کاریں چھین لی گئیں۔

نسلی، لسانی اور مذہبی تفرقہ نے فتح کی خوشیاں منانے کے بجائے کابل کو خون میں نہلا دیا۔ تاجک اور ازبک اپنے مقابلے میں پشتونوں سے ٹکرا گئے اور پشتونوں نے اپنے مطالبات منوانے تک ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ ادھر ایران کی حمایت یافتہ حزب وحدت کے مطالبے پہلے سے زیادہ بڑھ گئے اور انہوں نے ۵۱ رکنی عبوری کونسل میں ۱۹ اسیٹوں کا مطالبہ کر دیا۔

۲ مئی ۱۹۹۲ء کو کابل کے دفاع کیلئے ایک کونسل بنی۔ اس میں پشتونوں کو بھی نمائندگی دی گئی تھی، لیکن یہ کونسل کوئی مؤثر کردار ادا نہ کر سکی۔ اقوام متحدہ کے نمائندہ خاص مسٹر بینن سیوان ۳ مئی کو کابل آئے۔ مجاہدین کی حکومت کے قیام کے بعد یہ ان کا پہلا دورہ کابل تھا لیکن اب ان کا مشن عبوری حکومت کے مسائل نمٹانے کے بجائے نجیب کی جان بچانا تھا۔

۵ مئی کو عبوری صدر صبغت اللہ مجددی نے ۳۶ ارکان پر مشتمل کابینہ بنائی۔ ان کے اپنے دو بیٹے کابینہ میں شامل کیے گئے۔ جبکہ حزب اسلامی (حکمت یار) اور حزب وحدت سے کوئی نمائندہ نہ لیا گیا۔ اسی دن پروفیسر ربانی اور سیاف کے نمائندے کابل کے جنوب میں گلبدین حکمت یار سے ملے۔ جنہوں

نے ایک سمجھوتے کا اعلان کیا اور فریقین کے درمیان جاری جھڑپیں ختم ہو گئیں۔ وزیر دفاع احمد شاہ مسعود نے اخباری نمائندوں کے سوال پر خود اس سمجھوتے کی تصدیق کی۔ البتہ انہوں نے اس کی تفصیلات بتانے سے انکار کر دیا۔ اصل میں وہ حکمت یار کی شرائط پر اس سمجھوتے سے مطمئن نہ تھے۔

۷ مئی ۱۹۹۲ء کو احمد شاہ مسعود نے ایک پر ہجوم کانفرنس میں گلبدین حکمت یار کی طرف سے پیش کی گئی شرائط مسترد کر دیں۔ انہوں نے کہا کہ دوستم ملیشیا کو کابل سے نکالا نہیں جائے گا۔ ان کے بقول اس ملیشیا نے نجیب کو اقتدار سے ہٹانے میں اہم کردار ادا کیا اور اب وہ اسے کابل سے نکال کر اس کی تذلیل کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اپنے فوجی دستے کو مضبوط تر کرنے کیلئے مسعود نے پرچم پارٹی کے رکن اور نجیب حکومت کے سابق چیف آف آرمی اسٹاف جنرل آصف دلاور کو ان کے عہدے پر بحال کر دیا۔ وہ ایک تاجک تھے۔

احمد شاہ مسعود کے انکار کے بعد جنگ بندی کا سمجھوتا ختم ہو گیا۔ اس سے پہلی بار شمال اور جنوب میں پائی جانے والی رقابت کو شدت سے ابھرنے کا موقع مل گیا۔ افغانستان جو کہ نسلی لحاظ سے ایک نازک رشتے میں بندھا ہوا تھا، نفرتوں کے طوفان میں پھنس گیا۔

عبوری حکومت برسر اقتدار آئی تو اس نے نجیب کے سوا تمام لوگوں کو عام معافی دینے کا اعلان کیا۔ اس سے بڑے بڑے مجرم صاف بچ گئے۔ اس پالیسی سے نہ صرف افغان مجاہدین میں تفرقہ پیدا ہوا بلکہ اس سے بڑھ کر وہ ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہو گئے۔ ۱۶ مئی کو ۲۰ ارکان پر مشتمل ایک پاکستانی قبائلی وفد خون خرابے کو روکنے کیلئے پشاور سے براستہ تورخم کابل کیلئے روانہ ہوا۔ اس میں سینیٹر، ممبران قومی اسمبلی، قبائلی سردار، ملک، روحانی پیشوا اور علماء شامل تھے۔ ۲۱ مئی کو اس وفد کی موجودگی میں ۵ نکاتی صلح نامے کا اعلان کیا گیا۔ ٹھیک اسی دن دوستم ملیشیا نے حزب اسلامی کے ٹھکانوں پر گولہ باری کر کے اس صلح نامے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

۲۲ مئی کو عبوری صدر صبغت اللہ مجددی نے مزار شریف کی ایک مسجد میں ایک غیر معمولی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ان ملیشیاؤں کو صدارتی اعزازات سے نوازا جنہوں نے وسط مارچ میں نجیب کے خلاف بغاوت کر کے مسعود کا ساتھ دیا تھا۔ اس سلسلے میں ازبک ملیشیا کے تین ستاروں والے جنرل عبدالرشید دوستم کو ترقی دے کر چار ستاروں والا جنرل بنا دیا گیا۔ مجددی نے اپنی تقریر میں انہیں "مجاہد" کہہ کر پکارا۔ دوستم کے علاوہ بریگیڈیر جنرل مومن اور لیفٹیننٹ جنرل سید جعفر نادری کو بالترتیب لیفٹیننٹ

جنرل اور کرنل جنرل کے عہدوں پر ترقی دی گئی۔ کابل ٹی وی نے معمول کی نشریات کو روک کر ان ترقیوں کی خبر نشر کی۔

احمد شاہ مسعود اور حکمتیار اس دوران پاکستان کے ایک وفد کی آمد کے بعد ایک دوسرے سے بالواسطہ مذاکرات کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ ان کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ کابل کے مشرق میں واقع لیوارا راکٹ بیس میں دونوں گوریلا رہنما مل کر بیٹھے۔ کئی گھنٹوں کے طویل مذاکرات کے بعد جس میں سعودی شہزادے نائف بھی شامل تھے ایک معاہدہ امن طے پا گیا۔ بعد میں احمد شاہ مسعود اور حکمت یار نے ایک مشترکہ پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔

مسعود حکمت یار معاہدہ سات نکات پر مشتمل تھا۔ اس میں کابل سے ملیشیائیں ہٹانے کی بات تسلیم کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ ایک مشترکہ کمیشن بنانے پر اتفاق ہوا تھا جس نے انتقال اقتدار کیلئے انتخابات کرانے تھے۔

۲۶ مئی کو صدر صبغت اللہ مجددی نے مسعود اور حکمتیار کے درمیان ہونے والے معاہدے کی بعض شقوں کو ناقابل عمل قرار دیا۔

۲۹ مئی کو صبغت اللہ مجددی کا ہوائی جہاز پاکستان سے واپسی پر کابل کے ہوائی اڈے پر اتر رہا تھا کہ اسے ایک راکٹ آ کر لگا جس سے جہاز کا انجن جزوی طور پر تباہ ہو گیا۔ اس حادثے میں زخمی ہونے والے پائلٹ کا کہنا تھا کہ جہاز پر حملہ جنوبی کابل کی جانب سے کیا گیا تھا۔ بعض عینی شاہدین کا بیان تھا کہ جہاز پر اینٹی ایئر کرافٹ گن سے فائرنگ ہوئی تھی۔ اس وقت جہاز پر وفد کے ۱۰۰ سے زائد ارکان سوار تھے۔ اس حملہ کیلئے مجددی نے حزب اسلامی کو ذمے دار ٹھہرایا۔

مجددی کے جہاز پر حملے کے ناخوشگوار واقعے کے بعد امن کی موہوم امیدیں ٹوٹ گئیں۔ چھ دن کی جنگ بندی کے بعد دوستم اور حکمت یار کے دستوں میں زبردست فائرنگ ہوئی۔ پھر جون کے اوائل میں سیاف کے اتحاد اسلامی اور شیعوں کی حزب وحدت کے درمیان خوفناک جھڑپیں کئی دن جاری رہیں۔ جن سے کابل کا امن پارہ پارہ ہو کر رہ گیا۔

۱۶ جون کو مجددی نے ایران کے دباؤ پر اپنی کابینہ میں ۳ وزراء کا اضافہ کیا۔ ان کا تعلق حزب وحدت سے تھا۔ قومی سلامتی کی وزارت اسی تنظیم کے سپرد ہوئی۔ ۱۶ جون کو ہی اتحاد اسلامی کے رہنما پروفیسر سیاف حکمت یار سے ملے۔ انہوں نے مجددی پر الزام لگایا کہ وہ ببرک کارمل احمد شاہ مسعود اور

حزب وحدت کے ساتھ مل کر اپنے اقتدار کو طول دینے کی کوشش کر رہے ہیں جبکہ مجددی کا موقف یہ تھا کہ انہوں نے کابل کو فرقہ بندی سے محفوظ کرنے کیلئے شیعہ وزراء کابینہ میں لیے۔

صدر مجددی کچھ اس قسم کے بیان دے رہے تھے جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے عہدہ صدارت کو دو سال تک بڑھانا چاہتے تھے۔ ان کے ہوائی جہاز پر حملے کے بعد عہدہ صدارت کو طول دینے کے بیانات اس تواتر سے آنے لگے کہ ان سے افغانستان میں ایک بحران کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ لیکن پھر اچانک معاہدہ پشاور کے مطابق انہوں نے صدارت چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ ۲۸ رجون ۱۹۹۲ء کو انہوں نے ۱۰ ارکنی قیادی کونسل کو اقتدار منتقل کر دیا۔ کونسل نے اسی دن پروفیسر برہان الدین ربانی کو صدارت کیلئے چن لیا۔ ربانی جو کہ جمعیت اسلامی کے سربراہ تھے اور ایک تاجک تھے۔ ان کا تعلق صوبہ بدخشاں سے تھا۔ معاہدہ پشاور کے مطابق انہیں چار ماہ تک عہدہ صدارت پر رہنا تھا۔

کابل میں گزشتہ دو ماہ سے لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ یکم جولائی کو قیادی کونسل نے شہر میں مسلح گروپوں کے خلاف آپریشن کلین اپ کا حکم دیا۔ اس مقصد کیلئے ۱۵۰۰ فوجیوں پر مشتمل ایک خصوصی دستہ تشکیل دیا گیا۔ اس میں چند گوریلا افغان گروپوں کے علاوہ سابق کمیونسٹ یونٹوں کے فوجی شامل تھے، ان فوجیوں نے سرکاری احکامات کی آڑ میں ایسی کارروائیاں کیں جو آپریشن کلین اپ کے اصل مقاصد سے ہٹ کر تھیں۔ برہان الدین ربانی ایک تنظیم کے سربراہ ہونے کے ناتے غیر جانبدار صدر نہیں کہلائے جا سکتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کے احمد شاہ مسعود سے اختلافات پیدا ہو گئے تھے اور اب وہ حکمت یار سے رابطے کرنے لگے تھے۔ یہ رابطے نتیجہ خیز ثابت ہوئے اور دو ماہ کے بائیکاٹ کے بعد حزب اسلامی حکمت یار نے معاہدہ پشاور کے مطابق حکومت میں جانے کا فیصلہ کیا۔ ۶ جولائی ۱۹۹۲ء کو حزب کے نامزد وزیراعظم عبدالصبور فرید نے کابل پہنچ کر اپنے عہدے کا چارج سنبھال لیا۔

نئے وزیراعظم سینکڑوں مسلح گوریلوں کے ہمراہ چاریکار سے دارالحکومت میں داخل ہوئے۔ حزب اسلامی نے سیاسی تعاون کے ساتھ ساتھ اپنی ''فائر پاور'' ثابت کرنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ دو دن پہلے اس نے کابل پر زبردست گولہ باری کی جس میں ۱۰۰ کے لگ بھگ افراد ہلاک ہوئے۔ طاقت کی نمائش کے یہ مظاہرے کابل کے باشندوں کیلئے عذاب بن گئے۔ آنے والے دنوں میں قبائلی رقابت نے اس بدنصیب شہر کو بھوتوں کا مسکن بنا دیا۔

۱۲ جولائی ۱۹۹۲ء کو وزیر داخلہ احمد شاہ نے بیان دیا کہ وہ کسی مدافعت کا سامنا کیے بغیر کابل سے ان

متحارب گوریلوں کو نکال دیں گے جنہوں نے مختلف سرکاری عمارتوں، اہم جگہوں اور بڑے بڑے ہوٹلوں پر قبضہ کر رکھا تھا۔ لیکن وزیر داخلہ کا یہ بیان خیال خام ثابت ہوا۔ شیعوں کی تنظیم حزب وحدت کے رہنما عبدالعلی مزاری نے بیان دیا کہ جب تک انہیں اقتدار میں پورا حصہ نہیں دیا جائے گا وہ حکومت میں شامل نہ ہوں گے۔ واضح رہے کہ مختلف شیعہ گروپوں پر مشتمل حزب وحدت کابل کے مغربی اور شمالی حصوں پر قابض تھی۔ ان کے گوریلوں کا تعلق زیادہ تر ہزارہ قبائل سے تھا۔ ماضی قریب میں حزب وحدت اور سیاف کی حزب اسلامی میں خونی جھڑپیں ہو چکی تھیں۔

۱۷ جولائی کو وزیر اعظم عبدالصبور فرید نے اپنی اتحادی تنظیم حزب وحدت کو قیادی کونسل میں شامل کرنے کا اعلان کیا تو حالات پھر خراب ہو گئے۔ ۱۸ جولائی کو کابل سے دوستم ملیشیا کو باہر جانے کا حکم دیا گیا جسے ٹال دیا گیا۔ ۱۹ جولائی کو حزب وحدت اور اتحاد اسلامی میں دوسری بار جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ تین دن کی لڑائی میں درجنوں افراد ہلاک اور زخمی ہو گئے۔ سینکڑوں لوگ لڑائی سے متاثرہ علاقے سے بھاگ گئے۔ ۲۲ جولائی کو جنگ بندی ہوئی۔

حزب وحدت کے ساتھ ہونے والی جھڑپوں نے سیاف کے اتحاد اسلامی کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ ان حالات میں سابق کمیونسٹ ازبک ملیشیا نے فائدہ اٹھایا جسے اب وزیر دفاع احمد شاہ مسعود کی اشیر باد حاصل تھی۔ جولائی ۱۹۹۲ء کے آخر میں اس کے مزید ۷۰۰۰ مسلح افراد کابل میں داخل ہو گئے۔

۳۱ جولائی ۱۹۹۲ء کو حزب اسلامی افغانستان نے اپنے ہیڈ کوارٹر چہار آسیاب سے ایک اعلامیہ جاری کیا کہ ''قاتلوں'' کو قوم کا رہنما بننے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ شورائے حل وعقد پر تنقید کرتے ہوئے کہا گیا کہ یہ صرف عوامی رائے کے اظہار کو ''دھوکا'' دینے کیلئے بنائی گئی تھی۔

یہ چہار آسیاب سے جاری ہونے والا آخری الٹی میٹم تھا۔ ۲/ اگست کو ۶ بجے صبح کابل پر راکٹوں سے حملہ شروع ہو گیا۔ ایک دن میں شہر پر ۱۵۰ راکٹ اور گولے داغے گئے۔ کئی گولے ایئرپورٹ پر آ کر گرے۔ دو ہوائی جہاز تباہ ہو گئے۔ ان میں سے ایک ہوائی جہاز جو صدر کے لئے مخصوص تھا ہینگر سمیت تباہ ہو گیا۔ ٹیلی ویژن کی خبر کے مطابق ۱۳ شہری ہلاک اور ۷۹ زخمی ہوئے۔ فریقین نے ایک دوسرے پر لڑائی شروع کرنے کا الزام لگایا۔

نجیب کے زوال کے بعد یہ کابل میں ہونے والی سب سے خونی لڑائی تھی جو کم وبیش ایک ماہ جاری رہی۔ یو این کے ابتدائی اندازے کے مطابق اس میں ۲۵۰۰ شہری ہلاک ہوئے۔ غیر ملکی سفارت کار

کابل کو چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ کئی سفارت خانوں کو گولہ باری سے نقصان پہنچا۔ شہر کے ۱۷ میں سے ۸ ہسپتال تباہ ہو گئے۔ حتیٰ کہ صدارتی محل کو بھی نقصان پہنچا۔ اس لڑائی کے نتیجے میں ۳۹۰۰۰ مہاجرین پاکستان واپس آنے پر مجبور ہوئے۔

ایک ۱۲۰ رکنی ثالثی ٹیم جس کا تعلق پانچ مختلف افغان گروپوں سے تھا، متحارب ملیشیاؤں میں جنگ بندی کی کوششوں میں مصروف رہی۔ کوئی دس دن کی دوڑ دھوپ کے بعد فریقین ۱۹ راگست ۱۹۹۲ء کو جنگ بندی پر رضامند ہو گئے۔

جنگ بندی کے معاہدہ کے باوجود یکم ستمبر ۱۹۹۲ء کو فوجی طیاوں کے ذریعے حزب اسلامی کے ٹھکانوں پر بمباری کی گئی۔ شین ڈنڈ کے ہوائی اڈے اور اس کے گرد و نواح میں مگ طیاروں نے سینکڑوں بم برسائے۔ ۲ ستمبر کو افغان حکومت نے ہزاروں گوریلوں کو کابل چھوڑنے کا حکم دیا لیکن دوستم کا کہنا تھا کہ وہ اپنے فوجی دستوں کو کابل چھوڑنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اس کے کئی یونٹ بکتر بند گاڑیوں پر سوار ہو کر شہر میں خوف و ہراس پھیلانے میں مصروف تھے۔ ۶ ستمبر کو ازبک ملیشیا مکمل اخراج کی بجائے کابل کی بیرکوں میں واپس چلی گئی۔ لیکن اس نے کابل ہوائی اڈہ اپنے قبضہ میں رکھا۔ ۱۶ ستمبر کو ائیر فورس کے طیاروں نے حزب اسلامی کے زیر کنٹرول شین ڈنڈ ائیر پورٹ پر حملہ کر دیا۔ جس کے نتیجے میں ایک ہیلی کاپٹر اور ایک اسلحہ ڈپو تباہ ہو گیا۔ اسی دن کابل میں حزب وحدت اور اتحاد اسلامی (سیاف) میں جھڑپیں شروع ہوئیں جو چار دن جاری رہیں۔ اس سے کابل کا نواحی علاقہ کھنڈروں میں تبدیل ہو گیا۔

۲۳ ستمبر ۱۹۹۲ء کو حزب وحدت کو حکومت میں شامل کر لیا گیا۔ ایران نواز شیعون کی یہ تنظیم جولائی ۱۹۹۲ء میں وزارتوں کیلئے زیادہ سیٹیں لینے کے لئے احتجاجاً حکومت سے الگ ہو گئی تھی۔

اکتوبر ۱۹۹۲ء کے آغاز میں دوستم ملیشیا اور جمعیت اسلامی (مسعود) کے اتحادی دستوں سے حزب اسلامی کی جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ اس بار ہرات خون خرابے کا نشانہ بنا۔ حزب اسلامی نے ائیر پورٹ سمیت اہم مقامات پر قبضہ کر لیا۔ چند دن بعد سرکاری افواج اسے پیچھے دھکیل کر دوبارہ قابض ہو گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ صوبہ ہرات میں اپریل ۱۹۹۲ء میں حکمران جمعیت اسلامی کے بعض کمانڈروں نے بغاوت کر دی تھی جو اس لڑائی کا سبب بنی۔

معاہدہ پشاور کی رو سے برہان الدین ربانی چار ماہ کیلئے صدر چنے گئے تھے۔ ان کے عہدے کی

میعاد ۲۸ اکتوبر کو ختم ہوگئی۔ ۳۱ اکتوبر کو قیادی کونسل نے ان کے عہدہ صدارت میں ۴۵ دن کی توسیع کر دی۔

۲۵ اکتوبر ۱۹۹۲ء کو اقوام متحدہ کے ایک تحقیقاتی افسر فیلکس ارمکور نے جنرل اسمبلی میں ایک رپورٹ پیش کی جس کا تعلق افغانستان میں حقوق انسانی سے تھا۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ دنیا میں مختلف اکسٹھ ممالک افغانستان میں اپنا اپنا اثر ونفوذ بڑھانے کے لئے کام کر رہے ہیں۔ ان کے مطابق حقوق انسانی کی خلاف ورزیوں اور خون خرابہ کے پیچھے یہی عوامل کارفرما تھے۔

۵ دسمبر ۱۹۹۲ء کو مغربی کابل میں حزب وحدت اور وزیر دفاع احمد شاہ مسعود کے تاجک گوریلوں میں لڑائی شروع ہوگئی۔ وزارت دفاع کے مطابق حکومت نے حزب وحدت کے ٹھکانوں پر حملے کا حکم نہیں دیا تھا۔ اس سلسلہ میں مقامی خودسر کمانڈروں کو اس حملے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ لڑائی میں سینکڑوں لوگ ہلاک ہوگئے۔ یہ خونی جھڑپیں اس وقت شروع ہوئیں جب شورائے حل وعقد نے ایک نئے صدر کا انتخاب کرنا تھا۔

جنرل دوستم جو اپنی قائم کردہ ''جنبش ملی اسلامی'' کا صدر بھی تھا ایک عرصے سے حکومت میں نمائندگی کا مطالبہ کر رہا تھا۔ ۹ دسمبر ۱۹۹۲ء کو اس کی ازبک ملیشیا نے اچانک پیش قدمی کر کے دارالحکومت کابل کی اہم تنصیبات پر قبضہ کر لیا۔ لڑاکا طیاروں نے صدارتی محل اور وزارت دفاع کو بمباری کا نشانہ بنایا۔ اسی شب دوستم کے ۵۳ ڈویژن نے ایک سخت لڑائی کے بعد قلعہ بالا حصار پر قبضہ کر کے احمد شاہ مسعود کے دستے کو پسپا کر دیا۔

وزارت دفاع کے ایک سینئر افسر نے ان جھڑپوں کو ایک اتفاقی حادثہ قرار دیا لیکن اس کے نتیجے میں ۱۲ دسمبر کو شورائے حل وعقد کا وہ اجلاس نہ ہو سکا جس میں ایک نئے صدر کا انتخاب ہونا تھا۔ صدارتی ترجمان کے مطابق جمعیت اسلامی کے برہان الدین ربانی اور نیشنل اسلامی فرنٹ (نیفا) کے پشتون رہنما سید احمد گیلانی اگلے مرحلے کیلئے صدارتی امیدوار تھے۔

مجاہدین کی ۶ تنظیموں میں سے ۵ انتخاب کی مخالفت کر رہی تھیں جبکہ حکومت شورائے حل وعقد کے نئے ڈھانچے کے تحت ایک ہی دن میں انتخاب کرانا چاہتی تھی۔ اندازہ یہ تھا کہ افغانستان کے ۲۹ صوبوں میں سے شورائے حل وعقد کے ۱۵۰۰ مندوبین ایک نیا صدر چننے کیلئے حق استعمال کریں گے۔ لیکن عملی طور پر ایسا نہ ہو سکا۔ ۱۴ دسمبر ۱۹۹۲ء کو حکمت یار اور مسعود کے گوریلے پھر آپس میں ٹکرا گئے۔ اس کے نتیجے میں ۹۰۰ سے زائد مندوب کابل پہنچ گئے۔

۲۹ دسمبر کو شورائے حل وعقد کا اجلاس شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ برہان الدین اس عہدہ کے واحد

امیدوار تھے۔ انہیں اسی دن افغانستان کا پہلا منتخب صدر قرار دیا گیا۔ پاکستان میں موجود سابق افغان صدر صبغت اللہ مجددی نے اس انتخاب کو غیر قانونی قرار دے کر مسترد کر دیا۔ اسی طرح حکمت یار نے یہ عہد کیا کہ وہ ربانی کو کابل سے نکال کر دم لیں گے۔ یہ سیاسی کھیل چند دن بعد ایک خوفناک لڑائی کی شکل اختیار کر گیا۔

۲ جنوری ۱۹۹۳ء کو برہان الدین ربانی نے دو سال کے لئے عہدہ صدارت کا حلف اٹھایا۔ حالت یہ تھی کہ اس وقت کابل پر راکٹ گر رہے تھے۔

ربانی کے عہدہ صدارت سنبھالتے ہی کابل ایک نئی جنگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ عبوری پارلیمنٹ کے قیام نے نئے شبہات کو جنم دیا۔ پہلی بار حکومت کے حکم پر مخالف گروپوں کے کئی سرکردہ افراد گرفتار کر لیے گئے۔ نئے صدر کابینہ اور وزیراعظم نامزد نہ کر سکے تو جھڑپیں پھر شروع ہو گئیں۔

۷ جنوری ۱۹۹۳ء کو وزارت دفاع کی عمارت گولہ باری کی زد میں آئی۔ کابل بدترین خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ گیا۔ جنوری کے دوسرے عشرہ کے اختتام پر سرکاری فوجوں اور حکمت یار کی حزب اسلامی کے درمیان خوفناک لڑائی چھڑ گئی۔ شیعہ حزب وحدت حکمت یار کا ساتھ دے رہی تھی، کیونکہ اس کے سب سے بڑے حریف سیاف صدر ربانی کی صفوں میں شامل تھے۔

وسط فروری میں بین الاقوامی ہلال احمر کمیٹی نے رپورٹ پیش کی کہ لڑائی کے ۲۵ دنوں میں ۵۰۰۰ سے زائد شہری ہلاک ہو چکے تھے۔ غیر ملکی سفارت خانے کابل کی بھیانک صورت حال میں بند ہو رہے تھے اور ان کا عملہ واپس جا رہا تھا۔ پاکستان نے برسر جنگ افغان دھڑوں کو اسلام آباد میں امن مذاکرات کی دعوت دی۔ مارچ ۱۹۹۳ء کے شروع میں پہلا راؤنڈ وزیراعظم کی رہائش گاہ پر ہوا۔ دو دن کی بات چیت کے بعد فریقین کابل میں جنگ بندی پر رضامند ہو گئے۔

اسلام آباد میں ہفتے بھر کے تھکا دینے والے مذاکرات کے نتیجے میں فریقین نے ایک وزیر اعظم چننے اور دفاعی کونسل بنانے پر اتفاق کیا۔ ۷ مارچ ۱۹۹۳ء کو معاہدہ امن پر دستخط ہو گئے۔ اسی دن تمام افغان لیڈر عالمی ابلاغ عامہ کے نمائندوں کے سامنے آئے۔ انہوں نے معاہدہ کو عملی طور پر نافذ کرنے کے بارے میں رائے دینے سے اجتناب کیا۔ اس کا صاف صاف مطلب یہ تھا کہ اہم امور پر اتفاق رائے نہیں ہو سکا تھا۔ مارچ کے دوسرے عشرے میں گلبدین حکمت یار نے معاہدہ کی رو سے وزارت عظمیٰ کا عہدہ قبول کر لیا۔ اسی دن ۱۳۲ افراد پر مشتمل پاک افغان وفد سعودی عرب

کیلئے روانہ ہوگیا۔

۹ مارچ ۱۹۹۳ء کو فریقین نے مکہ میں ایک حتمی معاہدہ پر دستخط کر دیئے۔ اس سے اگلے دن سعودی فرماں رواشاہ فہد اور پاکستان کے وزیر اعظم نواز شریف نے معاہدہ پر ضامن کی حیثیت سے دستخط کیے۔ ۱۵ مارچ کو تہران میں پاک افغان وفد کی موجودگی میں ایران کے صدر ہاشمی رفسنجانی نے اپنے ملک کی نمائندگی کرتے ہوئے اس معاہدہ پر دستخط کیے۔

۲۹ مارچ ۱۹۹۳ء کو نامزد وزیر اعظم گلبدین حکمت یار نے اپنی کابینہ کی تشکیل کا اعلان کیا۔ صدر اور وزیر اعظم میں وزیر دفاع کے عہدہ کیلئے اختلافات موجود تھے۔ نئی کابینہ میں اس عہدہ کے لئے احمد شاہ مسعود کا نام شامل نہ تھا، اس لیے صدر نے اس کابینہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

احمد شاہ مسعود پہلے ہی سے وزیر دفاع چلے آرہے تھے، اپریل کے شروع میں حکمت یار نے پچھلی کابینہ توڑ دی لیکن صدر ربانی نے وزیر اعظم کے اس عمل کی توثیق سے ایک بار پھر انکار کر دیا۔

مئی ۱۹۹۳ء کے شروع میں جلال آباد میں حکمت یار ربانی میٹنگ ہوئی۔ اس کے بعد مختلف تنظیموں میں مذاکرات ہوئے۔ ۱۹ مئی سے دو ماہ کیلئے جنگ بندی ہوگئی۔ مسعود وزارت دفاع سے ہٹنے پر تیار ہو گئے۔ معاہدہ اسلام آباد اور پھر جلال آباد مذاکرات کی رو سے صدر ربانی اور وزیر اعظم حکمت یار کو ڈیڑھ سال تک اپنے عہدوں پر کام کرنا تھا لیکن جلال آباد کے ۲۰ دن کے مذاکرات کے بعد جونہی معاہدہ کا اعلان ہوا، متحارب فریق کابل میں پھر گتھم گتھا ہو گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ جنگجو تنظیموں کے متحارب کمانڈر جنگ بندی اور سیاسی فارمولے کو تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے۔

۷ جون ۱۹۹۳ء کو نامزد وزیر اعظم گلبدین حکمت یار نے اپنے ہیڈ کوارٹر چہار آسیاب میں کابینہ کا پہلا اجلاس بلایا۔ جب کابینہ کا اجلاس ہو رہا تھا، اس وقت کابل مارٹر بموں کی زد میں تھا۔ ۱۶ جون کو کابل میں وزارت دفاع کمیشن کی پہلی سرکاری میٹنگ ہوئی۔ فیصلہ ہوا کہ متحارب فریقوں سے بھاری ہتھیار لے لیے جائیں گے، لیکن عملی طور پر ایسا نہ ہوسکا۔ جنگ بندی کی خلاف ورزیاں حسب معمول جاری رہیں۔

۱۷ جون ۱۹۹۳ء کو وزیر اعظم حکمت یار نے کابل سے ۳۰ کلومیٹر مغرب میں پغمان میں واقع ایک مقام پر وزارت عظمیٰ کا حلف اٹھایا۔ صدر برہان الدین ربانی نے ایک خاص تقریب میں ان سے حلف لیا۔ ۸ ستمبر کو کابل یونیورسٹی کی دوبارہ کھلنے کی تقریب ہوئی۔ گلبدین حکمت یار نے اس موقع پر تقریر کرتے

ہوئے صدر ربانی سے مستعفی ہو جانے کا مطالبہ کر دیا۔ اکتوبر میں انتخابات کے بجائے باہمی خوں ریزی شروع ہوگئی۔ حکمت یار نے مشروط پیشکش کی کہ صدر ربانی اگر صدارت چھوڑنے اور استعفیٰ دینے پر تیار ہوں تو وہ بھی ساتھ ہی استعفیٰ دیدیں گے۔ انہوں نے دھمکی دی کہ اگر صدر ربانی نے استعفیٰ نہ دیا تو پھر ان کے صدارتی محل کو بمباری کا نشانہ بنایا جائے گا۔

دوستم شمال کے چار صوبوں پر قابض تھا۔ اپریل ۱۹۹۲ء میں جب سے اس نے نجیب اللہ کے خلاف بغاوت کی تھی وہ جمعیت اسلامی ربانی کا حلیف چلا آ رہا تھا۔ اس نے کئی بار حکومت میں شامل ہونے کی کوشش کی جس میں وہ کامیاب نہ ہوسکا۔ بالآخر اس دل برداشتہ جنرل نے دسمبر ۱۹۹۲ء میں کابل پر زوردار حملہ کیا تھا جسے احمد شاہ مسعود نے ناکام بنا دیا تھا۔

اس کی ازبک ملیشیا کابل کی خواجہ رواش ائیر پورٹ، قلعہ بالا حصار اور تپہ مرنجان پر قابض تھی۔ دوستم نے قسمت آزمائی کیلئے پھر پانسا پلٹا۔ ۱۳ جولائی کو اس نے گلبدین حکمت یار سے اس کے فوجی کیمپ میں ملاقات کی۔ بات چیت اڑھائی گھنٹے جاری رہی۔ حکمت یار نے دوستم کو نئی کابینہ میں ۲ عہدوں کی پیشکش کی۔ معلوم ہوتا تھا کہ دونوں شخصیتیں متحد ہو چکی تھیں۔

۱۵ جولائی کو اتحاد اسلامی کے پروفیسر سیاف نے اعلان کیا کہ وہ حکومت میں دوستم کی شرکت کو قبول نہ کریں گے۔ دوستم کا جوابی بیان آیا، جس میں اس نے کابینہ میں سیٹیں لینے اور اسی سال کے آخر تک افغانستان میں باقاعدہ الیکشن کرانے کا مطالبہ کیا۔ یہ دونوں مطالبے ایک بار پھر ٹھکرا دیے گئے۔ ان حالات میں حکمت یار کی وزارت عظمیٰ کم وبیش دم توڑ چکی تھی۔

یکم جنوری ۱۹۹۴ء کو دوستم نے بغاوت کر دی۔ کابل راکٹوں، توپوں اور بموں کے دھماکوں سے لرز اٹھا۔ ازبک ملیشیا کابل پر چڑھ دوڑی تھی۔ صدر ربانی کے ترجمان نے رشید دوستم پر اس حملے کا الزام لگایا۔ گلبدین حکمت یار کے ترجمان کا کہنا تھا کہ صدر ربانی کے وہ تمام مخالف جو کہ لاقانونیت سے تنگ آ چکے تھے اس حملہ میں شریک تھے۔ دوستم کی بغاوت ایک خوفناک جنگ میں تبدیل ہوگئی۔ مخالف فریقوں نے ایک دوسرے پر ہوائی جہازوں سے بمباری کی۔ سرکاری فوجوں نے کابل کا جم کر دفاع کیا۔ دوستم کے آٹھ جرنیل اور ۵۰۰ فوجی گرفتار کر لیے گئے۔ قلعہ بالا حصار پر سرکاری فوجوں کا قبضہ ہوگیا۔ دوستم کو شمال کی جانب دھکیل دیا گیا۔ کابل کے شہری پہلے کی طرح جنگ کی تباہ کاری کا نشانہ بنے۔ ہلال احمر کی رپورٹ کے مطابق ایک ماہ کی لڑائی میں ۹۰۰ کے لگ بھگ افراد ہلاک ہوئے۔ واضح رہے

کہ کابل میں یہ مجاہدین جب سے برسر اقتدار آئے تھے اس وقت سے اب تک گیارہ سو افراد باہمی لڑائی میں مارے جا چکے تھے۔

معاہدہ پشاور کی رو سے ربانی جون ۱۹۹۲ء میں چار ماہ کیلئے صدر بنے تھے۔ مگر وہ وقفے وقفے سے خود ساختہ پلیٹ فارموں سے اپنی مدت صدارت میں توسیع کراتے رہے۔ اس کا نتیجہ بدترین خانہ جنگی کی صورت میں نکلا۔ برہان الدین ربانی نے درج ذیل مواقع پر اپنے عہدہ صدارت میں توسیع کی:

پہلی توسیع	۴ ماہ	۳۱/اکتوبر ۱۹۹۲ء
دوسری توسیع	۲ سال	۲۹ دسمبر ۱۹۹۲ء
تیسری توسیع	۶ ماہ	۲۹ جون ۱۹۹۴ء

دسمبر ۱۹۹۴ء کے آخر میں جبکہ برہان الدین ربانی کو اقتدار چھوڑنا تھا، انہوں نے اپنے عہدہ صدارت میں چوتھی توسیع کر لی تھی۔



قارئین کرام!

آپ نے طالبان کی آمد سے قبل افغانستان میں اقتدار کی جنگ کی المناک کہانی پڑھی، اس جنگ نے افغانستان کو جس طرح آتش و آہن کا مسکن بنا رکھا تھا اور افغان عوام کو طرح طرح کی مشکلات سے دوچار کر رکھا تھا...... آیئے اس کی بھی مختصر روداد ملاحظہ کرتے ہیں:

برطانوی مصنف پیٹر مارسڈن اپنی کتاب ''طالبان، افغانستان میں جنگ، مذہب اور نیا نظام'' میں لکھتے ہیں:

> ''یوں تو کابل پر مجاہدین کا قبضہ ہو گیا لیکن گلبدین حکمت یار نے جو اقتدار میں مؤثر شرکت کے خواہاں تھے خانہ جنگی شروع کر دی۔ شہری زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی۔ شہر مختلف چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ ہر ٹکڑے پر علیحدہ جماعت قابض ہو گئی۔ عبوری صدر صبغت اللہ مجددی نے اپنے وزیر دفاع احمد شاہ مسعود کے ساتھ مل کر امن و امان کی صورت حال کو قابو میں لانے کی کوشش کی۔ ان کے بعد صدر ربانی نے اس کوشش کو مزید آگے بڑھایا مگر حزب وحدت اور اتحاد اسلامی کی افواج ایک دوسرے کے ساتھ دست

وگریاں ہوگئیں۔ اگست ۱۹۹۲ء میں کابل پر راکٹوں کا ایک خوفناک حملہ ہوا جس کے نتیجے میں ۱۸۰۰ شہری جاں بحق ہوئے اور بڑی تعداد میں لوگ مزار شریف کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ غرض ایک خوفناک خانہ جنگی کا سماں پیدا ہوگیا۔ صورت حال کو قابو میں لانے کیلئے حکمت یار کو وزیراعظم بنادیا گیا لیکن وہ بھی نام کے وزیراعظم بنے کیونکہ صدر ربانی پر قاتلانہ حملے کے بعد ان کی کابل میں داخلے کی ہمت نہ پڑی۔

ادھر حزب وحدت اور اتحاد اسلامی کی خون آشام لڑائیاں چلتی رہیں۔ احمد شاہ مسعود بھی عبدرب الرسول سیاف کی اتحاد اسلامی کے ساتھ ہوگئے اور مغربی کابل میں وہ خون خرابہ ہوا جسے ''افشار قتل عام'' کا نام دیا جاتا ہے۔ مسعود اس اتحاد میں کیوں شامل ہوئے اس کے بارے میں صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ شاید انہوں نے یہ سوچا کہ مجاہدین کی حکومت صرف تاجک اور ازبک لوگوں کی حمایت سے قائم ہوئی ہے لیکن اس کو مستحکم بنانے کیلئے اس میں پشتونوں کو شامل کرنا ضروری ہے۔ سیاف نہ صرف پشتون ہیں بلکہ ان کو سعودی عرب کی بھی حمایت حاصل ہے اس طرح سعودی مالی امداد میں بھی حصہ دار ہوا جاسکتا ہے۔ لیکن اس اقدام سے انہیں ہزارہ قبائل کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور آج بھی پشتون طالبان کی مخالفت ازبک ہزارہ اور تاجک ہی کررہے ہیں۔

احمد شاہ مسعود کی گلبدین حکمت یار سے بھی نہ بنی کیونکہ ان کے خیال میں حکمت یار پاکستان کے عسکری مفادات کے آلۂ کار بنے ہوئے تھے اور وہ افغانستان کو پاکستان کی نوآبادی بنانے کیلئے راستہ ہموار کررہے تھے۔ حکمت یار اقتدار کی راہ میں مسعود کو بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے۔

دسمبر ۱۹۹۲ء میں ربانی دوبارہ صدر بن گئے اور دوستم وغیرہ کو قطعاً نظرانداز کیا گیا۔ چنانچہ دوستم اور حکمت یار نے ربانی کو ہٹانے کیلئے یکم جنوری ۱۹۹۴ء کو کابل پر راکٹوں کی بارش کردی اور یہ سلسلہ سارا سال چلتا رہا۔ کابل کے تقریباً

تین لاکھ شہری پناہ لینے کیلئے یا تو پاکستان چلے گئے یا افغانستان کے مختلف شہروں کی طرف ہجرت کر گئے لیکن حکمت یار کو اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔

مزار شریف پر دوستم کا قبضہ تھا اور ان کی حمایت سے اسماعیلی پل خمری اور درہ سالانگ کے شمال کی شاہراہ کو کنٹرول کر رہے تھے۔ انہیں مجاہدین کی بھی حمایت حاصل تھی اس لیے امن وامان کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ شمال مشرق کا تاجک علاقہ جمعیت کے پاس تھا، مشرقی صوبے مہاجرین کے ایک اتحاد کے زیر نگیں تھے جن کی قیادت حاجی قدیر کے پاس تھی، لیکن یہاں امن وسکون کی کمی تھی۔ فروری ۱۹۹۳ء میں اقوام متحدہ کے چار کارکن قتل کر دیئے گئے جس کی کوئی وجہ بھی منظر عام پر نہ آئی۔ جنوب میں خوست پر بھی مجاہدین کی اجتماعی قیادت حکمرانی کر رہی تھی۔ غزنی پر قاری بابر کی حکومت تھی۔ گردیز میں بدنظمی پر قابو پانے کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں تاہم قندہار کے مقابلے میں وہاں امن تھا۔ قندھار میں تو انارکی کی کیفیت تھی کیونکہ وہاں مجاہدین کے مختلف گروہوں نے آپس کی لڑائیوں میں شہر کو ملبے کا ڈھیر بنا دیا تھا۔''

طالبان کے خلاف مغربی پروپیگنڈہ کی سرغنہ کرسٹینا لیمب اپنی کتاب ''طالبان کا افغانستان'' میں طالبان سے پہلے افغانستان کی صورتحال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''صدر برہان الدین ربانی کی تاجک گورنمنٹ کا صرف کابل اور شمال مشرق پر کنٹرول تھا۔ اسے کمانڈر احمد شاہ مسعود عرف ''شیر پنجشیر'' کی سرگرم حمایت حاصل تھی۔ لیکن وہ جنوب پر قابض بنیاد پرست لیڈر گلبدین حکمت یار کی فورسز کے محاصرے میں تھا.......... ہرات اور تین انتہائی مغربی صوبے اسماعیل خان کے زیر اقتدار تھے۔ یہ ایک خود پسند کمانڈر تھا جس کے آدمی کالی اور سفید چیک دار اسکارف باندھتے اور اس کو ''عالی جناب'' کہہ کر مخاطب کرتے ...... مزار شریف اور چھ شمالی صوبوں پر ''واڈکا'' (روسی شراب) کے رسیا ازبک جنگجو جنرل رشید دوستم کی حکمرانی تھی جو زمانہ جہاد میں روسی تنخواہ دار تھا۔ دوستم کی ۲۰ ہزار افراد پر مشتمل جاز جانی ملیشیا، اتنی خوفناک تھی کہ انہیں گلم جم یا ''قالین چور''

کہا جاتا تھا جو افغانیوں کی بہت بڑی توہین تھی۔ کمیونسٹوں کو شکست ہو جانے کے بعد وہ کبھی ایک گروہ کے ساتھ جا ملتا اور کبھی دوسرے کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیتا، جس میں دھوکہ دہی اور فریب کاری کا عنصر نمایاں طور پر شامل ہوتا تھا اور جب طالبان کا ظہور ہوا تو وہ ربانی کے ساتھ وفاداریاں ختم کر کے حکمت یار کے ساتھ جا ملا۔ وسطی افغانستان کا پہاڑی صوبہ بامیان ہزارہ قبائل کے زیر قبضہ تھا۔ پاکستان کے ساتھ ملنے والے تین مشرقی صوبے جلال آباد میں قائم شوریٰ کے کمانڈروں کے کنٹرول میں تھے، ان کمانڈروں کی آپس میں خوب ٹھنی رہتی تھی، اس پر قابو پانے کیلئے انہوں نے شوریٰ کا سہارا لیا ہوا تھا۔

ہندوکش کے جنوب میں آباد پشتون بدترین صورتحال سے دوچار تھے، یہ افغانستان کا سب سے بڑا نسلی گروہ ہے، قندھار کے اردگرد کے حالات خاص طور پر خرابی کا شکار تھے۔ یہاں کا گورنر گل آغا تھا...... اس کے پاس اپنے دفتر کے اردگرد اور سڑک کے پار کے تھوڑے سے علاقے کے سوا کسی چیز کا کنٹرول نہیں تھا۔ چھوٹے چھوٹے جنگجو گروپوں اور کمانڈروں نے لوٹ مار کیلئے علاقے تقسیم کر رکھے تھے۔ ان کے جگہ جگہ چیک پوائنٹس تھے، جو چیز بھی ان کے ہتھے چڑھتی، اسے اسکریپ بنا کر فروخت کر دیتے تھے۔

ہر کوئی سڑکوں کے آر پار لگی ہوئی زنجیروں کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا۔ پانچ زنجیریں تو قندھار کی مین اسٹریٹ پر لگی ہوئی تھیں، سپین بولدک اور قندھار تک ۶۵ میل کا فاصلہ ہے جو دو گھنٹے میں طے ہوتا ہے۔ اس پر پچاس زنجیریں لگائی گئی ہیں، ہر زنجیر کا انتظام کسی خاص جنگجو سردار کے پاس ہے۔ جس کے کارندے گزرنے والوں کو روک کر ان سے رقم بٹورتے ہیں۔ تاجر اور ٹرکوں والے جتنا سامان لاتے انہیں اس کی مالیت سے کہیں زیادہ رقم زنجیر والوں کو بطور رشوت دینا پڑتی ہے۔ نورزئی قبیلے کے سردار ولی جان نے جو ایک پٹرول اسٹیشن اور قندھار کے ایک بڑے بازار کا مالک ہے، اپنے کوئٹہ کے سنگ مرمر سے بنے ہوئے مکان میں مجھ سے ملاقات کے دوران بتایا کہ اس نے ملا عمر کو

بڑی خوشی سے رقم دے دی تھی۔ اس نے بتایا ''سڑکوں پر ڈاکو دندناتے پھرتے ہیں، ہمیں ان سے اپنا سامان بچانے کیلئے بہت رقم خرچ کرنا پڑ جاتی ہے۔ دوسری طرف ہماری مارکیٹیں بھی چوروں سے بھری ہوئی ہیں۔''

اس سے بھی بڑی مصیبت جبری عصمت دری کے واقعات تھے۔ کوئی بھی اپنے گھر میں سکون کی نیند نہیں سوسکتا تھا۔ نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کو جبراً اٹھالیا جاتا تھا اور ان سے انسانیت سوز سلوک کیا جاتا تھا۔ بہت سے لوگوں نے خوفزدہ ہوکر بچوں کو اسکول بھیجنا بند کر دیا تھا۔''

ایک اور مغرب نواز، طالبان مخالف صحافی احمد رشید اپنی کتاب ''طالبان'' میں طالبان سے قبل افغان بحران کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''۱۹۹۴ء میں طالبان کے منظر پر آنے سے پہلے افغانستان کے حصے بخرے ہونے کی صورت پیدا ہو چکی تھی۔ ایک طرف قبائلی سردار تھے جو اتحاد بناتے، بگاڑتے، وفاداری بدلتے اور باہم لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ کابل کے نواح اور شمال مشرقی علاقے پر صدر برہان الدین ربانی کی تاجک حکومت کی عملداری تھی۔ مغرب کی طرف کے تین صوبوں پر (ہرات جن کے وسط میں تھا) اسماعیل خان کا کنٹرول تھا۔ مشرق میں پاکستان کی سرحد کے پاس کے تین پشتون صوبے مجاہدین کی شوریٰ کے پاس تھے۔ شوریٰ کا مرکز جلال آباد تھا۔ کابل کے شمال اور مشرق کا ایک چھوٹا سا علاقہ گلبدین حکمت یار کے زیر اثر تھا۔ شمال میں ازبک جنرل رشید دوستم چھ صوبوں پر حاوی تھا۔ جنوری ۱۹۹۴ء میں اس نے صدر برہان الدین ربانی کی حکومت سے اتحاد ختم کر دیا اور کابل پر حملہ کرنے کی غرض سے گلبدین حکمت یار سے اتحاد قائم کرلیا۔ وسطی افغانستان کے صوبہ بامیان پر ہزارہ قبیلے کا غلبہ تھا۔ جنوبی افغانستان اور قندھار درجنوں سرداروں میں بٹا ہوا تھا۔ جنہوں نے مقامی آبادی میں لوٹ مار شروع کر رکھی تھی۔ پشتونوں کا ڈھانچہ بکھرا ہوا اور معیشت انتشار کا شکار تھی، مرکزی قیادت پر کوئی اتفاق

نہیں تھا۔ پاکستان جس طرح گلبدین حکمت یار کی مدد کرتا آیا تھا، اس طرح درّانیوں کی فوجی امداد کرنے پر تیار نہیں تھا۔ جنوب کی جانب کے پشتونوں میں باہم لڑائی چھڑی ہوئی تھی۔

قندھار متحارب گروہوں میں بٹا ہوا تھا۔ اسی لیے بین الاقوامی امدادی ادارے کسی قسم کی امداد فراہم کرنے سے جھجکتے تھے۔ قندھاریوں کے لیڈروں نے ہر چیز پاکستانی تاجروں کے ہاتھ فروخت کر دی تھی۔ حتیٰ کہ ٹیلی فون کے تار کھمبوں سے اتار کر بیچ ڈالے تھے۔ درخت کاٹ دیئے، فیکٹریاں، مشینری اور روڈ رولر تک بیچ کھائے۔ جنگی سرداروں نے لوگوں کو ان کے گھروں اور کھیتوں سے نکال دیا اور یہ گھر اور کھیت اپنے حامیوں میں تقسیم کر دیئے۔ جنگی سردار من مانی کرتے، اپنی جنسی اور نفسیاتی تسکین کیلئے نوجوان لڑکیاں اور لڑکے اغواء کر لیتے، بازاروں میں سوداگروں کو لوٹ لیتے اور گلی کوچوں میں لڑنے جھگڑنے اور خون بہانے میں لگ جاتے۔ پاکستان سے مہاجروں کی آمد شروع ہوئی تو نئے مہاجر قندھار سے کوئٹہ جانے لگے۔ یہ صورتحال کوئٹہ اور قندھار کے بااثر ٹرانسپورٹروں کیلئے ناقابل برداشت تھی۔ وہ اس کے باعث کاروبار میں خسارے سے دوچار تھے۔ میں نے ۱۹۹۳ء میں کوئٹہ سے قندھار کی طرف ۱۳۰ میل کا سفر کیا تو کم وبیش ۲۰ مختلف گروپوں نے ہمیں روکا۔ انہوں نے زنجیریں ڈال کر راستہ بند کر رکھا تھا۔ وہ گزرنے کیلئے ٹول ٹیکس مانگتے تھے۔ ٹرانسپورٹ مافیا کے لئے راستے کی یہ بندشیں بے حد ناگوار تھیں۔ وہ کوئٹہ، ایران اور ترکمانستان کے درمیان آزادانہ نقل وحمل اور بلا روک ٹوک اسمگلنگ کیلئے چاہتے تھے کہ راستے کھلے رہیں۔ لیکن اب انہیں دشواری پیش آ رہی تھی۔''

طالبان سے پہلے ہرات کے حکمران اسماعیل خان کا تذکرہ کرتے ہوئے احمد رشید رقم کرتے ہیں:

''اس نے آبادی سے ہتھیار رکھوا لیے اور جبری بھرتی کے ذریعے فوج بنائی، جو مقبول نہ تھی۔ بدعنوانی، پست حوصلے اور وسائل کی کمی نے اسے بے

معنی بنا دیا تھا۔ اسماعیل خان کو طالبان کا مقابلہ کرنے کیلئے لوگوں کو پھر سے مسلح کرنا پڑا۔ سرکاری اہل کاروں میں کرپشن انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ عام لوگوں سے ان کی بدسلوکی کی شکایات عام تھیں، ہرات سے گزرنے والے ہر ٹرک سے کسٹمز والے ۱۰ ہزار پاکستانی روپے لیتے، اس طرح ٹرانسپورٹ مافیا انتظامیہ کے خلاف ہو گیا۔''

مزار شریف کا ایک منظر احمد رشید کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے:

''مزار شریف کے بازار میں روسی شراب اور فرانسیسی پرفیومز عام میسر تھیں جو شراب اور عورتوں کے رسیا ازبک سپاہیوں کے تصرف میں آتیں۔''

افغانستان کے مشہور مصنف اور مؤرخ عبدالحمید مبارز اپنی کتاب ''حقائق و تحلیل وقائع سیاسی افغانستان'' میں طالبان کی آمد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جہادی کمانڈروں کی زیادتیاں، جہادی منشور سے انحراف اور افغان جہاد کے متوقع نتائج کے کھو دینے سے طالبان کو شہ ملی۔ اسی طرح ان کمانڈروں کا اخلاقی حدود سے تجاوز، عوام الناس کی خاموشی، پورے ملک اور صوبوں کی کمانڈروں کے قبضہ و تسلط کے اعتبار سے تقسیم، سرعام ہم جنس پرستی اور قتل و غارتگری طالبان کے منظر عام پر آنے کے بڑے عوامل میں سے تھے۔''

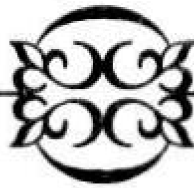
اقوام متحدہ کی ۹۶-۱۹۹۵ء کی ایک رپورٹ کے مطابق صرف کابل شہر میں حکمت یار، مسعود، دوستم، سیاف اور خلیلی و مزاری کے مابین ہونے والی لڑائیوں میں روزانہ ۳۷ ماہانہ ۱۱۳۲ اور سالانہ ۱۳۵۸۴ افراد ہلاک ہوتے رہے۔ اس طرح آپس میں ۵۳ ماہ کی لڑائیوں میں کابل شہر اور اطراف کے ۶۰ ہزار بے گناہ افراد ہلاک ہوئے۔

روزنامہ دی نیوز کی ایک رپورٹ کے مطابق جلال آباد سے کابل تک ۸۰ غیر قانونی پھاٹک تھے جن میں زیادہ تر حزب اسلامی حکمت یار کے تھے۔ اسی طرح افغانستان میں گھومنے پھرنے والے عام لوگ اور ٹرک، ڈاٹسن، فلائنگ کوچ کے ڈرائیور اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ تگاب سے جلال آباد تک بائیس پھاٹک تھے اور کنڑ سے جلال آباد تک بائیس پھاٹک تھے۔ طارق سمیر

نمائندہ این این آئی کے مطابق اسپین بولدک سے قندھار شہر تک تقریباً ٦٠ پھاٹک تھے۔ جن میں سب سے خطرناک تختہ پل کا پھاٹک تھا، جس کا سرغنہ عصمت خان نامی کمانڈر تھا۔ یہ شخص حسین عورتوں کا رسیا اور عصمتوں کا سوداگر تھا اور اس نے تقریباً چالیس عورتوں سے شادیاں رچائی تھیں۔ عورتوں کو مسافر گاڑیوں سے اتارنا، اغوا کرنا اور عصمت دری کر کے نکاح کرنا اس کا معمول بن چکا تھا۔ پھاٹکوں اور شادیوں کی یہ تعداد زبان زد عام تھی۔

ان سنگین حالات میں افغانستان کی افق پر تحریک طالبان کا ظہور ایک غیر متوقع نعمت ثابت ہوا۔





۴

طالبان کون تھے؟

طالبان کون تھے؟ کہاں سے آئے؟ اور ان کی تحریک کے مقاصد کیا تھے؟ ان سوالات کے جوابات کیلئے ہمیں آج سے کچھ عرصہ قبل کے ماضی کی جانب دیکھنا ہوگا۔

یہ بیسویں صدی کی آخری دہائی کی بات ہے جب افغانستان پر روسی تسلط کے خاتمے کے بعد یہ ملک ایک مرتبہ پھر خانہ جنگی کا شکار ہوکر تباہی و بربادی کے دہانے پر پہنچ گیا۔ ۱۹۹۱ء میں افغان مجاہدین کے دارالحکومت کابل میں فاتحانہ داخلے کے بعد اگرچہ اس طویل جنگ کا اختتام ہوگیا جسے دنیا جہاد افغانستان کے نام سے یاد کرتی ہے، مگر بدقسمتی سے اس کے بعد اس جنگ کا آغاز ہوا جس میں دشمن کا تو کچھ نقصان نہ تھا البتہ افغان قوم اس جنگ کا شکار ہوکر اپنی باقی ماندہ ہنسی خوشی بھی کھو بیٹھی۔ کابل میں داخلے کے بعد اگرچہ چاہئے تو یہ تھا جہاد افغانستان کے اہم راہنما مل کر بیٹھتے اور باہمی اتفاق رائے سے ایک ایسی حکومت تشکیل دیتے جو نہ صرف یہ کہ تباہ شدہ افغانستان کی تعمیر نو کرتی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ حکومت جہاد افغانستان کے ثمرات کو بھی سامنے لانے کی کوشش کرتی۔ مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوسکا کیونکہ انا پرستی، قوم پرستی، حب جاہ اور حب مال کے ساتھ غیروں کی ریشہ دوانیوں نے جہادی راہنماؤں کو اقتدار کی رسہ کشی میں ایسا الجھایا کہ وہ خود ہی آپس میں دست بگریبان ہوگئے اور پھر انہوں نے اس راہ پر چلتے ہوئے ایسی ایسی شرمناک اور افسوسناک مثالیں قائم کیں جنہیں دیکھ کر انسانیت بھی کانپ اٹھی۔

ناعاقبت اندیش افغان راہنماؤں نے کابل کا اقتدار حاصل کرنے کیلئے باہمی طور پر جس کشت وخون کا آغاز کیا اس کے شعلوں نے بہت جلد ہی پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور پھر دیکھتے ہی

دیکھتے اس سرزمین کے گلی کوچے ویران ہونے لگے، قبرستان بھرنے لگے، بستیاں اجڑ گئیں، آبادیاں برباد ہوگئیں، پورے ملک میں بدامنی و بے چینی پھیل گئی، ہر طرف بدانتظامی نے بسیرا کرلیا، جگہ جگہ پر جنگی کمانڈروں کی شخصی حکومتیں قائم ہوگئیں، عوامی راستوں پر پھاٹک لگا کر غریب عوام سے غنڈہ ٹیکس وصول کیا جانے لگا، عورتوں کی عصمتیں پامال ہوئیں، نوجوانوں کو بلاجواز قتل کیا گیا، اور نہ جانے کتنے ہی ایسے واقعات رونما ہوئے جو افغانستان کی تاریخ پر سیاہ دھبے بن کر لگے۔ اور پھر یہ دھبے اس قدر پھیلتے چلے گئے کہ یوں لگا جیسے اب اس ملک کی ساری تاریخ ہی ظلمتوں سے عبارت ہوجائے گی اور وہ سحر جس کے انتظار میں سولہ لاکھ افغان مسلمانوں نے اپنا لہو پیش کیا تھا اب کبھی نہیں آئے گی۔

مگر کب تک...... بالآخر رحمت حق کو جوش آیا، شہداء کا مقدس لہو مہک اٹھا، کوہساروں کی پیشانی چمکنے لگی اور ویران بستیوں کی قسمت جاگ اٹھی...... ۱۹۹۴ء کے وسط میں جنوبی شہر قندھار کے قریب مٹی سے بنے کچے مکانوں والی ایک بستی میں ایک عظیم الشان تحریک نے جنم لیا جسے دنیا ''تحریک اسلامی طالبان'' کے نام سے جانتی ہے۔

''طالبان'' پشتو زبان میں طلبہ کو کہتے ہیں اور یہ گروہ قدسیاں بھی چونکہ اکثریت کے اعتبار سے طلبہ پر ہی مشتمل تھا لہٰذا انہیں ''طالبان'' کے نام سے پکارا جانے لگا۔

تحریک طالبان کا علاقائی طور پر پہلی مرتبہ ظہور جون ۱۹۹۴ء میں اس وقت ہوا جب قندھار شہر کے قریب واقع ''سنگ حصار'' کے علاقے میں ''ملا محمد عمر'' نامی ایک طالب علم کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے تقریباً ۵۳ طالب علم ایک جگہ جمع ہو گئے اور انہوں نے اپنے ملک میں جاری بدامنی اور بدانتظامی کو ختم کر کے امن وامان قائم کرنے کے عزم کا اظہار کیا۔

یہ سب کے سب طلباء قندھار ہی کے مختلف مدارس میں تعلیم حاصل کر رہے تھے مگر جب انہیں ملا محمد عمر نے اس جانب متوجہ کیا کہ افغانستان کی دن بدن بگڑتی ہوئی اس صورتحال میں تعلیم حاصل کرنے سے زیادہ ضروری ہے کہ جو کچھ پڑھ لیا گیا ہے اس پر عمل کیا جائے تو وہ ان کا ساتھ دینے کیلئے تیار ہو گئے اور پھر انہوں نے اپنی تحریک کو منظم کرنے کیلئے ملا محمد عمر ہی کو اپنا امیر مقرر کرلیا۔

تحریک طالبان چونکہ ابتدائی طور پر قندھار کے علاقے سے شروع ہوئی جہاں کی تقریباً سو فیصد آبادی پشتونوں پر مشتمل ہے لہٰذا اس میں شامل طلبہ کا پشتون ہونا ایک فطرتی بات تھی مگر پھر بہت جلد ہی طالبان نے یہ ثابت کر دیا کہ ان کی تحریک کی بنیاد پشتونوں پر نہیں رکھی گئی تھی کیونکہ کچھ عرصہ بعد ہی اس

تحریک میں نمایاں طور پر ایسے بہت سے افراد شامل ہوئے جو افغانستان میں بسنے والی دوسری قوموں سے تعلق رکھتے تھے۔

تحریک طالبان کا فکری طور پر تعلق اہلسنت والجماعت سے تھا اور چونکہ ان کی ایک بڑی اکثریت نے پاکستان کے ایسے مختلف دینی مدارس سے تعلیم حاصل کی تھی جو مسلک دیوبند سے تعلق رکھتے تھے لہٰذا طالبان کی علماء دیوبند اور ان کے نظریات سے ہم آہنگی اور دلچسپی ایک قدرتی بات تھی۔ یہی وہ رشتہ تھا جس نے ملکی سرحدوں سے صرف نظر کر کے دونوں ملکوں کے رہنے والے مسلمانوں کو انتہائی قریب کر دیا اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے پاکستان کے دینی مدارس میں پڑھنے والے طلباء سے لیکر افغانستان کے کوہساروں میں مورچہ زن سب طلبہ ایک ہی تسبیح کے موتی ہیں۔

محبت ونظریے کے اس رشتے میں اگرچہ کئی بار دونوں ہی طرف کے لوگوں کو کڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، چنانچہ طالبان کا نام لیکر پاکستان کے دینی مدارس پر ''دہشتگردوں'' کی کھیپ تیار کرنے کا الزام لگایا گیا جبکہ پاکستان میں رونما ہونے والے مختلف فسادات کو فرقہ واریت کا نام دیکر طالبان پر مذہبی انتہا پسندوں کی حمایت کا الزام عائد کیا گیا...... مگر اس سب کچھ کے باوجود مزار شریف سے لیکر کراچی تک اور پشاور سے لیکر قندھار تک طالبان ایک ہی رہے اور آج بھی ایک ہی ہیں۔ جس طرح پاکستان کے مدارس میں پڑھنے والے طلبہ نے اپنے افغان طلبہ بھائیوں کا ساتھ دیا بالکل ایسے ہی افغان طلبہ نے بھی ان کے ساتھ وفا کی اور ہر اس مرحلے پر ان کے کام آئے جب انہیں ضرورت پڑی۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ''دیوبندیت'' ہی کے اس رشتے نے طالبان کو خواہ مخواہ پاکستان کے ان کم نظر لوگوں کی نگاہوں میں مجرم بنا دیا جو مسلک دیوبند سے اختلاف رائے رکھتے تھے اور پھر اس جرم کی پاداش میں طالبان کو ان لوگوں کی جانب سے افسوسناک حد تک ایسی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جو شاید غیر مسلموں نے بھی نہ کی تھی۔ تاہم مخالفت کا یہ سلسلہ زیادہ نہ چل سکا کیونکہ طالبان نے اپنی بے لچک اور مضبوط پالیسیوں سے ثابت کر دیا کہ وہ حق کی آواز لیکر اٹھے ہیں، حق بات کہتے ہیں، حق بات سنتے ہیں اور حق پر ہی مرمٹنا ان کا شیوہ ہے۔

تحریک طالبان کے ظہور اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے افغانستان میں ان کے پھیل جانے کے حقیقی اسباب کو ہم کچھ اس طرح تعبیر کر سکتے ہیں:

تحریک طالبان کی کامیابی کا پہلا سبب اس تحریک سے پہلے افغانستان کے طول وعرض میں پھیلی

ہوئی خانہ جنگی تھی جو سابق جہادی راہنماؤں نے اپنے اپنے مفادات کی خاطر چھوڑ رکھی تھی اور اس میں مرنے والے بے گناہ افغان عوام تھے۔ جہاد افغانستان کے بعد شروع ہونے والی اس خانہ جنگی میں انتہائی محتاط اندازے کے مطابق کم از کم چالیس ہزار افغانوں کو اپنی جانوں سے ہاتھ دھونے پڑے جبکہ زخمی ہونے والوں کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔ خانہ جنگی کے بھیانک نتائج نے افغان عوام کو طالبان کا بہت جلد ہی گرویدہ بنا دیا جنہوں نے قدرت حاصل کرتے ہی جنگی کمانڈروں کو غیر مسلح کر کے انہیں خانہ جنگی سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا۔

تحریک طالبان کی کامیابی کا دوسرا اہم سبب افغانستان میں ایک منظم حکوت کا قیام تھا۔ طالبان سے پہلے چونکہ ملک میں ایک حکومت قائم نہیں تھی اور طوائف الملو کی کا دور دورہ تھا لہٰذا ایک مشترکہ نظام حکومت بھی قائم نہ تھا۔ طالبان نے اپنے زیر قبضہ علاقوں میں منظم اور مضبوط حکومت قائم کر کے اس افغان قوم کے دلوں میں اپنے لیے مقام پیدا کر لیا جو ایک عرصہ سے اپنی دھرتی پر بدنظمی اور لوٹ مار دیکھتے دیکھتے دلبرداشتہ ہو چکی تھی۔

طالبان کی کامیابی کا تیسرا سبب انصاف کی فراہمی تھا، کیونکہ طالبان نے ایسے وقت میں جب افغانستان میں طاقت والا ظالم تھا اور کمزور مظلوم، آگے بڑھ کر ظالم کا ہاتھ روکا اور کمزور کو انصاف دلایا۔ ایک عرصہ بعد افغانستان کی عدالتوں نے کام شروع کیا اور حیرت انگیز طور پر انتہائی کم مدت میں ایک ایسے ملک میں ظلم وزیادتی کا سدباب کیا جہاں طرح طرح کے جرائم کا سلسلہ خوفناک حد تک پھیل گیا تھا۔ طالبان نے اقتدار ہاتھ میں لیتے ہی عدالتوں کو فعال کیا اور ان میں اسلامی نظام عدالت کو رائج کیا۔ مسلمانان افغانستان نے شریعت کے مطابق بننے والی عدالتوں کو تہہ دل سے بخوشی تسلیم کیا اور ان کے فیصلوں کو قبول کرتے ہوئے طالبان کے عدل وانصاف کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔

طالبان کی کامیابی کی چوتھی وجہ ان کا یہ کارنامہ تھا کہ انہوں نے افغانستان میں رونما ہونے والے اخلاقی فساد کا بھرپور طریقے سے سدباب کیا۔ چنانچہ خواتین سے زیادتی، ہم جنس پرستی اور بعض دیگر اخلاقی جرائم ایسے تھے جنہیں نہ صرف یہ کہ مختلف جنگی کمانڈروں کی بھرپور حمایت حاصل تھی بلکہ وہ خود بھی ان میں ملوث تھے۔

طالبان نے آتے ہی ان جرائم کے خاتمے کا آغاز کیا تو غیرتمند افغان قوم نے انہیں بر سرو چشم قبول کیا۔

ملک بھر میں امن وامان کا قیام بھی تحریک طالبان کے تیزی سے پھیل جانے کا ایک اہم سبب تھا۔ کیونکہ خانہ جنگی اور بدانتظامی کی وجہ سے ہر طرف بدامنی وبے چینی پھیلی ہوئی تھی، کہیں بھی کسی شخص کو کسی

بھی قدم پر تحفظ کا احساس نہ تھا، لوٹ مار کرنے والوں نے اپنی ہوس اور شر کے آگے دنیا کے ہر قانون کو مات دے رکھی تھی، حتیٰ کہ بین الاقوامی امدادی اداروں کو بھی افغانستان میں تحفظ فراہم نہ تھا، اس صورتحال میں طالبان کی جانب سے قیام امن کے اقدامات نے افغان قوم کے دل موہ لیے تھے اور امن بھی ایسا کہ کئی طالبان راہنماؤں نے کھلے عام دعویٰ کیا کہ زیورات سے لدی ہوئی ایک عورت کابل سے لیکر قندھار تک چلی جائے۔ راہ بھر میں کوئی اس پر نگاہ غلط بھی نہ ڈال سکے گا۔

تحریک طالبان کی کامیابی کے یہ وہ اسباب تھے جن کی وجہ سے طالبان کو بہت جلد ہی مقبولیت ملی اور ملک کے ۹۵ فیصد علاقے پر انہوں نے اپنی حکومت مستحکم کرلی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ طالبان کو منظم کرنے اور اس قدر جلد پورے افغانستان پر قابض ہونے میں طالبان کو بیرونی امداد حاصل تھی، اس سلسلہ میں خاص طور پر پاکستان اور امریکہ کا نام لیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ مذکورہ بالا دونوں ملکوں نے طالبان کو ایک عرصہ تک مدد اور تعاون فراہم کیا جس کی وجہ سے طالبان انتہائی سرعت کے ساتھ افغانستان پر قابض ہوگئے۔ کیا یہ بات واقعی سچ ہے؟...... اور کیا طالبان کے ظہور اور ان کے نشو و نما میں واقعی بیرونی دنیا کا کردار رہا ہے؟......



ہمارے ہاں یہ ایک عام رواج بن گیا ہے کہ جس تحریک کو بدنام کرنا ہو اس پر پھبتی کس دی جائے کہ جی اس کے پیچھے فلاں استعماری طاقت کارفرما ہے اور اسے فلاں ملک نے اپنے مفادات کیلئے بنایا ہے اور اس کی پشت پناہی کی ہے۔

کچھ ایسا ہی معاملہ طالبان کے ساتھ بھی پیش آیا۔ طالبان کے مخالفین کی ایک بڑی تعداد بلا جھجک یہ بات کہہ دیتی ہے کہ تحریک طالبان کو بنانے اور بڑھانے میں پاکستان کی حکومت اور اس کی خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی کا بھرپور کردار رہا ہے۔ اور پھر چونکہ پاکستان کی امریکہ نوازی زبان زد عام ہے، اس لیے اس صغریٰ کے ساتھ یہ کبریٰ ملایا جاتا ہے کہ درحقیقت طالبان کو منظر عام پر لانے میں اور ان کو آگے بڑھانے میں امریکی سازش کارفرما رہی ہے۔ امریکہ چونکہ افغان جہاد کے تجربے کے بعد خود کھل کر میدان میں نہیں آسکتا تھا، اس لیے وہ پاکستان کو استعمال کرکے طالبان کو سامنے لایا۔ مقام افسوس یہ ہے کہ امریکہ کی طرف طالبان کی پشت پناہی کی یہ بے سروپا باتیں جس قدر بعض مغربی حلقوں کی طرف سے سامنے آئیں اس سے کہیں زیادہ ایسے الزامات ان لوگوں کی طرف سے عائد کیے گئے جو اپنے آپ

کو استعمار دشمن اور مغرب مخالف گردانتے ہیں۔

ہم ایسے حلقوں کی نام لیکر نشاندہی نہیں کریں گے، لیکن یقین ہے کہ قارئین ان چہروں سے بخوبی واقف ہوں گے، جو برسہا برس سے پاکستان سمیت کئی ملکوں میں ایک صحیح، مخلص اور مستحکم اسلامی حکومت قائم کرنے کی کاوشوں میں مگن نظر آتے ہیں، ان لوگوں کے دعوے اور باتیں، نعرے اور تقریریں ہمیشہ اسی موضوع کو محور بنائے رکھتی ہیں کہ ان کی تمام تر جدوجہد کا مقصد محض احیائے دین اور نفاذ اسلام ہے، لیکن مقام حیرت ہے کہ جب ان سے بالکل قریب ایک خالص اسلامی حکومت قائم ہوئی اور اس نے گفتار کی بجائے کردار سے اسلام اور شریعت کو نافذ کیا تو ان لوگوں نے اول روز سے اس حکومت کی محض یہ کہہ کر مخالفت کی کہ ''طالبان کی پشت پناہی امریکہ کر رہا ہے اور انہیں پاکستان نے بنایا ہے''...... اس بے بنیاد الزام کے سہارے اس طبقے نے ہمیشہ طالبان کے مخالفین کی حمایت کی اور ان کے سرکردہ راہنماؤں نے افغان بحران کو سُلجھانے کی بجائے وقتاً فوقتاً ان کے دشمنوں کے شانہ بشانہ کھڑے ہو کر ان کی کمر تھپتھپانے، انہیں شہہ دینے اور صرف طالبان کی مخالفت کے یک نکاتی فارمولے پر جمع کرنے کی انتھک کوشش اور جدوجہد کی...... اور یہ افسوسناک صورتحال اس وقت تک برقرار رہی جب تک امریکہ نے طالبان کے خلاف باقاعدہ جنگ کا آغاز نہیں کر دیا۔ طالبان کی اسلامی حکومت پر صلیبی یلغار کے بعد بھی اگر ان کی مخالفت جاری رہتی تو کچھ بعید نہ تھا، لیکن اس مرحلہ پر مشکل یہ آن پڑی کہ طالبان کے خلاف اعلان جنگ کرنے والا امریکہ تھا، جسے طالبان کا یہ مخالف طبقہ ہمیشہ سے اپنا ازلی دشمن قرار دیتا آیا تھا۔ چنانچہ اب ''حب علیؓ'' سے بڑھ کر ''بغض معاویہؓ'' کا جذبہ کارفرما تھا جس نے اس طبقہ کو امریکی جارحیت کیخلاف ٹائر جلا کر احتجاج کرنے اور نعرے لگا کر نفرت کا اظہار کرنے پر مجبور کر دیا۔

ایسے طبقے کی طرف سے طالبان کیلئے غایتِ عنایت کے اس اظہار کے باوجود بھی اگر طالبان کی اسلامی حکومت کا خاتمہ ہو گیا تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ''اسلامی'' لیبل لگا کر اسلام پسندی کا دعویٰ کرنے والے اس طبقے کا ایک صحیح اور مخلص اسلامی حکومت کے خاتمے میں نمایاں کردار تھا۔

ممکن ہے ہماری ان باتوں کو تلخی سے پڑھا جائے اور محسوس کیا جائے لیکن سچائی وہ حقیقت ہے جو سو پردوں میں چھپائے نہیں چھپتی چہ جائے کہ اسے ''مصلحت'' کی خاطر ماضی کا افسانہ سمجھ کر بھلا دیا جائے اور مستقبل کیلئے اس سے کوئی سبق حاصل کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔

اس تلخ نوائی کے بعد ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ طالبان کے پس پردہ آئی ایس آئی اور

امریکہ کی پشت کے اس الزام میں کتنی حقیقت ہے اور کتنا افسانہ؟

طالبان اور آئی ایس آئی کے باہمی تعلق کو ثابت کرنے اور یہ باور کرانے کیلئے کہ طالبان کی ابتدائی نشوونما میں پاکستان ملوث رہا ہے ایک واقعہ عام طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۹۴ء کو کوئٹہ سے پاکستان کے سرکاری ادارے این ایل سی کے تیس ٹرکوں پر مشتمل ایک تجارتی قافلہ دوائیں لے کر اسپین بولدک کے راستے افغانستان میں داخل ہوا۔ قافلے کی نگرانی آئی ایس آئی کے کرنل امام کر رہے تھے اور ان کی منزل ترکمانستان کا دارالحکومت اشک آباد تھا، جہاں اس قافلے نے قندھار سے ہوتے ہوئے پہنچنا تھا۔ لیکن قندھار پہنچنے سے پہلے ہی تختہ پل کے مقام پر افغان جنگجوؤں نے اسے روک لیا اور پھر اس قافلے کی بازیابی کیلئے پاکستان نے طالبان کی فوجی مدد کر کے انہیں آگے بڑھایا اور ان کے ذریعے اس تجارتی قافلے کو رہائی دلائی۔ برطانوی مصنف پیٹر مارسڈن اسی مرحلے کو طالبان کا نقطۂ آغاز قرار دیتے ہیں، جبکہ طالبان مخالف مصنف احمد رشید اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے ساتھ یہ کہانی بھی سناتے ہیں کہ پاکستان کے اس تجارتی قافلہ کی آمد سے چند دن قبل ۱۲/ اکتوبر ۱۹۹۴ء کو قندھار اور پاکستان سے آنے والے دو سو طلبہ نے اچانک ہی اسپین بولدک کی فوجی چھاؤنی پر حملہ آور ہو کر موجود حکمت یار کے جنگجوؤں کو مار بھگایا اور خود اسپین بولدک پر قبضہ کر لیا۔ احمد رشید اپنی تحریر کے سیاق و سباق سے یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ طالبان کا اولین ظہور پاکستان کے تجارتی قافلہ کی راہگزر کو محفوظ بنانے کیلئے ہوا لہٰذا یہ کہنا صحیح ہے کہ طالبان کو منظر عام پر لانے میں پاکستانی حکومت اور اس کے خفیہ ادارے آئی ایس آئی کا ہاتھ ملوث تھا۔

پیٹر مارسڈن اور احمد رشید کی یہ باتیں اس حد تک تو صحیح ہیں کہ بین الاقوامی میڈیا اور برادری کے سامنے طالبان انہیں دنوں آئے تھے جب پاکستان کا تجارتی قافلہ افغانستان آیا تھا اور اسے یرغمال بنا لیا گیا تھا، پھر طالبان نے اس قافلے کو رہائی دلائی تھی؟؟ لیکن یہاں اس قسم کے تاثر کی تردید کیلئے اتنی بات ہی کافی ہے کہ یہ تمام حالات ۱۹۹۴ء کے آخر میں پیش آئے تھے جب کہ تحریک طالبان کی ابتداء اس سے کئی ماہ قبل ہو چکی تھی۔ تحریک کا یہ آغاز کب، کیوں اور کیسے ہوا؟ آیئے یہ کہانی احمد رشید ہی کی زبانی سنتے ہیں:

> ''ملا عمر نے طالبان کے چھوٹے سے گروہوں کو کس طرح قندھار کے جنگی سرداروں کے خلاف صف بستہ کیا، اس کے بارے میں اب طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہیں۔ سب سے قابل اعتبار کہانی جو اکثر دہرائی جاتی ہے کہ ۱۹۹۴ء کے موسم بہار میں سنگسیر میں چند پڑوسی انہیں یہ بتانے آئے کہ ایک کمانڈر نے دو

نوعمر لڑکیوں کو اغواء کرلیا ہے، ان کے سر مونڈ دیئے ہیں اور ایک فوجی کیمپ میں لے جا کر ان سے کئی بار بداخلاقی کی ہے۔ ملا عمر نے ۳۰ طلباء کو ساتھ لیا اور اسی حالت میں کہ ان کے پاس صرف سولہ رائفلیں تھیں، فوجی کیمپ پر حملہ کر دیا، لڑکیوں کو چھڑا لیا اور کمانڈر کو جس نے انہیں اغواء کیا تھا اور ان کے ساتھ زیادتی کی تھی، توپ کی نالی کے ساتھ لٹکا کر پھانسی دے دی۔ یہاں سے انہیں خاصی بڑی مقدار اور تعداد میں گولہ بارود اور ہتھیار ہاتھ لگے، بعد میں ملا عمر نے کہا کہ ہم اپنے نام نہاد مسلمانوں کے خلاف لڑ رہے ہیں جو غلط راہ پر چلنے لگے ہیں۔ ہم عورتوں اور غریبوں کے خلاف جرائم ہوتے دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتے۔ چند ماہ بعد قندھار میں دو کمانڈروں میں ایک لڑکے کے سلسلے میں باہم چپقلش اور تصادم کی نوبت آ گئی، دونوں اس سے بداخلاقی کرنا چاہتے تھے۔ اس لڑائی میں کئی شہری ہلاک ہوگئے۔ ملا عمر کے گروپ نے لڑکے کو رہائی دلا دی، اس کے بعد طالبان کو عوام کی طرف سے درخواستیں موصول ہونے لگیں کہ وہ مقامی جھگڑوں سے ان کی جان چھڑائیں۔ ملا عمر ظالم کمانڈروں کے مقابلے میں مظلوم عوام کی حمایت اور مدد کرنے میں ویسا ہی کردار ادا کرنے لگے جس طرز کا کردار ''رابن ہڈ'' سے منسوب ہے۔ ملا عمر جس کسی کی مدد کرتے، اس سے کسی صلے اور ستائش کا تقاضہ نہ کرتے، صرف اتنا کہتے ہیں کہ وہ اسلامی نظام کے قیام میں ان کا ساتھ دیں۔ بے لوثی اور بے ریائی کے سبب سے ان کی شہرت دور دور تک پھیلنے لگی۔ اسی اثناء میں ملا عمر کے معاون اہل کار فوجی کمانڈروں کے اطوار و رجحانات کا جائزہ لیتے رہے، ان کے بعض رفقاء اسماعیل خانؔ سے ملنے ہرات گئے۔''

مندرجہ بالا اقتباس یہ بات سمجھنے کیلئے کافی ہے کہ طالبان تحریک کا نقطۂ آغاز پاکستانی تجارت کے راستے کی ہمواری اور پاکستانی قافلے کی رہائی سے نہیں ہوا، بلکہ ان واقعات سے کافی عرصہ قبل ہی تحریک شروع ہو چکی تھی۔

طالبان کو منظر عام پر لانے اور انہیں فوجی امداد فراہم کرنے میں پاکستانی حکومت یا آئی ایس آئی کا کوئی کردار نہیں رہا۔ یہ حقیقت احمد رشید کی کتاب ''طالبان'' کے مندرجہ ذیل اقتباس سے بھی

واضح طور پر سامنے آتی ہے:

''نصیر اللہ بابر نے طالبان کو آمادہ کرنے کیلئے ۳ ملین ڈالر کے خرچ سے شمالی افغانستان میں چمن سے ترکمانستان کی سرحد پر قدرگنڈی تک سڑک بنانے کی پیش کش کی۔ طالبان نے اسے قبول نہیں کیا۔ وہ وزیر داخلہ نصیر اللہ بابر، جمعیت علمائے اسلام کے سربراہ مولانا فضل الرحمٰن اور آئی ایس آئی کی ذاتی اپیلوں کو بھی خاطر میں نہ لائے۔ طالبان ان سرداروں سے کسی قسم کا علاقہ رکھنے پر تیار نہ ہوئے، جنہیں وہ کمیونسٹ اور بے دین کہتے اور ان کی مذمت کرتے رہے تھے۔''

احمد رشید کا ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

''علاوہ بریں آئی ایس آئی کو طالبان کی صلاحیت کے بارے میں یہی شک تھا، وہ ابھی تک گلبدین حکمت یار کا ساتھ دے رہی تھی۔ اس کے پاس اتنے وسائل بھی نہیں تھے کہ وہ افغان طلباء کی تحریک کی مالی مدد کرسکتی۔''

جنرل رحمت اللہ صافی افغان بحران کے اہم کردار، احمد شاہ مسعود کے خاص مصاحب اور افغانستان کے چیف آف آرمی اسٹاف رہے ہیں۔ وہ اپنی کتاب ''افغانستان سنگہ تباہ شو؟'' (افغانستان کیسے تباہ ہوا؟) میں طالبان اور آئی ایس آئی کے باہمی تعلق کے الزام پر زبردست برہمی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں ان لوگوں سے کہتا ہوں کہ اپنی ناکامیوں اور بے حیائیوں کو چھپانے کیلئے کوئی ایسا بہانہ اور تہمت تلاش کریں جس کا الزام خود ان پر آئے۔ ان لوگوں کا یہ الزام تمام افغان قوم کی تحقیر وتذلیل ہے۔ روس کی ایک لاکھ فوج اپنے جرنیلوں سمیت، کابل کی کمیونسٹ حکومت کی فوج، ہندوستان اور مشرقی یورپی ممالک کے بھرپور تعاون کے باوجود افغان مجاہد قوم کے مقابلے میں شکست کھا گئی۔ ایک کرنل امام کیسے کرسکتا ہے کہ ایران کی مغربی سرحد سے جنوبی افغانستان اور پھر وہاں سے لوگر تک کو برق رفتاری سے فتح کرتا رہے اور افغان قوم کوئی مقابلہ نہ کرسکے۔''

جنرل صافی مزید لکھتے ہیں:

''اگر طالبان خدانخواستہ پاکستان کے کٹھ پتلی ہیں تو پھر میں کہتا ہوں وہ تو دو سالوں سے، ہم خود پانچ سال سے اور پروفیسر ربانی اپنے ساتھیوں سمیت پچیس سالوں سے پاکستانی کٹھ پتلی ہیں۔''

تو پھر طالبان کون تھے؟ اور افغانستان کے ۹۵ فیصد علاقے پر انہیں کیونکر حیرت انگیز فتوحات حاصل ہوئیں؟...... آیئے ان سوالوں کے جواب تلاش کرتے ہیں!

پیٹر مارسڈن لکھتے ہیں:

''طالبان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دینی مدارس کے طالب علم ہیں۔ وہ ۱۹۹۴ء میں اچانک ایک چھوٹے سے گروپ کی شکل میں قندھار میں نمودار ہوئے۔ انہیں مجاہدین کی باہمی لڑائیاں انتہائی ناپسند تھیں۔''

یہ برطانوی مصنف ایک اور جگہ رقمطراز ہیں:

''زیادہ تر شہری اور دیہی آبادی کے جوان اور بزرگ ان پر بھرپور اعتماد کر رہے تھے اور ان کی صفوں میں جوق در جوق شامل ہو رہے تھے۔''

انجینئر گلبدین حکمت یار نامور افغان راہنما ہیں جو تحریک طالبان کی ابتداء سے لیکر ان کی حکومت کے خاتمے تک ان کے مخالف رہے۔ انہوں نے افغان بحران پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ''پٹی توطئی، بربنڈی حیری'' ہے، اس کتاب میں حکمت یار نے طالبان پر خاص برہمی کا اظہار کیا ہے، تاہم اس کے باوجود وہ لکھتے ہیں:

''افغانستان میں تباہی و بربادی اور ظلم و ستم انتہاء کو پہنچ چکا تھا، عوام تنگ آ چکے تھے، طالبان قندھاری اور بعض جہادی تنظیموں کے لوگ تھے۔ عوام نے طالبان کا ساتھ دیا اگر کوئی بھی ایسا کرتا تو عوام ان کا ساتھ دیتے۔''

پیٹر مارسڈن تحریک طالبان کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''طالبان کا تعلق اسلامی ثقافتی دھنک کے کٹر پسند رنگ سے ہے جو افغانستان اور دوسرے ممالک میں اسلامی تحریکوں میں نظر آ تا رہا ہے۔ طالبان کی تحریک کے مقاصد پر ملا وکیل احمد نے جوان کے ترجمان ہیں اپنے ایک انٹرویو میں روشنی ڈالی ہے۔ جو عربی رسالے المجلہ کی ۲۳/اکتوبر ۱۹۹۶ء کی

اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ ان سے سوال کیا گیا تھا کہ تحریک طالبان کیوں اور کیسے شروع ہوئی۔ انہوں نے جواب دیا: ''جب مجاہدین کی جماعتیں ۱۹۹۲ء میں اقتدار میں آئیں تو افغان عوام سمجھے کہ امن بحال ہو جائے گا لیکن انہوں نے آپس میں لڑنا شروع کر دیا۔ بعض علاقائی لیڈروں نے سارے ملک بالخصوص قندھار میں مسلح جتھے بنا کر قتل و غارتگری شروع کر دی۔ چوری اور بدعنوانی عام ہو گئی۔ سڑکیں بند کر دی گئیں۔ خواتین کو بے آبرو کر کے ہلاک کیا گیا۔ اس صورت حال میں دینی مدارس کے بعض طلبہ نے فیصلہ کیا کہ اس کا مقابلہ کیا جائے اور صوبہ قندھار کے عوام کی مشکلات کم کی جائیں۔ چنانچہ ہم نے اپنی مہم کا آغاز کیا اور کئی مراکز فتح کرتے ہوئے قندھار میں داخل ہو گئے۔ علاقائی لیڈر وہاں سے فرار ہو گئے۔''

واقعہ یہ ہے کہ اپریل ۱۹۹۲ء میں سوویت یونین کی حمایت سے قائم شدہ حکومت ختم ہونے کے بعد افغان عوام کو یہ امید ہو گئی تھی کہ ان کے ۱۴ سالہ مصائب ختم ہو جائیں گے اور ایک وسیع البنیاد اسلامی حکومت قائم ہو جائے گی جو امن و انصاف کا پیغام لائے گی۔ مگر ہوا اس کے برعکس۔ مختلف جماعتیں اپنی برتری قائم کرنے کے لئے آپس میں لڑ پڑیں۔ دارالحکومت کابل چار سال تک محاصرے کی حالت میں رہا۔ بموں اور راکٹوں سے سارے شہر کو تہس نہس کیا گیا۔ جنوبی افغانستان میں بھی افراتفری کا عالم تھا۔ راستوں کو بند کر دیا گیا۔ تاجروں کو قدم قدم پر بھتہ اور چنگی ادا کرنی پڑتی تھی...... طالبان کے پیش نظر صرف افغانستان کی اصلاح تھی وہ اپنے نظریات کو دوسروں پر تھوپنا نہیں چاہتے تھے جیسا کہ ملا محمد عمر کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ ان کا مقصد محض یہ ہے کہ افغانستان کو بدعنوان مغرب زدہ موقع پرست لیڈروں سے نجات دلائی جائے۔ جب ہمارے داخلی معاملات ٹھیک ہو جائیں گے پھر ہم خارجہ تعلقات پر نظر ڈالیں گے۔''

تحریکِ طالبان کے آغاز کی کہانی، طالبان راہنماؤں کی زبانی احمد رشید ہمیں ان الفاظ میں سناتے ہیں:

''جن مجاہدین نے نجیب اللہ کی حکومت کے خلاف جنگ کی تھی وہ بعد میں

اپنے گھروں میں واپس چلے گئے یا کوئٹہ اور قندھار کے دینی مدرسوں میں تعلیم مکمل کرنے لگے تھے، ان کیلئے بھی یہ صورتحال بڑی ناگوار اور پریشان کن تھی۔ ملا حسن نے بتایا کہ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ملا عمر، ملا غوث، ملا محمد ربانی اور میں باہم واقف ہیں۔ ہم سب کا تعلق ارزگان صوبے سے ہے اور ہم نے مل کر لڑائی میں حصہ لیا ہے۔ میں کوئٹہ آتا جاتا رہا اور وہاں کے مدرسوں میں پڑھتا رہا۔ ہم جب باہم ملتے تو ڈاکوؤں کے زیر تسلط رہنے والے لوگوں کے مصائب و آلام کے بارے میں بات چیت کرتے، ہم سب ہم خیال تھے۔ ایک دوسرے سے رفاقت کرنے پر آمادہ تھے۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ ہمیں کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہئے۔ طالبان کے یک چشم وزیر خارجہ ملا غلام غوث نے بھی کم وبیش یہی کہا کہ ہم دیر تک بیٹھے غور کرتے رہے کہ اس افسوسناک صورتحال کو کس طرح تبدیل کیا جاسکتا ہے؟ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں؟ کبھی سوچتے کہ ہم ناکام رہیں گے لیکن ہم اتنا جانتے تھے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل ہے۔ ہم یہاں تک اس لیے پہنچ پائے ہیں کہ اللہ نے ہماری مدد کی ہے۔ جنوب کے سبھی مجاہدین انہی مسائل پر غور وفکر کر رہے تھے، سب کسی نہ کسی حل کی تلاش میں تھے۔ وزیر صحت ملا محمد عباس بولے کہ میرا تعلق قندھار سے ۸۵ میل شمال میں صوبہ زابل کے قصبے قلات سے ہے۔ میں نے ایک مدرسے میں داخلہ لے لیا لیکن صورتحال اس درجہ خراب اور افسوسناک تھی کہ ہماری توجہ پڑھنے سے ہٹ گئی۔ دوستوں نے اس پر غور کرنا شروع کیا کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ پہلے مجاہدین امن قائم کرنے میں ناکام رہے ہیں، چند دوستوں کے ساتھ شوریٰ کے اجلاس میں شرکت کیلئے ہرات گیا۔ یہ اجلاس اسماعیل خان نے بلایا تھا۔ اس میں بھی اصلاح احوال کیلئے کوئی حل تجویز نہ کیا جاسکا۔ حالات بدتر ہو رہے تھے۔ ہم ملا عمر سے ملنے قندھار آئے اور ان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرلیا۔ مختلف الخیال لیکن یکساں طور پر تشویش میں مبتلا افراد نے اپنے لیے ایک لائحہ عمل طے کرلیا۔ طالبان آج بھی اسی پر کاربند ہیں، ان کے اہم مقاصد میں امن کا قیام لوگوں کو غیر مسلح کرنا، شرعی قوانین نافذ کرنا،

افغانستان کی سالمیت اور اسلامی کردار اور تشخص کا دفاع کرنا شامل ہے۔ مدرسوں کے کل وقتی یا جز وقتی طلباء ہونے کے ناتے انہوں نے اپنی تنظیم کو طالبان کا نام دیا۔ یہ نام رکھ لینے کے بعد وہ جماعتی سیاست سے کنارہ کش ہو گئے اور اعلان کیا کہ اقتدار حاصل کرنا نہیں بلکہ معاشرے کی اصلاح اور تطہیر کرنا ان کا مقصود ہے۔ ملا محمد عمر کے گرد جمع ہونے والے نوعمر طلباء مجاہدین کے قائدین کی گروہ بندیوں اور مجرمانہ سرگرمیوں سے بیزار تھے۔ یہ مجاہد کبھی واجب الاحترام اور لائق تقلید گردانے جاتے تھے، لیکن اپنی خفیف حرکات کے سبب طالبان کی نظر سے گر گئے۔ طالبان نے چھاپہ مار جنگ کو صحیح رخ پر رکھنے، معاشرتی نظام کی خرابیوں کو دور کرنے اور اسلامی طرز زندگی کو بدعنوانی اور زیادتیوں کے اثرات سے پاک کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔"



طالبان کے بارے میں عام طور پر یہ تاثرات پیش کیے جاتے ہیں کہ ان کی تحریک محض پشتونوں پر مشتمل تھی اور ان کا افغانستان کی دیگر اقوام سے کوئی رشتہ نہ تھا اور نہ ہی اس تحریک میں دیگر اقوام کے افراد کا کوئی خاص کردار تھا۔ اس قسم کی باتیں کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ تحریک طالبان محض ایک قوم پرست تحریک تھی، جو قوم کی بنیاد پر کھڑی ہوئی اور اس نے پشتون افغانوں کی فلاح و بہبود کیلئے کام کیا۔ جو لوگ طالبان پر قومیت پرستی کا الزام عائد کرتے ہیں وہ درحقیقت طالبان کی اسلام پسندی اور شریعت کے نفاذ کے حوالے سے ان کی خدمات کو ثانوی حیثیت دے کر یہ جتلانا چاہتے ہیں کہ قوم پرست پشتون طالبان نے اسلام کا نام محض اپنے غلبے کیلئے استعمال کیا۔

طالبان پر اس الزام کے جواب میں یوں تو بہت سے حقائق پیش کیے جا سکتے ہیں، مثلاً یہ کہ طالبان کی تحریک میں بڑے بڑے عہدوں پر غیر پشتون افراد بھی فائز رہے ہیں، اور یہ کہ طالبان کی مخالفت کرنے والوں میں تقریباً سبھی معروف و مشہور قوم پرست پشتون جماعتیں اور سرکردہ راہنما شامل رہے ہیں، صرف اتنی سی حقیقت اس الزام کی تردید کیلئے کافی ہے، تاہم ہم بعض ایسے حوالے پیش کر رہے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ طالبان محض پشتونوں کی قوم پرست جماعت کا نام نہیں تھا، بلکہ اس تحریک میں ابتداء سے ہی غیر پشتون افغانوں کا عنصر اس حد تک نمایاں رہا کہ اس کی موجودگی سے کسی صورت

انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ملاحظہ فرمایئے چند اہم ثبوت!

پیٹر مارسڈن لکھتے ہیں:

''نسلی اعتبار سے طالبان کی اکثریت پشتون ہے، لیکن ان کا کہنا ہے کہ ہماری تحریک کے دروازے ہر گروہ، نسل اور قوم کیلئے کھلے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ طالبان میں کچھ تعداد غیر پشتونوں کی ہے، البتہ مذہبی اعتبار سے یہ سب سنّی مسلمان ہیں۔''

افغان مؤرخ عبدالحمید مبارز کا کہنا ہے:

''ابتدائی طور پر یہ تحریک درانی اقوام کی معرفت سے مشہور ہوئی، مگر پھر اس نے اپنے آپ کو غلجائی، دیگر پشتون قبائل، پاکستان کے پشتون قبائل، تاجک، ازبک، بلوچ، ہزارہ جات، بدخشانی اور نورستانی اقوام میں پھیلا لیا اور یوں یہ ایک قومی و ملی تحریک بن گئی۔''

عبدالحمید مبارز ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

''اب تک جو کچھ دیکھا گیا ہے، وہ یہی ہے کہ طالبان اپنے بیانات اور پیغامات میں اس موضوع (قوم پرستی) سے بہت زیادہ احتراز کرتے ہیں اور طالبان کی صفوں میں ہزارہ، ازبک، بدخشانی اور شیعوں کی موجودگی اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی تحریک ایک قومی اور ملی تحریک ہے۔''

واضح رہے کہ طالبان کی شمالی افغانستان میں پیش قدمی کے بعد شیعہ ہزارہ جات نے بڑے پیمانے پر طالبان حکومت کو قبول کر لیا تھا اور ان کے کئی سرکردہ راہنماؤں نے قندھار آ کر باقاعدہ امارت اسلامیہ سے وفاداری کا اعلان کیا تھا۔

طالبان کے قوم پرست نہ ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ ان کی حکومت میں کئی اہم عہدیدار غیر قندھاری اور غیر پشتون بھی رہے۔ طالبان مخالف مصنف احمد رشید کی کتاب ''طالبان'' کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

''اس شوریٰ کے دس ارکان میں سے چھ درانی پشتون اور بدخشاں سے ایک تاجک مولوی سید غیاث الدین تھے، وہ طویل عرصے سے پشتون پٹی میں

رہتے چلے آرہے تھے۔ ۱۹۹۸ء میں کابل کی شوریٰ ۱۷ ارکان میں سے آٹھ درانی تھے، پشتونوں کی تعداد دس تھی۔ تین غلزئی اور دو غیر پٹھان ہیں۔ البتہ طالبان نے صوبائی گورنروں کے تقرر میں قدرے لچکدار رویہ اپنایا ہے۔ ۱۹۹۸ء میں گیارہ گورنروں میں سے صرف ۴ قندھاری تھے۔ ماضی میں گورنر اور سینئر افسر بالعموم مقامی معززین میں سے لیے جاتے تھے اور یوں مختلف نسلوں کی نمائندگی کی صورت بیدار ہو جایا کرتی تھی۔ طالبان نے یہ روایت ختم کردی اور تمام اہم عہدوں پر باہر کے لوگ متعین کرنے شروع کردیئے۔ ۲۸ فروری ۱۹۹۵ء کو تحریک طالبان کے امیر نے قندھار سے ایک بیان جاری کرتے ہوئے واضح کیا کہ ”تحریک طالبان اگرچہ پشتون علاقے قندھار سے ابھری ہے لیکن ہمارے ساتھ ترکمن، ازبک، تاجک، فارسی خواں اور پشتو بولنے والے افغانستان کے سب علماء وطلبہ شامل ہیں۔ ہم سب مسلمان اور افغان ہیں۔ ہمارا مقصد امن کا قیام اور شریعت کا نفاذ ہے جس میں تاجک، ازبک اور پشتون کی کوئی تفریق نہیں نہ بیرونی طاقتیں ہماری مدد کر رہی ہیں اور نہ ہمیں اس کی ضرورت ہے کیونکہ ہماری قوم ہمارے ساتھ ہے۔“

☆ ☆

کسی بھی تحریک کی حقیقت واصلیت جاننے کیلئے اس کی قیادت سے شناسائی ضروری ہے، خاص طور پر ان لوگوں کا تعارف اہم ہے، جنہوں نے اس تحریک کی تاسیس اور بنیاد میں نمایاں کردار ادا کیا ہو۔ تحریک اسلامی طالبان کے امیر ملا محمد عمر مجاہد صاحب کے مفصل حالات وسوانح آپ اس کتاب کے ابتدائی اوراق میں ملاحظہ کر چکے ہیں، یہاں ہم بعض ایسی شہادتیں پیش کر رہے ہیں جو ملا محمد عمر اور ان کے رفقائے کار کے تعارف کیلئے خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔

تحریک طالبان کے اولین راہنماؤں میں ملا محمد عمر مجاہد، مولانا محمد ربانی مرحوم، مولانا عبدالجلیل، مولانا محمد حسن رحمانی، ملا داداللہ اخوند، مولوی محمد غوث، ملا عبدالرزاق اخوند، مولوی احسان اللہ احسان شہید، ملا برادر اخوند، ملا خیراللہ خیرخواہ، مولوی وکیل احمد متوکل، ملا مشر شہید، ملا حاجی محمد شہید، مفتی معصوم افغانی، ملا یار محمد شہید، ملا امیر خان متقی، ملا بور جان شہید، مولانا جلال الدین حقانی، ملا قدرت اللہ جمال،

مولوی عبدالحیٔ مطمئن، ملاغنی الیاس اور ملانجم الدین شامل تھے۔

پیٹر مارسڈن ملامحمد عمر مجاہد کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں:

''طالبان کے سب سے بڑے قائد ملامحمد عمر ہیں جنہیں امیر المؤمنین کا لقب دیا گیا ہے۔ سب سے زیادہ بااختیار ادارہ شوریٰ جو قندھار میں ہے۔ اس کی صدارت ملا عمر کرتے ہیں۔ کابل میں ایک چھ رکنی شوریٰ حکومت کرتی ہے۔ تمام فیصلے اتفاق رائے سے کیے جاتے ہیں۔ ملا عمر نہایت پرہیز گار اور سادگی پسند انسان بتائے جاتے ہیں۔ وہ نسلاً پشتون ہیں اور تحریک مجاہدین کے زمانے میں یونس خالص کی حزب اسلامی میں شامل تھے۔ ان کی عمر ۳۵ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ نہایت اعلیٰ درجے کے فوجی کمانڈر ہیں۔ سوویت افواج سے مقابلوں میں ان کی ایک آنکھ ضائع ہوگئی تھی۔ ان کی شخصیت پراسراریت کے پردے میں لپٹی ہوئی ہے۔ وہ نہ تو کسی سرکاری تقریب میں نظر آتے ہیں اور نہ کسی بیرونی مہمان سے ملنا پسند کرتے ہیں۔ سربراہان مملکت یا اقوام متحدہ کے نمائندوں سے ان کے نائبین ملاقات کرتے ہیں۔ ان کا وقت صرف تنظیمی سرگرمیوں اور فوجی حکمت عملیوں میں صرف ہوتا ہے۔''

احمد رشید ملامحمد عمر مجاہد کا تفصیلی تعارف اس طرح کراتے ہیں:

''آج دنیا میں ملا عمر کے سوا شاید ہی کوئی فرد ایسا ہو جس پر رازداری اور اخفاء کا ایسا دبیز پردہ پڑا ہو۔ ان کی عمر ۳۹ برس ہے۔ ان کی کبھی فوٹو نہیں اتری، وہ کبھی کسی مغربی سفارت کار یا صحافی سے نہیں ملے۔ اقوام متحدہ کے کسی نمائندے سے ان کی ملاقات اکتوبر ۱۹۹۸ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت تک طالبان کو سامنے آئے صرف چار برس ہوئے تھے۔ یہ افغانستان سے متعلق اقوام متحدہ کے خصوصی نمائندے الاخضر براہیمی تھے۔ ان سے ملاقات کی وجہ شاید یہ تھی کہ افغانستان کو ایران کی طرف سے تباہ کن حملے کا خدشہ پیدا ہوگیا تھا۔ ملا عمر قندھار میں رہتے ہیں، وہ صرف دوبار کابل گئے، وہ بھی بہت مختصر سے وقفے کیلئے۔ ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنا، افغانوں اور غیر ملکی سفارت کاروں کیلئے ہمہ وقتی مصروفیت

بن گیا ہے۔ ملا عمر ۱۹۵۹ء کے آس پاس قندھار کے قریب کے ایک گاؤں نودہ کے ایک غریب اور بے زمین خاندان میں پیدا ہوئے۔ وہ پشتونوں کی غلزئی شاخ کے ''ہوتک'' قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہوتک قبیلے کے سردار میر ویس نے ۱۷۲۱ء میں ایران کے شہر اصفہان پر قبضہ کیا تھا اور ایران میں پہلی غلزئی افغان سلطنت کی بنیاد رکھی۔ جلد ہی احمد شاہ ابدالی نے اس کی جگہ لے لی...... ۱۹۸۰ء کے عشرے میں ملا عمر کا خاندان نقل مکانی کر کے صوبہ ارزگان کے علاقہ نارن کوٹ چلا گیا۔ یہ بے حد پسماندہ اور دور افتادہ علاقہ ہے، سوویت فوج شاید ہی کبھی یہاں پہنچ پائی ہو۔ ملا عمر نے ابھی نوجوانی میں قدم رکھا تھا کہ ان کے والد وفات پا گئے۔ اب ماں اور دوسرے اہل خانہ کے لئے نان نفقہ کا بندوبست کرنا ان کی ذمہ داری ٹھہری۔ وہ روزگار کی تلاش میں صوبہ قندھار کے ضلع میوند کے گاؤں چلے گئے، جہاں انہوں نے مسجد کی امامت سنبھال لی اور ایک چھوٹا سا مدرسہ کھول لیا۔ ان کی اپنی تعلیم میں دو مرتبہ رخنہ پڑا۔ ایک سوویت فوج کے حملے کے باعث اور دوسرا طالبان کے قیام کے سبب۔ ملا عمر، خالص کی حزب اسلامی میں شامل ہو گئے اور ۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۲ء کے درمیانی عرصے میں کمانڈر نیک محمد کی کمان میں نجیب اللہ کی حکومت کے خلاف مصروف پیکار رہے، وہ چار مرتبہ زخمی ہوئے۔ ایک زخم ان کی دائیں آنکھ میں لگا، جس سے ان کی یہ آنکھ مستقل طور پر ضائع ہو گئی۔ طالبان کی کامیابی کے باوجود سنگسیر کے دوسرے پشتون علاقے آج بھی پسماندہ ہیں۔ یہاں کے گھر مٹی کے بنے ہیں، انہیں مٹی اور بھوسے کے آمیزے سے لیپ کیا جاتا ہے۔ گرداگرد مٹی کی اونچی فصیل کھڑی کر لی جاتی ہے۔ یہ دفاع اور حفاظت کا روایتی پشتون انتظام ہے۔ گاؤں کی گلیاں تنگ اور گرد آلود ہیں، بارش ہو جائے تو کیچڑ سے بھر جاتی ہیں۔ ملا عمر کا مدرسہ آج بھی موجود ہے۔ مٹی کا چھوٹا سا گھروندہ جس کے کچے فرش پر بیٹھنے اور آرام کرنے کیلئے چٹائیاں ڈال دی گئی ہیں۔''

طالبان مخالف مصنف احمد رشید، ملا صاحب موصوف کے بارے میں مزید لکھتے ہیں:

''ملا عمر جس کسی کی مدد کرتے، اس سے کسی صلے اور ستائش کا تقاضا نہ

کرتے، صرف اتنا کہتے کہ وہ اسلامی نظام کے قیام میں ان کا ساتھ دیں۔
بے لوثی اور بے ریائی کے سبب سے ان کی شہرت دور دور تک پھیلنے لگی۔''

ملا صاحب کے بارے میں احمد رشید ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''ملا عمر گھنٹوں جائے نماز پر بیٹھے عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ نماز کے بعد ہی طالبان کی جنگی چالوں کے بارے میں سوچتے اور فیصلے کرتے ہیں۔''

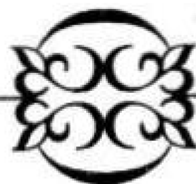
ملا محمد عمر مجاہد کے عزم واستقلال کا اعتراف احمد رشید ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''ملا عمر اپوزیشن یا اقوام متحدہ سے مصالحت کرنے پر تیار نہیں ہوئے۔
ان کا پختہ یقین اور غیر متزلزل عزم کا آخر کار ان کی فوجی فتح کا سبب بنا۔''

طالبان کی قیادت کا اجتماعی نقشہ احمد رشید یوں کھینچتے ہیں:

''طالبان کے قائدین پوری دنیا میں جسمانی طور پر سب سے زیادہ معذور ہیں۔ اس پر انہیں ایک طرح سے فخر بھی ہے۔ دیکھنے والوں کیلئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ ان کی جسمانی معذوری پر افسوس کا اظہار کریں یا ہنس دیں۔ ۱۹۸۹ء میں ملا عمر کی ایک آنکھ ضائع ہوگئی تھی، یہ ان کے قریب ایک راکٹ پھٹنے سے ہوا۔ وزیر انصاف نورالدین ترابی اور سابق وزیر خارجہ محمد غوث کی بھی ایک ایک آنکھ ہے، یعنی یک چشم ہیں۔ کابل کے میئر عبدالمجید کی ایک ٹانگ اور ہاتھ کی دو انگلیاں نہیں ہیں۔ دوسرے لیڈروں کا بھی کچھ یہی حال ہے۔ ان میں بعض فوجی کمانڈر بھی شامل ہیں۔ طالبان کا اصل زخم گزشتہ بیس برس میں پندرہ لاکھ افغان باشندوں کی ہلاکت اور ملک کی ہمہ گیر تباہی ہے۔''

تحریک طالبان کے قائدین اور سرکردہ افراد کے پرانے مخلص اور تجربہ کار مجاہدین ہونے کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ ۹۹۔۱۹۹۸ء تک حکومت کے بیس مرکزی وزراء میں سے چودہ وزراء وہ تھے جو روس کے خلاف جہاد میں جسم کے کسی نہ کسی حصے سے معذور ہو چکے تھے۔



۵

طالبان اور اسلام

مغربی اقوام کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ اہل اسلام کو ہمیشہ دقیانوسیت، قدامت پرستی اور انتہاء پسندی کے طعنے دیتی چلی آئی ہیں اور بدقسمتی سے مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ ان مغربی طعنوں کے ازالہ اور سدباب کیلئے ایسے طریقے اور راستے اختیار کرتا رہا ہے جو اسے اپنے مذہب کے بنیادی اصولوں سے دور لے جاتے چلے گئے۔ آپ عالم اسلام پر بیتنے والی گزشتہ تین چار صدیوں کا جائزہ لیں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ اہل مغرب کے ان نظریاتی حملوں کی زد میں آ کر مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اسلام کی حقیقی تعلیمات کو کھو بیٹھی اور پھر اس نے ایسی ایسی راہیں تراشنی شروع کیں جنہیں وہ اپنی خفت مٹانے کیلئے اور دشمنوں کی زبانیں بند کرنے کیلئے اسلام کا نام دیتی رہی۔ یہ وہ راہیں تھیں جو مشرق و مغرب، اسلام و کفر، نور و ظلمت، علم و جہالت، رحمت و وحشت اور کعبہ و کلیسا کو برابر رکھ کر تلاش کی گئیں اور ان راہوں کو دریافت کرتے ہوئے قرآن و سنت کی پیروی سے زیادہ اہل مغرب کے طعنوں سے بچاؤ اور ''جدید دور کے تقاضوں'' کو مدنظر رکھا گیا۔ یوں کائنات کے سب سے مستند اور باوقار مذہب ''اسلام'' کے مختلف احکام کی ایسی ایسی من گھڑت اور خودساختہ تشریحات سامنے آئیں کہ اگر ایسا بھونڈا انداق کسی اور مذہب کے ساتھ کیا جاتا تو اس کی چولیں ہل کر رہ جاتیں۔
لیکن اسلام چونکہ ایک ایسا دین ہے جس کی حفاظت خود قدرت نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے، اور اس دین نے قیامت تک باقی رہنا ہے، اس لیے تجدد و تشدد کے جس قدر بھی جھکڑ چلے وہ اسلام کے اصولوں کو ذرہ برابر بھی نہیں ہلا سکے۔ چنانچہ گذشتہ چند صدیوں میں عالم اسلام کے جس جس خطے

میں آپ کو ایسے لوگ نظر آئیں گے جو مسلمان کہلاتے ہوئے اصولِ اسلام سے کھیلتے رہے اور انہیں اپنی من مانی تشریحات کے ذریعے داغدار کرنے کی کوشش کرتے رہے، وہیں آپ کو کچھ ایسے نفوس بھی ملیں گے جنہوں نے اغیار کے ستم سہے، اپنوں کے طعنے سنے مگر اس کے باوجود اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کر کے اسلام کی ان حسین و تابندہ روایات و احکام کو زندہ رکھا جو انہیں قرآن و سنت اور اسلافِ امت سے ورثے میں ملے تھے۔

مسلمانوں کی اسی نظریاتی تقسیم نے اہلِ مغرب کو یہ کہنے کا موقع دیا کہ ''بہت سی اسلامی تعلیمات اور احکام ایسے ہیں جن کی مختلف مسلمان مختلف تشریحات کرتے ہیں''۔ یہ بات اس حد تک تو سمجھ میں آتی ہے کہ کئی فروعی مسائل ایسے ہیں جن میں اسلام نے مختلف آراء پیش کی ہیں لیکن چونکہ ان فروع کے اصول ایک ہی ہیں اور ان میں کسی کو اختلاف نہیں تو پھر اسلام کی نظر میں یہ اختلاف بھی زحمت کی بجائے رحمت بن جاتا ہے، مگر جب اختلاف کا دائرہ فروع سے بڑھ کر اصول تک پہنچ جاتا ہے اور مسلمانوں کے بیچ ایسے خطرناک لوگ جنم لینے لگتے ہیں جو مغربی طعنوں سے مغلوب فکر و نظر کے تحت اصولِ اسلام پہ انگشت نمائی، رائے زنی کرتے ہیں اور انہیں مشکوک بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا اپنی حرکتوں سے بذاتِ خود مسلمان ہونا ہی مشکوک ہو جاتا ہے، چہ جائے کہ انہیں مسلم اسکالر اور دانشور قرار دے کر ان کے ہر دیدہ و شنیدہ عمل اور قول کو سند تسلیم کیا جائے اور اہلِ مغرب کو یہ کہنے کا موقع دیا جائے کہ اسلامی احکام متفقہ نہیں۔

ہمارے گرد و پیش میں ایسے افراد، جماعتیں اور حکومتیں بکثرت موجود ہیں جو اپنے آپ کو نہ صرف مسلمان کہتے ہیں بلکہ اس پر اصرار بھی کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر واضح اسلامی احکام کی ایسی ایسی غریب و نادر تشریحات کرتے ہیں جو غیر مسلموں کیلئے تو قابل قبول ہو سکتی ہیں، لیکن اصول اسلام سے نہ صرف یہ کہ میل نہیں کھاتیں، بلکہ متصادم نظر آتی ہیں اور پھر اس سونے پہ سہاگہ یہ ہے کہ ایسے افراد، جماعتیں اور حکومتیں اپنی تشریحات اور ان تشریحات کے مطابق بنائی گئی پالیسیوں کو اس قدر شد و مد کے ساتھ ''اسلامی'' قرار دیتے ہیں کہ اس مرحلے پر عرفِ عام میں انتہا پسند کہلانے والے لوگ بھی ان سے کوسوں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ بلاشبہ ایسے ہی لوگ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے، انہیں آپس میں لڑانے اور دشمنانِ اسلام کو طعنہ زنی کا موقع فراہم کرنے کا باعث بنتے ہیں۔

اس تاریکی میں حقیقت اور سچائی تک پہنچنے کیلئے راہ راست کا یہی اصول ہے کہ ہر اس شخص کے قول وفعل کو اسلام نہیں کہا جاسکتا کہ جو اپنے آپ کو مسلمان کہلاتا ہو اور نہ ہی ہر ایسی حکومت کی پالیسیوں کو اسلامی تعلیمات کا حصہ قرار دیا جاسکتا ہے جس پر اسلام کا لیبل چسپاں ہو، بلکہ اسلام صرف وہی ہے جو قرآن وسنت میں وارد ہوا ہے اور اسلافِ امت سے ثابت ہوا ہے۔ لہذا ہر وہ قول وفعل اور پالیسی جو ان اسلامی اصولوں کے مطابق ہوگی وہ اسلامی تشریحات کا مظہر کہلائے گی اور ہر وہ قول وفعل اور پالیسی جو ان اصولوں سے متفق نہیں ہوگی وہ اسلامی احکام کی تشریح یا اسلامی حکم نہیں کہلائی جاسکتی۔ خواہ ظاہری طور پر اسے اپنانے میں اسلام اور مسلمانوں سے ہمدردی، غلبۂ اسلام، تحفظ مسلمین، مسلمانوں کے سیاسی ومادی فوائد کتنے ہی نظر کیوں نہ آرہے ہوں اور اس دوٹوک مؤقف کی وجہ یہ ہے کہ جیسا کہ ہم پہلے عرض کرچکے ہیں کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے ہمیشہ قائم ودائم رہنا ہے، اور اس کے قیام ودوام کیلئے ضروری ہے کہ یہ مقررہ ومتعینہ اصولوں پر باقی رہے، کیونکہ ہر وہ چیز جسے ٹھوس اصولوں سے ہٹ کر انسانوں کی عقلوں کے حوالے کردیا جاتا ہے وہ بازیچۂ اطفال بن جاتی ہے اور اسے ہر شخص اپنی اپنی عقل کے مطابق اور اپنی خواہشات کے موافق چلانا شروع کردیتا ہے اور یہ صورتحال یقیناً کسی بھی مذہب کا حلیہ بگاڑنے کیلئے کافی ہے، جیسا کہ ہمیں یہودیت اور عیسائیت میں اس کی کھلی مثالیں نظر آتی ہیں۔

ان معروضات کے بعد اب ہم سرسری جائزہ لیتے ہیں کہ طالبان کا اسلام سے تعلق کس نوعیت کا تھا؟ وہ ایک اسلامی حکومت قائم کرنے کے دعووں میں کس قدر سچے تھے اور صحیح اسلامی نقطۂ نگاہ سے ان کی پالیسیوں کو کس حد تک ''اسلامی'' قرار دیا جاسکتا ہے؟

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ طالبان نے اسلامی حکومت قائم کی اور اس میں اسلامی احکام وقوانین نافذ کیے تو اس کا مطلب صرف اور صرف یہ ہوتا ہے کہ طالبان نے ہر قسم کے نفع ونقصان، سود وزیاں اور ظاہری مفادات سے بالاتر اور یکسو ہوکر ایک ایسی حکومت قائم کی جس کی بنیادیں اصول اسلام پر قائم تھیں اور انہوں نے اپنی امارت میں جو قوانین نافذ کیے وہ وہی قوانین تھے جنہیں ہر دور میں علماء اسلام نے شرعی احکام سے تعبیر کیا ہے۔ طالبان اور اسلام کے اس باہمی تعلق کے بارے میں ایک غیر مسلم مصنف پیٹر مارسڈن کی آراء ہمارے لیے خاصی اہمیت کی حامل ہیں، لہٰذا ہم انہیں درج ذیل سطور میں من وعن نقل کررہے ہیں:

''طالبان دوسرے اسلام پسندوں سے اس لحاظ سے مختلف ہیں کہ وہ کسی سیاسی نظریئے کو تخلیق نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ وہ صرف شریعت کے تابع ہیں اور رہنمائی کیلئے علماء کی طرف دیکھتے ہیں۔''

''طالبان کے نظریات پر مزید روشنی اس بیان سے پڑتی ہے جو آواز شریعت ریڈیو سے ۵ نومبر ۱۹۹۶ء کو نشر ہوا۔'' طالبان جو عوام میں سے ابھر کر سامنے آئے ہیں ایک ایسی جدوجہد میں مصروف ہیں جس کے ذریعے وہ اپنے ہم وطنوں کو مشکلات اور مصائب سے نجات دلوا سکیں، ملک میں پھیلا ہوا اسلحہ اکٹھا کر کے امن وسلامتی کو یقینی بنا سکیں، جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ کر سکیں اور افغانستان میں ایک طاقتور اسلامی حکومت قائم کر سکیں''

''افغانستان کے وزیر اطلاعات ملا امیر خان متقی نے ۱۵ نومبر ۱۹۹۶ء کو جمعہ کے خطبہ میں مندرجہ بالا بیان کی یوں توضیح کی کہ ''اسلامی حکومت کے بنیادی ڈھانچے میں کسی قسم کے ظلم، زیادتی، جنگلی پن یا خودغرضی کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ اس کے برخلاف ہمارے قول اور عمل کا مقصد جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت مطہرہ کو عملی اور قانونی شکل دینا ہے۔ طالبان کی اسلامی تحریک نے افغانستان میں ایک ایسی اسلامی ریاست قائم کی جہاں قرآن کریم کی تعلیمات کے مطابق اللہ تعالیٰ کی حکمرانی ہو، جس کی طالبان نے ہمیشہ تبلیغ کی ہے۔ طالبان کا ہر قدم شریعت کے عین مطابق ہے اور جو کچھ کہا ہے اس کو کر کے دکھایا ہے''

غرض طالبان کے نظریات کا بنیادی عنصر یہ ہے کہ افغانستان میں شرعی قوانین کی بنیاد پر اسلامی حکومت قائم کی جائے۔ ان کے خیال میں سابقہ حکومت اسلامی ریاست قائم کرنے میں ناکام رہی تھی حالانکہ اپنی تحریکوں کے دوران اس کے لیڈروں نے یہی وعدہ کیا تھا۔ اس لیے سابقہ حکومت کی جگہ ایک پاک صاف اسلامی حکومت قائم کرنا ناگزیر تھا۔''

اسلامی حدود قائم کرنے کے حوالے سے پیٹر مارسڈن لکھتے ہیں:

''طالبان نے ان سزاؤں پر محدود پیمانے پر عملدرآمد کیا۔ ان کی توجیہہ کرتے ہوئے قائم مقام وزیر خارجہ شیر محمد ستنکزئی نے آواز شریعت ریڈیو سے ۵نومبر ۱۹۹۶ء کو اعلان کیا کہ'' ہم نے شرعی حدود نافذ کر کے ہرات سے جلال آباد اور کابل تک بسنے والے لاکھوں لوگوں کی جانوں کو محفوظ بنادیا ہے۔ اب کسی کی مجال نہیں ہے کہ وہ چوری یا دوسرے جرائم کا ارتکاب کرے۔ ان قوانین کو ہم نے خود ایجاد نہیں کیا ہے بلکہ یہ سزائیں وہ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی تعلیم فرمایا۔ جو لوگ ان سزاؤں کو انسانی حقوق کے خلاف سمجھتے ہیں وہ تمام عالم اسلام اور ان کے عقائد کی توہین کرتے ہیں۔''

۵ دسمبر ۱۹۹۶ء کو ریڈیو صدائے شریعت کابل سے ایک اعلامیہ جاری ہوا، جس کا متن یہ تھا:

''امیر المؤمنین ملا محمد عمر کا پیغام کابل میں مقیم طالبان کے تمام عہدیداران اور کارکنان کے نام۔ کابل کے شہری سالہا سال سے مصائب میں گرفتار ہیں ان کیلئے امن وسلامتی کی فضا پیدا کی جائے۔ قانون کی خلاف ورزی سے ہر حال میں گریز کیا جائے۔ آپ کا ہر عمل شریعت کے مطابق ہونا چاہئے کیونکہ اسی صورت میں اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مسلمان قوم کی اعانت حاصل ہو سکتی ہے۔''

پیٹر مارسڈن طالبان اور مصر کی اسلام پسند تحریک اخوان المسلمون کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''(ان دونوں تنظیموں کے افراد) اسلام کو محض ذاتی معاملہ نہیں سمجھتے بلکہ اسے ایک ایسا نظام سمجھتے ہیں جسے پورے معاشرے پر نافذ کیا جائے اور جو معاشرے کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرے۔ یہ مذہب فرد کے ذاتی رویوں اور فرد اور معاشرے کے درمیان تعلقات کو متعین کرتا ہے۔ اس لیے ریاست کے سیکولر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح مذہب کوئی ذاتی یا نجی چیز نہیں ہے۔ ریاست کو معاشرے کی اجتماعی اسلامی قدروں کی عکاس ہونا چاہئے۔''

''اخوان المسلمون اور طالبان کا موازنہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ دونوں تنظیمیں شریعت کو اعلیٰ ترین ریاستی قانون سمجھتی ہیں۔''

لیبیا اور تحریک طالبان کا تقابل کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''طالبان کی سوچ اس حد تک تو لیبیا سے مطابقت رکھتی ہے کہ افغانستان کو بیرونی اثرات سے پاک رکھا جائے۔ لیکن ان کے خیالات میں سوشلزم کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ وہ سماجی انصاف کے تصور کو زکوٰۃ کے نظام سے ہٹ کر نہیں دیکھتے۔''

طالبان نے اپنا نظام حکومت اسلامی طرز پر قائم کیا، اس حوالے سے طالبان کے ایک ترجمان کا وہ بیان اہم ہے جو انہوں نے عربی رسالے المجلہ کو دیا تھا، پیٹر مارسڈن نے وہ بیان ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

''ہمارے تمام فیصلے امیر المؤمنین کی ہدایت کے مطابق ہوتے ہیں۔ ہمارے لیے مشورہ لازمی نہیں ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ سنت نبوی کے عین مطابق ہے۔ ہم امیر کے فیصلے کے پابند ہیں خواہ یہ فیصلہ انہوں نے تنہا کیا ہو۔ ہمارے یہاں سربراہ مملکت کوئی نہیں ہے۔ صرف امیر المؤمنین ہوتے ہیں۔ ملاّ محمد عمر مقتدر اعلیٰ ہیں۔ اگر وہ کسی فیصلے پر راضی نہیں ہیں تو پھر حکومت اس کو نافذ نہیں کر سکتی۔ عام انتخابات شریعت سے مطابقت نہیں رکھتے اس لیے ہم اس کو مسترد کرتے ہیں۔ اس کے بجائے ہم ممتاز علمائے کرام سے جو چند شرائط پر پورے اترتے ہوں صلاح مشورہ کرتے ہیں۔''

طالبان نے افغانستان میں ایک خالص اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈالتے ہوئے صرف قرآن وحدیث کو پیش نظر رکھا، انہوں نے اس موقع پر کسی بھی دوسرے ''اسلامی'' ملک یا اس کے رائج کردہ نظام کو آئیڈیل بنانے کی کوشش نہیں کی۔ ایک موقع پر جب امیر المؤمنین ملا محمد عمر مجاہد سے پوچھا گیا کہ آپ افغانستان اور ایران وسوڈان وغیرہ کے نظاموں میں کیا فرق پاتے ہیں تو انہوں نے بڑے نپے تلے الفاظ میں جواب دیا کہ:

''ہم دوسری حکومتوں کی طرف نہیں دیکھتے اور نہ ہمیں ان کے بارے

میں زیادہ علم ہے۔"

افغانستان میں اسلامی مقاصد کی ترویج کیلئے طالبان کی کوششوں کے حوالے سے احمد رشید لکھتے ہیں:

"بہرحال طالبان نے اس خطے میں اسلامی مقاصد کی ترویج وتکمیل کی کوششوں کا آغاز کیا ہے۔ شاید یہ اسی کا ردعمل ہے کہ ایران، ترکی، بھارت، روس، وسطی ایشیا کی چار جمہوریتوں ازبکستان، قازقستان، کرغستان اور تاجکستان نے طالبان کے مخالف شمالی اتحاد کو اسلحے اور مالی امداد دینا شروع کردی ہے۔"

احمد رشید ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"ملا عمر نے پاکستانی صحافی رحیم اللہ یوسف زئی سے کہا کہ ہم نے افغان جہاد کے مقاصد پورے کرنے اور عوام کو نام نہاد مجاہدین کے ہاتھوں ظلم وزیادتی کا شکار ہونے سے بچانے کیلئے ہتھیار اٹھائے ہیں۔ ہمارا اللہ پر مکمل ایمان ہے۔ یہ ہم ایک لمحے کیلئے بھی نہیں بھولتے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں فتح سے ہمکنار یا شکست سے دوچار کرسکتا ہے۔"

تحریک طالبان کے اہداف ومقاصد بھی اس تحریک کی اسلام پسندی اور شریعت اسلامیہ سے وابستگی کی بھرپور نشاندہی کرتے ہیں۔ طالبان کے یہ اہداف ومقاصد افغان مؤرخ عبدالحمید مبارز نے مندرجہ ذیل بیان کیے ہیں:

۱۔ایک خالص اسلامی حکومت کا قیام۔

۲۔اسلام کو حکومتی ومملکتی مذہب کے طور پر رائج کرنا۔

۳۔نفاذ شریعت۔

۴۔مساجد کو اس طرح آباد کرنا کہ ملت اسلامیہ ان میں اطمینان وسکون کے ساتھ عبادات ادا کرسکے اور زندگی گزار سکے۔

۵۔سرکاری محکموں میں مخلص مسلمان ملازمین کی تعیناتی۔

۶۔لسانی، قومی اور علاقائی تعصبات وتفرقات کا خاتمہ کرکے ملک کے تمام مسلمانوں میں اسلامی اخوت وبرادری قائم کرنا۔

۷۔اسلامی تنظیموں اور خارجی ممالک سے دوستانہ مراسم قائم کرنا۔

۸۔افغانستان میں رہنے والے غیر مسلموں کی حفاظت کا بندوبست۔

۹۔اسلامی شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے غیر مسلم ممالک کے ساتھ روابط قائم کرنا۔

۱۰۔خواتین کو سرتاپا حجاب پہنا کر مستور کرنا۔

۱۱۔امارت اسلامیہ افغانستان کے تمام علاقوں میں مذہبی پولیس (امر بالمعروف ونہی عن المنکر) کی خدمات جاری کرنا۔

۱۲۔اسلامی عدالتوں کے توسط سے شرعی احکام وقوانین کا اجراء۔

۱۳۔اسلامی امارت افغانستان کو بیرونی جارحیت سے بچانے کیلئے اور اس کے دفاع وحفاظت کیلئے اسلامی فوج کا قیام۔

۱۴۔دینی مدارس قائم کرنا، تاکہ وہاں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ بیرونی کلچر وثقافت کے اثرات سے محفوظ رہیں، ان کے دل قرآن وسنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق سے لبریز ہوجائیں اور وہ اللہ کے راستے کے مجاہد بن جائیں۔

۱۵۔بین الاقوامی سیاست کے پیش آمدہ تمام مسائل کو قرآن وسنت کے مطابق حل کرنا۔

۱۶۔عالم وفاضل، قابل وباصلاحیت افراد میں سے قاضیوں کا تقرر۔

۱۷۔حکومت کے اقتصادی نظام کو اسلامی سانچے میں ڈھالنا اور زراعت وصنعت اور معدنیات کے خزانے حاصل کرنے کیلئے کوشش کرنا۔

۱۸۔افغانستان کی خوشحالی کیلئے اسلامی ممالک سے تعاون حاصل کرنا۔کارخانے اور فیکٹریاں قائم کرنا اور اسلامی مملکت میں اقتصادی بحران کے خاتمے کیلئے زراعت کو فروغ دینا۔

۱۹۔اسلامی محصولات زکوٰۃ، خراج اور جزیہ کا نظام قائم کرنا۔



امر بالمعروف ونہی عن المنکر (نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا) اسلام کی نظر میں انتہائی اہم اور ضروری ہے۔قرآن شریف میں مسلمانوں کو باقاعدہ حکم دیا گیا ہے کہ ان میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے، انہیں نیکی کا حکم دے اور برائیوں سے روکے۔اسلام نے اس شعبے کے قیام پر بہت زیادہ زور دیا ہے اور اس کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے، کیونکہ یہ ایک ایسا دین ہے جو

برائی کو اس کی جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش وسعی کرتا ہے۔ چنانچہ اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کرنے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلام نہ صرف برائیوں کا خاتمہ چاہتا ہے بلکہ اس بُرے ماحول کے بھی انسداد کا حکم دیتا ہے جو برائیوں کو جنم دیتا ہے۔ معاشرے کی اخلاقی حالت استوار کرنے اور اصلاح کا دائرہ افراد سے لیکر اجتماع تک پھیلانے کیلئے اسلامی شریعت نے جو قوانین وضع کیے ہیں، انہیں رائج کرنے سے مسلمان ایک ایسا نظام تشکیل دے سکتے ہیں جو دنیا میں بھی ان کے فلاح و بہبود اور ترقی کا باعث ہوگا اور آخرت میں بھی کامیابی کا ذریعہ۔ جو لوگ اسلامی احکام کی اس روح سے واقف نہیں ہیں یا وہ اہل مغرب کے پروپیگنڈے کا شکار ہو چلے ہیں، انہیں عام طور پر یہ کہتے ہوئے سنا گیا ہے کہ ''عورت کو پردہ کروانا کیا ضروری ہے؟ حیاء تو مردوں کی نگاہوں میں ہونی چاہئے''...... ''داڑھی مسلمان ہونے کی نشانی نہیں، دل میں ایمان اور اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہونی چاہئے''...... ''اسلامی احکام وتعلیمات پر عمل کرنا چاہئے، لیکن اسلامی حکومت کو زبردستی ان پر عملدرآمد نہیں کروانا چاہئے''

ہم ایسا کہنے والوں سے صرف اتنی بات عرض کریں گے کہ اگر دنیا کے کسی ملک کی حکومت یہ قانون بناتی ہے کہ سڑک پر کچرا پھینکنے والے کو پچاس ڈالر جرمانہ کیا جائے گا، کیونکہ وہ ماحول کو گندہ کر رہا ہے، تو ہم اس قانون کو قابل ستائش قرار دیتے ہیں، اگر کوئی حکومت یہ قانون رائج کرتی ہے کہ ٹریفک سگنل کی خلاف ورزی کرنے والا مستوجب سزا ہوگا کیونکہ وہ نظام درہم برہم کر رہا ہے، تو ہم اس قانون کی پابندی کو بطور مثال بیان کرتے ہیں۔ ہم اس ملک اور اس قانون کی تعریف اس لیے کرتے ہیں، کیونکہ یہ نظام سلطنت میں بڑا بگاڑ پیدا کرنے والی چھوٹی چھوٹی خرابیوں کی روک تھام کیلئے اپنایا گیا ہے، لیکن کیا وجہ ہے کہ انسانوں کے بنائے ہوئے ان قوانین سے بڑھ کر بہت سے قوانین ایسے ہیں جو انسانوں کے خالق اور محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتائے ہیں اور ان پر عملدرآمد کا ہمیں حکم دیا ہے، اب اگر کوئی مسلمان حکومت ان قوانین کو نافذ کرتی ہے جبکہ وہ قوانین اس کی معاشرتی ضرورتوں، اقتصادی تقاضوں اور قومی امنگوں سے بھی مکمل ہم آہنگی رکھتے ہیں، تو پھر وہ قابل ملامت کیوں ہے؟ اور اگر اس حکومت کے نافذ کردہ ان قوانین کی کچھ لوگ خلاف ورزی کرتے ہیں اور معاشرے میں بگاڑ اور فساد پھیلانے کا باعث بنتے ہیں اور حکومت انہیں اس جرم کی پاداش میں مناسب سزا دیتی ہے، تو حکومت کے اس اقدام کو ظلم وزیادتی کیونکر گردانا جاسکتا ہے؟

جدید مغربی دنیا نے، جس میں بسنے والوں نے آزادی، آزادی کے نعرے لگا کر اپنے آپ کو

انسانیت، اخلاقیات، معاشرت اور شرم وحیاء کی حدود وقیود سے بھی آزاد کروالیا ہے، ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیا ہے جس کی بہترین مثال شاخ نازک پر بنے آشیاں جیسی ہے، یہ ناپائیدار آشیاں جس طرح ہر وقت اپنا وجود خطرے میں محسوس کرتا ہے، بالکل اسی طرح جدید مغربی تہذیب بھی ہمہ وقت خطرات سے دوچار رہتی ہے۔ اس مغربی تہذیب کے ناخداؤں نے آزادی کی منزل حاصل کرنے کیلئے دوڑتے دوڑتے شرافت کی تمام حدود تو پھلانگ ڈالیں، لیکن اب انہیں شدید احساس ہو رہا ہے کہ وہ آزادی کی بجائے دلدل میں دھنستے چلے جا رہے ہیں۔ ایسی دلدل جو ان کی نسلوں کو بھی جکڑ کر رکھ دے گی۔ چنانچہ اب کوششیں ہو رہی ہیں کہ ایسے قوانین بنائے جائیں جو شراب نوشی کے برے اثرات کی روک تھام کر سکیں، بدکاریوں کے نتیجہ میں بڑھنے والی حرام اولادیں میں کمی کر سکیں، مرد وزن کے آزادانہ میل جول سے ہونے والی عورتوں کے ساتھ زیادتیوں کا سدباب کر سکیں...... وغیرہ وغیرہ...... لیکن اب کیا ہوسکتا ہے جب چڑیا چگ گئی کھیت۔ برائی کو اس کے تمام تر اسباب وذرائع سمیت ختم کرنے کے اسلامی فارمولے پر اہل مغرب جس قدر تنقید کرتے آئے ہیں، اب ان کی اپنے ہاتھوں خود ہی خودکشی کرنے والی تہذیب ان کی بے جا تنقید کا جواب بن کر سامنے آ رہی ہے...... بشرطیکہ کوئی تعصب کی عینک اتار کر دیکھے اور ہوش وخرد کی ناخن سے کام لے۔

طالبان نے اپنی حکومت میں جو قوانین نافذ کیے وہ اسلام کی عطاء کردہ اسی حکمت عملی کے مطابق تھے، اور اس طرز کار کے جو نتائج وثمرات سامنے آئے وہ بھی دنیا نے کھلی آنکھوں سے دیکھے۔ ہم ذیل میں طالبان حکومت کے قائم کردہ شعبہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا ایک اعلامیہ پیش کر رہے ہیں، جو سولہ شقوں پر مشتمل ہے۔ یہ اعلامیہ شعبہ امر بالمعروف کی طرف سے حکومت کے مختلف شعبوں کے ذمہ داروں اور عوامی طبقہ سے تعلق رکھنے والے مختلف حلقوں کے نام لکھا گیا تھا۔

طالبان کے شعبہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا جاری کردہ اعلامیہ یہ ہے:

۱۔ عورتوں کی بے پردگی کے فتنے کے خاتمے کیلئے......

اگر کوئی عورت ایرانی چادر میں (جس سے حجاب کے تقاضے پورے نہیں ہوتے) گھر سے نکلی تو کسی بھی رکشہ یا ٹیکسی والے یا کسی بھی ڈرائیور کو اجازت نہیں ہوگی کہ وہ اسے اپنے ساتھ سوار کرلے، بصورت دیگر اس ڈرائیور کو گرفتار کرلیا جائے گا اور اگر کوئی عورت ایسی حالت میں کہیں سر راہ چلتی پھرتی نظر آئی تو اس کا گھر تلاش کر کے اس کے شوہر کو سزا دی جائے گی اور اگر کوئی عورت

شہوت انگیز لباس پہنے ہوئے ہوگی اور اس کے ساتھ کوئی محرم مرد نہیں ہوگا تو اسے کوئی ڈرائیور اپنے ہمراہ سوار نہیں کر سکے گا۔

۲۔ساز، باجے کی ممانعت کے سلسلہ میں......

تمام ذرائع ابلاغ سے یہ بات نشر کی جائے کہ دکانوں، ہوٹلوں، گاڑیوں اور رکشوں میں گانے بجانے کی کیسٹیں رکھنا ممنوع ہیں۔ پانچ دن تک ادارہ تفتیش اس پابندی کا جائزہ لے گا، اس کے بعد اگر کیسٹ کی کسی دکان سے گانے بجانے کی کیسٹ برآمد ہوئی تو دکاندار کو گرفتار کر لیا جائے گا اور دکان کو تالا لگا دیا جائے گا۔ پھر پانچ افراد کی ضمانت پر دوکاندار کو رہا کر دیا جائے گا اور دکان کھولدی جائے گی۔ اگر کسی گاڑی سے گانے بجانے کی کیسٹ برآمد ہوئی تو گاڑی کا مالک گاڑی سمیت گرفتار کر لیا جائے گا اور پھر پانچ افراد کی ضمانت پر مالک رہا کیا جائے گا اور گاڑی چھوڑ دی جائے گی۔

۳۔ڈاڑھی کٹوانے اور منڈوانے کے سلسلہ میں......

پورے ملک میں یہ اطلاع پہنچادی جائے کہ آج سے ڈیڑھ ماہ بعد جہاں بھی کوئی شخص ڈاڑھی منڈا یا ریش تراش نظر آیا، اسے گرفتار کر لیا جائے گا اور اس وقت تک گرفتار رکھا جائے گا، جب تک کہ اس کی مکمل ڈاڑھی نہیں نکل آتی۔

۴۔ترک نماز کے خاتمے اور بازاروں میں نماز باجماعت کے سلسلہ میں......

ذرائع ابلاغ کے ذریعے ہر جگہ اطلاع پہنچادی جائے کہ نمازیں ہر علاقے میں بروقت ادا کی جائیں، نماز باجماعت کے اوقات شعبہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر مقرر کرے گا۔ اس مقررہ وقت سے پانچ منٹ قبل ٹریفک اور دیگر کاروبار روک دیا جائے گا اور سب لوگ نماز کی تیاری میں مشغول ہو جائیں گے اور تمام افراد کو مساجد میں پہنچنا ضروری ہوگا۔ اوقات مقررہ کے دوران شعبہ امر بالمعروف کے افراد گاڑی میں اس صورتحال کی نگرانی کریں گے۔ اگر کسی دکان میں کوئی بالغ فرد نظر آیا تو اسے گرفتار کر لیا جائے گا اور پانچ افراد کی طرف سے ضمانت ملنے پر رہا کیا جائے گا اور اگر پانچ افراد کی ضمانت نہ ملی تو دس دن بعد رہا کیا جائے گا۔

۵۔کبوتر بازی اور بٹیر بازی کی روک تھام کے سلسلہ میں......

تمام ذرائع ابلاغ سے یہ اعلان کر دیا جائے کہ کبوتر باز اور بٹیر باز دس دن کے اندر اندر اپنے ان مشغلوں سے باز آجائیں۔ دس دن بعد تفتیشی ادارہ نگرانی کرے گا اور مناسب اقدام کرے گا۔ ایسی

صورت میں کبوتر اور بٹیر حلال طریقے سے ذبح کردیئے جائیں گے۔

۶۔منشیات کے خاتمے اور ان کو استعمال کرنے والوں کے بارے میں......

نشہ کرنے والوں کو گرفتار کیا جائے گا، اور تفتیش کرکے منشیات کے مرکز کا پتہ لگایا جائے گا اور منشیات فروش کی دوکان بند کردی جائے گی۔ دکان میں تخریبی مواد اور منشیات کو قبضہ میں لے لیا جائے گا اور مالک اور نشہ کرنے والے، دونوں کو گرفتار کرکے سزا دی جائے گی۔

۷۔پتنگ کی ممانعت کے سلسلہ میں......

پہلے اس حکم کی بھرپور اشاعت کی جائے گی، پھر اس کی قباحت مثلاً جوا، بچوں کی ناگہانی اموات اور بچوں کی تعلیم و تربیت سے محرومی جیسی برائیاں بیان کی جائیں گی، پھر شہر میں جہاں کہیں بھی پتنگ فروشوں کی یا اس کے لوازمات کی دکانیں ملیں گی ان کا سامان ضبط کرلیا جائے گا۔

۸۔بت پرستی کے خاتمے کے سلسلہ میں......

پہلے تمام ذرائع ابلاغ کے ذریعے عام اعلان کردیا جائے کہ تمام گاڑیوں، دکانوں، حجروں اور ہوٹلوں وغیرہ سے جانداروں کی ہر قسم کی تصاویر ختم کردی جائیں۔ اس کے بعد شعبہ امر بالمعروف کے کارکنان مختلف جگہوں پر گھومیں گے اور انہیں جہاں بھی اس قسم کی کوئی ممنوعہ تصویر نظر آئی اسے پھاڑ ڈالیں گے اور اس مکان یا گاڑی کے مالک کو طلب کرکے تنبیہ کی جائے گی تاکہ آئندہ وہ ایسا نہ کرے۔

۹۔جوے کے خاتمے کے سلسلہ میں......

تفتیشی طریق کار سے جوے کے ٹھکانوں کا پتہ لگایا جائے گا، پھر جوے بازوں کو گرفتار کرکے ایک ماہ تک تحویل میں رکھا جائے گا۔

۱۰۔انگریزی، امریکی اور غیر اسلامی بال رکھنے کی ممانعت کے سلسلہ میں......

اس بارے میں تمام ذرائع ابلاغ کے توسط سے یہ اعلان نشر کیا جائے کہ ایسے بال رکھنے کی ممانعت ہے، پھر اس کے بعد بھی اگر ایسے بالوں والے افراد نظر آئیں تو انہیں حراست میں لے کر محکمۂ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے دفاتر میں لایا جائے گا، وہاں حجام ان کے بال تراش دے گا اور حجام کا معاوضہ بطور جرمانہ اس شخص سے وصول کیا جائے گا۔

۱۱۔سودی لین دین کی ممانعت کے سلسلہ میں......

بڑے نوٹوں کے عوض چھوٹے نوٹ لینے (سود) پر اور ہنڈی کے کاروبار کی روک تھام کیلئے تمام

منی چینجروں کو مطلع کیا جائے گا کہ رقوم کے ان تینوں قسم کے تبادلوں پر عائد پابندی کی خلاف ورزی پر مناسب عرصے تک قید کی سزا دی جائے گی۔

۱۲۔نوجوان لڑکیوں کے سرعام کپڑے دھونے کی ممانعت کے سلسلہ میں......

تمام مساجد میں اس بارے میں اعلان نصب کر دیا جائے گا، اور پھر شعبہ امر بالمعروف اس سلسلہ میں کڑی نگرانی کرے گا اور جہاں کہیں نوجوان لڑکیاں سرعام کپڑے دھوتی نظر آئیں انہیں پورے اسلامی آداب واحترام کے ساتھ وہاں سے اٹھا کر ان کے گھروں میں بھیج دیا جائے گا اور ان کے خاندان کے سربراہوں کو سزا دی جائے گی۔

۱۳۔شادی بیاہ کے مواقع پر ناچ ورقص کی ممانعت کے بارے میں......

تمام ذرائع سے یہ منادی کرادی جائے کہ ان منکرات کو ترک کر دیا جائے، اگر کسی گھر کے اندر اس قسم کے کاموں کی خبر ملی تو خاندان کے سربراہ کو حراست میں لے کر سزا دی جائے گی۔

۱۴۔ڈھول بجانے کی ممانعت کے سلسلہ میں......

اولاً علماء کرام کے توسط سے عوام الناس کے سامنے اس کی حرمت بیان کی جائے گی، پھر اس کے مرتکب افراد سے علماء کرام ہی کی رائے کے مطابق باز پرس کی جائے گی۔

۱۵۔عورتوں کے لباس سینے اور ناپ لینے کی ممانعت کے بارے میں......

غیر محرم عورتوں کا لباس سینے اور درزیوں کو ان کا ناپ لینے کی ممانعت ہوگی، دکانوں میں اگر فیشن میگزین پائے گئے تو درزی کو حراست میں لے لیا جائے گا۔

۱۶۔جادوٹونے کی ممانعت کے سلسلہ میں......

جادوٹونے کی کتابیں جلا دی جائیں گی اور ان پر عمل کرنے والوں کو اس وقت تک حراست میں رکھا جائے گا جب تک وہ توبہ نہ کرلیں۔

طالبان کا ایک اور حکم نامہ ملاحظہ کیجیے جو سرکاری ونجی ہسپتالوں اور کلینکوں کیلئے اسلامی شریعت کی روشنی میں شعبہ امر بالمعروف نے امیر المؤمنین کے حکم سے نومبر ۱۹۹۶ء میں جاری کیا:

۱۔عورتیں علاج کیلئے خواتین معالجوں کے پاس جائیں۔اگر کسی مرد معالج کی ضرورت پڑ جائے تو بیمار خاتون اپنے کسی قریبی رشتہ دار کے ساتھ اس کے پاس جائے۔

۲۔مریضہ کے طبی معائنے کے وقت مریضہ اور معالج دونوں شرعی حجاب پہنے رہیں۔

۳۔ بیمار خواتین کی انتظار گاہیں محفوظ طور پر باپردہ ہونی چاہئیں۔

۴۔ بیمار عورتوں کی باری لگانے والی بھی عورت ہونی چاہئے۔

۵۔ رات کو ہسپتال کے جن کمروں میں بیمار عورتیں ہوں، ان میں کوئی مرد ڈاکٹر بلائے بغیر داخل نہیں ہوسکتا۔

۶۔ مرد ڈاکٹروں اور خاتون ڈاکٹروں کے مل بیٹھنے اور باہم گفتگو کرنے کی اجازت نہیں۔ اگر کسی مسئلے پر تبادلۂ خیال ضروری ہو تو حجاب کے ساتھ کیا جائے۔

۷۔ خاتون ڈاکٹر سادہ لباس پہنیں، انہیں بھڑکیلے انداز کے کپڑے پہننے، سرخی پاؤڈر لگانے اور زیب وزیبائش کی اجازت نہیں۔

۸۔ خاتون ڈاکٹر اور نرسوں کو ان کمروں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں جہاں بیمار مرد ہوں گے۔

۹۔ ہسپتال کا عملہ مقررہ اوقات میں مساجد میں نماز ادا کرے گا۔

۱۰۔ شعبہ امر بالمعروف کے افراد کسی وقت بھی معائنے یا کنٹرول کیلئے آسکتے ہیں۔

جو ان احکام کی خلاف ورزی کرے گا اسے اسلامی قوانین کے مطابق سزا دی جائے گی۔

طالبان کے ان حکم ناموں اور ہدایات سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ افغانستان میں ایک خالص اسلامی معاشرہ تشکیل دے رہے تھے۔ ایسا معاشرہ جس میں اللہ تعالیٰ کے حقوق کا بھی پورا پورا لحاظ رکھا گیا تھا اور خلق خدا کے حقوق کا بھی۔ اس موقع پر کہا جاسکتا ہے کہ طالبان کے یہ حکم نامے شرعی احکام سے متعلق ہیں، جبکہ تمدنی معاملات کا ان میں کوئی خاص ذکر نہیں۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ طالبان نے تقریباً تمام تمدنی ومعاشرتی معاملات پر بھی وقتاً فوقتاً احکام جاری کیے اور قوانین نافذ کیے۔ جن کی تفصیلات آپ جابجا اس کتاب میں ملاحظہ کرسکتے ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ طالبان نے تباہ حال افغانستان کو بنانے سنوارنے میں جو عملی کردار ادا کیا، وہ اس امر پر ناقابل تردید دلیل ہے کہ انہیں نا صرف مذہبی اقدار کا پورا پورا لحاظ تھا بلکہ معاشرے کو سنوارنے اور اسے صحیح خطوط پر استوار کرنے کا بھی انہیں پورا پورا اہتمام تھا۔

............☆☆☆............

طالبان کی اسلام کے ساتھ وابستگی کے اس تذکرے کے آخر میں ہم طالبان مخالف مصنف احمد رشید کا ایک اقتباس نقل کرنا چاہتے ہیں جو ایک طرف ان کی طالبان پر برہمی کا

بھرپور اظہار کرتا ہے، جب کہ دوسری طرف طالبان کی اصل کیفیت بھی اس سے واضح ہوتی ہے، بالفاظ دیگر آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہی وہ ''خامیاں'' ہیں، جن کی موجودگی نے طالبان کو مغرب اور مغرب نواز طبقے کی نظر میں قدامت پرست، انتہاپسند اور مذہبی جنونی قرار دیا اور یہی وہ ''خوبیاں'' ہیں جنہوں نے طالبان کو اہل اسلام کی آنکھوں کا تارا بنادیا۔ احمد رشید اپنی کتاب میں رقمطراز ہیں:

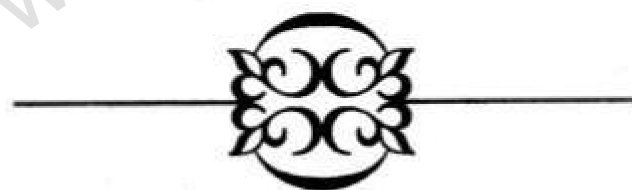
> ''ان کی دلچسپی اور وابستگی اسلام سے ہے۔ وہ اپنے ہر دکھ کا مداوا اور ہر مشکل کا حل اسی میں دیکھتے ہیں۔ اس ضمن سے انہیں گاؤں کے مدرسے اور اس کے استادوں کی باتیں یاد کرتے اور دہراتے رہنے میں سکون ملتا ہے۔ وہ کچھ بھی کرنا نہیں جانتے، وہ اپنے آباءواجداد کے روایتی پیشوں سے بھی نابلد ہیں۔ کاشتکاری کس طرح کی جاتی ہے؟ مویشی کیسے پالے جاتے ہیں؟ دستکاریاں کیسے ہوتی ہیں؟ انہیں کارل مارکس کے بقول، افغانستان کے افکار رفتہ پرولتاری کہا جاسکتا ہے، وہ طالبان کے لیڈروں کی برادری میں خوش دلی سے شامل ہوگئے کیونکہ وہ اور کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ ان میں اکثریت یتیموں کی تھی۔ جنہوں نے ماؤں اور بہنوں اور خالہ زاد اور چچازاد بہنوں کی صورت میں کوئی عورت دیکھی ہی نہیں تھی۔ کچھ نے زندگی مدرسوں میں تعلیم پاتے یا مہاجر کیمپوں میں پرورش پاتے گزاری تھی۔ وہ بھی اس حالت میں کہ وہاں مرد اور عورتیں الگ الگ خانوں میں بٹی ہوئی تھیں۔ کیمپوں میں خواتین رشتہ داروں کے آنے جانے کو بہت محدود کردیا گیا تھا۔ قدامت پسند پشتون قبائلی معاشرے میں دیہات یا خانہ بدوشی کی صورت میں ایک ہی خاندان سے تعلق رکھنے والے قریبی رشتہ دار مرد اور عورتیں آپس میں ملتے جلتے تھے۔ لیکن ان لڑکوں نے بڑی کٹھن زندگی گزاری۔ انہیں عورتوں کی رفاقت کا کچھ پتہ نہیں تھا۔''

ہمیں حیرت ہے کہ ''پڑھے لکھے لوگ'' ان ''گنوار'' لوگوں کو داد وتحسین دینے کیلئے کیوں تیار نہیں جنہوں نے قومیت وتعصب کی آگ میں جلتے ہوئے افغانستان کو امن کا گہوارہ بنادیا، افغان قوم کو سکون

وسلامتی کا پیغام سنایا اور ان کیلئے خوشحالی کے دروازے کھول دیے۔

احمد رشید کا لکھا ہوا یہ پیرایہ پڑھ کر مجھے بار بار کسی بزرگ کا یہ مقولہ یاد آتا ہے کہ "اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہمارے زمانے میں ہوتے تو ہم انہیں دیوانے اور مجنون کہتے اور اگر ہم ان کے دور میں ہوتے تو وہ ہمیں دیکھ کر منافق سمجھتے۔"





۶

طالبان اور حقوقِ نسواں

جن انسانی حقوق کی خلاف ورزی اور تلفی کے حوالے سے طالبان موردِ الزام ٹھہرائے جاتے رہے ہیں، ان میں سب سے اہم اور نمایاں ''حقوق نسواں'' ہیں۔ طالبان کے منظر پر آنے سے لے کر ان کے پس منظر میں جانے تک مغربی ممالک اور ان کے ترجمان ذرائع ابلاغ پوری شدت، تسلسل اور مبالغے کے ساتھ یہ پروپیگنڈہ کرتے رہے ہیں کہ طالبان نے عورتوں پر ظلم وستم کیا ہے، انہیں گھروں میں قید کر دیا ہے، انہیں برقعہ اوڑھنے پر مجبور کیا ہے، ان سے تعلیم اور ملازمت کا حق چھین لیا ہے...... وغیرہ وغیرہ۔

طالبان کے خلاف ان مغربی الزامات کی حقیقت کیا ہے، یہ الزامات کس حد تک درست ہیں اور کتنے غلط؟ ان سوالات کے جوابات جاننے کیلئے ہمیں کسی قدر تفصیل کے ساتھ ماضی کے واقعات، حال کے تقاضوں اور مستقبل کے خدشات کا جائزہ لینا ہوگا۔ اور یہ جائزہ لینا اس لئے بھی ضروری ہے، کیونکہ حقوق نسواں کی تلفی کے حوالے سے مغربی دنیا طالبان پر جو الزامات عائد کرتی رہی ہے، درحقیقت یہ الزامات صرف طالبان کی پالیسیوں ہی سے متعلق نہیں، بلکہ ان کا تعلق براہ راست اسلامی تعلیمات اور عورتوں کے حوالے سے اسلامی شریعت کے احکام سے ہے، اس لئے کہ طالبان نے خواتین کے حوالے سے اپنے دورِ اقتدار میں جو پالیسیاں اور قوانین نافذ کئے، انہوں نے ان کے بارے میں بجا طور پر یہ دعویٰ کیا کہ یہ سب اسلام کے مطابق ہیں اور شریعت ہمیں عورتوں کے حوالے سے ایسے اقدامات کرنے کا ہی حکم دیتی ہے اور پھر طالبان اپنے مؤقف کی حمایت میں افغان معاشرے کی قدیم روایات اور

تقاضوں کو بھی پیش کرتے ہیں، جن کی رو سے طالبان کی صنفی پالیسی کو مزید تقویت ملتی ہے۔

اب ہمیں یہ جاننا ضروری ہے کہ اسلامی شریعت میں عورت کے حقوق واختیارات کیا ہیں؟ افغان معاشرے میں خواتین کی روایتی حیثیت کیا رہی ہے اور افغان خواتین نے ہمیشہ کیسا رہن سہن اپنایا ہے؟ عورت کے بارے میں مغربی ممالک کی پالیسی کیا ہے اور اس پالیسی کے نتائج کیا برآمد ہورہے ہیں؟ ان تمام امور کی وضاحت کے بعد ہم یہ بتائیں گے کہ طالبان نے افغانی خواتین کیلئے کیا روش اختیار کی اور ان کی صنفی پالیسیوں کے کیا نتائج برآمد ہوئے؟

یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ اسلام ایک ایسے دین کا نام ہے، جو مکمل ضابطۂ حیات پیش کرتا ہے۔ یہ دین فرد کی اصلاح بھی کرتا ہے اور معاشرے کی بھی، عبادت کا طریقہ بھی سکھلاتا ہے اور حکومت کا طریقہ بھی، یہ حکمرانی کی حدود بھی بتاتا ہے اور رعایا کے حقوق بھی، یہ مردوں کو ان کے اختیارات سے آگاہ کرتا ہے اور عورتوں کو بھی سربلندی اور عزت عطاء کرتا ہے، یہ بچوں کے حقوق کا محافظ بھی ہے اور غلاموں کے حقوق کا علمبردار بھی، یہ وہ مذہب ہے جو گھر سے لے کر مسجد تک اور بازار سے لے کر دربار تک زندگی کے ہر قدم، ہر مرحلے پر انسان کی راہنمائی کرتا ہے اور اسے عمل کیلئے صحیح اور سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔ اب ایسے مذہب سے یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ اس نے عورتوں کے حقوق کے سلسلہ میں کسی بھی طور پر تنگ نظری یا کوتاہ بینی سے کام لیا ہوگا۔ چنانچہ تاریخی حقائق ہمیں بتاتے ہیں کہ اسلام نے دنیا میں آنے کے بعد عورت کو جو تحفظ، عزت اور مقام دیا ہے وہ دنیا کی کسی دوسری تہذیب یا قوم نے عورت کو نہیں دیا۔

اگر ہم تاریخ کے اس دور میں چلے جائیں، جب دنیا میں یونانی تہذیب کا راج تھا (وہی یونانی تہذیب جو مغربی تہذیب کی ماں سمجھی جاتی ہے) تو اس وقت بھی عورت ایک مظلوم جنس کی حیثیت ہی رکھتی تھی، اور اسے معاشرے کا عضوِ زائد، ناکارہ پرزہ اور ناقابل توجہ حصّہ ہی سمجھا جاتا تھا۔ یونانیوں نے عورت کو برائی کی جڑ قرار دیا تھا۔ ان کے ہاں عورت اپنے باپ کی وارث نہیں بن سکتی تھی۔ اسے خرید وفروخت کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ تعلیم سے اسے کوسوں دور رکھا جاتا تھا۔ شوہر اپنی بیوی کو طلاق دیتا یا اس پر کوئی ظلم ڈھاتا، اس تہذیب کی رو سے عورت کو اس کے سامنے لب احتجاج کھولنے کی اجازت نہ تھی۔ یونانی لوگ اپنی بیوی کو بیوی نہیں، گھر کی رکھوالن اور کنیزوں کی نگران سمجھتے تھے۔ یونان کی قدیم تہذیب میں باپ کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنی بیٹیوں کو فروخت کردے، ایک یونانی شاعر کہتا ہے کہ ''زیوس (دیوتا) نے عورت ایک برائی کی صورت میں انسان کو دی۔'' رومی مفکرین تو سالہا سال تک اسی اختلاف میں پڑے رہے کہ

عورت انسان بھی ہے یا نہیں؟ پھر ایک مجلس میں یہ طے پایا کہ عورت حیوانِ نجس (ناپاک جانور) ہے، جو روح سے خالی ہے، اس کیلئے ہنسنا اور بات کرنا جائز نہیں، اسے چاہئے کہ اپنا منہ بند رکھے۔

اور اگر ہم ماضی کے اس حصے کا جائزہ لیتے ہیں جب جزیرۃ العرب میں اسلام ابھی طلوع نہیں ہوا تھا، تو اس دور میں بھی عورت کی حالت زار انتہائی بدتر نظر آتی ہے۔ اسلام سے پہلے کے دور میں، جسے دورِ جاہلیت بھی کہا جاتا ہے، عورت معاشرے میں انتہائی مظلومیت اور کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ اس دور میں ہر اچھی چیز پر مردوں کا حق اور ہر بری چیز عورتوں کا حصہ سمجھی جاتی تھی۔ عورتوں کو دودھ پینے کی اجازت نہیں تھی۔ اگر کسی کے ہاں بچی پیدا ہوتی تو وہ اسے زندہ ہی زمین میں گاڑھ دیتا تھا۔ ایک عورت کی اجتماعی طور پر بیک وقت کئی مردوں سے شادی کر دی جاتی۔ عورت کو باقاعدہ زنا پر مجبور کیا جاتا۔ عورت کو طلاق دینے کا رواج اس قدر کثرت سے تھا کہ سنگدل مردوں نے اسے ایک کھیل بنالیا تھا۔ اس دور میں عورت کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ کسی چیز کی مالک بنے اور اس پر ملکیت کا دعویٰ کرے۔

ان حالات میں دینِ اسلام عورت کیلئے امن وسکون اور محبت وآشتی کا پیغام بن کر طلوع ہوا۔ اسلام نے عورت پر جو احسانات کئے، اسے جو اعزازات عطاء کئے اور جن انعامات سے نوازا، ان کا شمار چند سطور یا صفحات میں ممکن نہیں، لیکن ان میں سے چند ایک امور کا ذکر یہاں ضروری ہے۔

اسلام نے عورت کو مرد کے مقابلے میں مساوات عطاء کی اور اچھے اور برے ہونے کے لحاظ سے دونوں کو برابر قرار دیا۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

(ترجمہ) ''پس ان کے رب نے ان کی اس درخواست کو منظور کرلیا کہ تم میں سے کسی کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت'' (آل عمران: ۱۹۰)

اس فرمان سے اور اسلام کی دیگر بہت سی تعلیمات سے اندازہ ہوتا ہے کہ عورت درجے اور مقام کے لحاظ سے مرد کے برابر ہے۔ چنانچہ جس طرح مرد کے اچھے یا برے اعمال کا بدلہ اسے ملے گا، بالکل اسی طرح کا معاملہ عورت کے ساتھ بھی ہوگا۔

اسلام نے نوزائیدہ بچیوں کو زندہ درگور کرنے سے سختی سے منع کیا، یوں طبقہ نسواں کو ایک نئی زندگی عطاء ہوئی، اسلام نے بچی کو رحمت قرار دیا۔ اسلام نے عورت کو نفقہ کا مستحق ٹھہرایا، اور اسے فکر معاش سے آزاد کر کے مرد کو حکم دیا کہ وہ اس کی بود و باش کا بندوبست کرے۔ اسلام نے نکاح کا حکم دے کر اور زنا سے منع کر کے عورت کی عزت و آبرو کو تحفظ فراہم کیا۔ اسلامی شریعت کے مطابق عورت نہ صرف اپنے مال کی

مالک ہوسکتی ہے بلکہ اسے اس میں تصرف اور خرچ کا بھی پورا پورا حق حاصل ہے۔ اسلام نے عورت کو شرف عطاء کرتے ہوئے اس کی گواہی کو بھی قابل اعتبار قرار دیا۔ بلکہ بعض مواقع پر تو صرف عورت ہی کی گواہی معتبر سمجھی گئی۔ اسلام نے عورت کو میراث کا مستحق ٹھہرایا، جبکہ اس سے پہلے وہ اس حق سے محروم رکھی گئی تھی۔ اسلام نے عورت کو تحفظ اور پُر اعتماد زندگی فراہم کرنے کیلئے طلاق کے معاملہ میں مردوں کو کڑی تنبیہ کی، چنانچہ طلاق کو انتہائی ناپسندیدہ کام قرار دیا گیا۔ پھر اسلام نے عورت کو بحالت مجبوری اپنے شوہر سے خلاصی کیلئے خلع کا حق بھی دیا، کہ وہ چاہے تو اپنے شوہر سے علیحدگی بھی اختیار کرسکتی ہے۔ اسلام نے عورت کی حفاظت کیلئے اور اس کی عزت و آبرو کو لٹنے سے بچانے کیلئے اسے پردہ کرنے کا حکم دیا، یہ ایک ایسا حکم ہے جس نے عورت کی شخصیت کو محفوظ کردیا اور اس کی عزت کو بلند کردیا۔ غرضیکہ اسلام نے عورت کو اپنی حسین تعلیمات کے ذریعہ ایک قابل صد احترام ماں کا درجہ عطاء کیا، جس کے بیٹے اس کے پیروں تلے جنت کے متلاشی رہتے ہیں۔ اس دین نے عورت کو ایک مقدس بہن کا درجہ بخشا، جس کے تقدس کے پیش نظر اس کے بھائیوں کی نظریں اس کے سامنے شرم وحیاء کی وجہ سے جھکی رہتی ہیں۔ اسلام نے عورت کو ایک محبوب بیوی کا درجہ عطاء کیا، جسے ایک مسلمان شوہر زندگی بھر پیار بھی دیتا ہے، اس کے ناز ونخرے بھی سہتا ہے، نان ونفقہ بھی برداشت کرتا ہے اور گھر کی ملکہ بھی قرار دیتا ہے۔ اسلام عورت کو ایک ایسی بیٹی کا درجہ بھی دیتا ہے، جو پیدائش سے لے کر جوانی تک مسلمان ماں باپ کی نورِ نظر بن کر رہتی ہے، اسے پروردگار کی رحمت قرار دیا جاتا ہے، اور جب وہ جوانی کی دہلیز پر پہنچتی ہے تو اس کے والدین اس کیلئے بہترین رشتہ تلاش کرکے، اسے اپنے خرچ پر، حسبِ استطاعت جہیز دے کر، عزت وتوقیر کے ساتھ آنسوؤں کی لڑیاں نچھاور کرتے ہوئے سسرال کی طرف رخصت کرتے ہیں۔

آپ عورت پر دین اسلام کے ان احسانات کو سامنے رکھیں اور پھر اپنے اردگرد کے معاشرے پر نظر دوڑائیں تو یقیناً آپ کو احساس ہوگا کہ اسلام نے عورت کو کس قدر پاکیزگی، تقدس اور مقام ومرتبہ عطاء کیا ہے۔ لیکن قابل افسوس امر یہ ہے کہ آج مغرب تو دور رہا، خود مسلمانوں کے اندر بہت بڑی تعداد میں ایسے لوگ پیدا ہوگئے ہیں، جو عورت کیلئے نازل شدہ اسلامی احکامات کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور انہیں انسانی حقوق اور آزادیٔ نسواں سے متصادم قرار دیتے ہیں۔ خواتین کے حوالے سے جو اسلامی تعلیمات ان لوگوں کی طعن وتنقید کی زد میں آتی ہیں، ان میں سب سے سرفہرست پردہ کا حکم ہے۔ حالانکہ اسلامی شریعت میں عورت کیلئے پردہ کا حکم انتہائی دوٹوک اور واضح انداز میں دیا گیا ہے اور اسلامی شریعت

کے تمام مستند و قابل اتباع مجتہدین کا اس کی نوعیت واہمیت پر اتفاق رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مغرب سے متاثرہ ذہن رکھنے والے ان لوگوں کے خیال میں پردہ عورت کی غلامی، پسماندگی اور قید کی علامت ہے۔ قابل افسوس یہ ہے کہ ان لوگوں نے کبھی ٹھنڈے دل و دماغ سے یہ نہیں سوچا کہ جس تہذیب سے متاثر ہو کر وہ پردے کو برا بھلا کہتے ہیں، خود اس تہذیب نے بے پردگی کے ہاتھوں کیا کیا رنگ دیکھے ہیں؟ ہم آئندہ سطور میں انہی حقائق کا جائزہ لیں گے۔ لیکن اس سے پہلے یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اس وقت ہمارے درمیان ایک طبقہ ایسا ہے، جو بظاہر اپنے آپ کو اسلام پسند کہلاتا ہے، لیکن پردے کے حوالے سے اس طبقے کے افراد نے بھی اپنی خودساختہ تشریحات اپنا کر اسلام کی حقیقی تعلیمات اور ان پر عمل پیرا ہونے والے طالبان کو نشانہ تنقید بنانے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر جماعت اسلامی پاکستان کے ایک نمائندے نے ایک موقع پر طالبان پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ عورتوں کیلئے برقع کو لازمی قرار دینا اسلام کو منفی انداز میں پیش کرنے کے مترادف ہے۔ جماعت اسلامی کے اس ترجمان کا یہ بیان بظاہر طالبان پر چوٹ کرتا ہے، لیکن حقیقت میں یہ براہ راست اسلام پر زد ہے، کیونکہ جو حکم اسلام نے عورت کو دیا ہے، اگر طالبان نے عورت کو اس پر عمل کرنے کیلئے کہا ہے تو طالبان کا یہ حکم واضح طور پر اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے اور اس پر تنقید کرنا گویا کہ اسلام کی تعلیمات ہی کو ہدف بنانے کے مترادف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے ہی لوگوں کی طرف سے پیش کردہ اسلامی احکامات کی من مانی تشریحات نے مغربی طبقوں کو اسلامی تعلیمات کے خلاف آواز اٹھانے کا موقع فراہم کیا ہے اور پھر جماعت اسلامی کے ایک نمائندے کی طرف سے ایسا بیان اس لئے بھی مضحکہ خیز ہے، کیونکہ بانی جماعت سید ابوالاعلیٰ مودودی خود پردہ کے موضوع پر ایک وقیع کتاب تصنیف کر چکے ہیں۔ ہماری معلومات کے مطابق جماعت اسلامی پاکستان خود بھی خواتین کے پردے کی حامی ہے، اور اس سے تعلق رکھنے والی بیشتر خواتین نقاب کی حد تک پردہ کرتی ہیں، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر پردہ کرنا واقعی ایک مستحسن قدم ہے تو پھر اگر کوئی حکومت سرکاری طور پر اپنے ملک کے معاشرے سے بے پردگی سے پیدا ہونے والے فتنوں کو روکنے کیلئے خواتین کو اس کا حکم دیتی ہے تو اس میں کیا حرج ہے؟ اور پھر اگر کوئی اس حکم کو پامال کر کے معاشرہ میں فساد پھیلانے کی کوشش کرے تو اسے مناسب طور پر تنبیہ کرنے میں کیا مضائقہ ہے؟ یہی وہ سوالات ہیں جو جماعت اسلامی کی اسلام پسندی اور نفاذِ اسلام کے حوالے سے اس کے دعوؤں کو مشکوک قرار دیتے ہیں۔

خواتین کے حوالے سے اسلامی تعلیمات کے بعد ہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ افغان معاشرہ اور

افغانستان کی قومی روایات کے مطابق خواتین کا بود و باش کیسا رہا ہے اور یہ ملک اور اس کی تہذیب وثقافت خواتین سے کن امور کا تقاضہ کرتے ہیں۔ برطانوی مصنف پیٹر مارسڈن افغان معاشرے میں عورت کی حیثیت اور ذمہ داریوں کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''یہاں کی قبائلی روایات میں عورتوں کی ذمہ داریوں میں ان کے بحیثیت ماں اور بیوی کے فرائض کے علاوہ کاشت کاری کے بعض کام، مویشیوں کی دیکھ بھال اور دستکاری شامل ہیں۔ مردوں کے ذمہ کھیتی باڑی کے دیگر کام، بچوں کی نگہداشت اور بازار سے سودا سلف لانا ہوتا ہے۔ عورتوں کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ مذہب اسلام کو اگلی نسل تک پہنچائیں۔ پشتونوں میں عورتوں کا تحفظ معاشرے کے تحفظ سے جڑا ہوا ہے۔ پشتون ولی کے تحت عورت کی عزت معاشرے کی عزت سمجھی جاتی ہے۔ اگر ایک قبیلے کی عورت کی بے حرمتی دوسرے قبیلے والا کردے تو انتقام ناگزیر ہو جاتا ہے۔ افغانستان کے وسطی اور شمالی علاقوں پر وسطی ایشیا کے ملکوں کے کافی اثرات ہیں کیونکہ وہاں کے خاصے باشندے ان علاقوں میں آباد ہیں۔ ترکمان عورتیں بہت کم باہر نکلتی ہیں۔ اسی طرح ہزارہ، ازبک اور تاجک عورتیں بھی ذرا کم ہی نقل وحرکت کرتی ہیں البتہ خانہ بدوش عورتیں آزادانہ گھومتی پھرتی ہیں۔ ان پر کسی پابندی کا اطلاق نہیں ہوتا۔ جہاں تک لباس کا تعلق ہے سارے افغانستان میں خواتین شلوار قمیض پہنتی ہیں البتہ اوپر سے چادر لیتی ہیں۔ بُرقعہ کا رواج شہروں میں زیادہ ہے۔ دیہات کی عورتیں بھی اسے نفاست کی علامت سمجھنے لگیں اس لئے وہاں بھی بُرقعہ کا استعمال بڑھ گیا۔ افغانستان کے جنوبی صوبوں میں بُرقعہ کا رواج زیادہ پایا جاتا ہے اور شمال میں کم ہے۔''

پیٹر مارسڈن کی بیان کردہ ان تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ افغان معاشرے میں عورت کی تقریباً وہی حیثیت رہی ہے، جو اسلام نے اس صنف نازک کو دی ہے، تاہم کچھ ایسی باتیں اس معاشرے میں بھی بہر حال موجود تھیں، جو اسلامی تعلیمات سے متصادم تھیں، ایسی رسومات اور روایات کو طالبان نے آکر ختم کر دیا اور معاشرے کو صحیح اسلامی رخ پر ڈال دیا۔ مثال کے طور پر طالبان سے قبل افغان معاشرے میں

عورت کو دیت، ہرجانے اور صلح وغیرہ کے عوض دینے کا رواج تھا، اسی طرح یہ بھی تھا کہ اگر عورت کا شوہر مرجاتا تو اس عورت کو سسرال ہی میں دوسری شادی پر مجبور کیا جاتا، یہ رسم ورواج سراسر حقوقِ نسواں کے خلاف تھے، چنانچہ طالبان نے ان کا خاتمہ کیا اور اس بارے میں مندرجہ ذیل حکم جاری کیا:

''جیسا کہ شریعت میں عورت کی عزت وعصمت کے مستقل حقوق ہیں جن پر عمل پیرا ہونے سے عورت کی عزت وعصمت محفوظ رہتی ہے، مگر افغان معاشرے میں بے انصافی پر مبنی غیر شرعی رسم ورواج کے تحت عورت اپنے حقوق سے محروم اور مختلف مظالم کا شکار ہے۔ اس قسم کے مظالم کے سد باب کیلئے مندرجہ ذیل دفعات منظور کی جاتی ہیں:

(۱)......ملک کا کوئی بھی شخص عورت کو دیت، ہرجانہ اور صلح وغیرہ میں ہرگز نہیں دے سکتا۔

(۲)......(الف) کسی بھی مسلمان کو اجازت نہیں کہ بیوہ عورت کو خاوند سے گھرانے ہی میں نکاح کرنے پر مجبور کرے۔

(ب) شرعی اصول کے مطابق بیوہ اپنی مرضی سے نکاح کرسکتی ہے۔

(۳)......امارت اسلامیہ کے ججوں اور ذمہ داروں کو اجازت ہے کہ درج بالا دفعات کی خلاف ورزی پر سخت سزا دیں۔

اب ہم مختصر طور پر پھر یہ ذکر کریں گے کہ وہ مغربی ممالک جن کی طرف سے طالبان ہمیشہ ہی حقوق نسواں کے حوالے سے موردِ الزام ٹھہرائے جاتے رہے ہیں۔ خود ان میں ''آزادیٔ نسواں'' کی کیفیت کیا ہے؟ ان حقائق کو پڑھ کر ایک تو آپ کے سامنے مغربی دنیا کے چہرے کی دورخی واضح ہوگی، کہ جو ممالک طالبان کو عورتوں کے حقوق کی خلاف ورزی کا طعنہ دے رہے ہیں، خود وہاں کی عورتیں کیسی زندگیاں گذار رہی ہیں ان حقائق کیلئے پڑھ کر آپ کو یہ اندازہ لگانا بھی دشوار نہیں رہے گا کہ طالبان نے خواتین کے حوالے سے جو قوانین نافذ کئے اور جو پالیسیاں اختیار کیں، وہ اس دور کے تقاضوں کے لحاظ سے درست تھیں یا غلط؟

۱۹۸۷ء میں، امریکہ میں تیار ہونے والی ایک سروے رپورٹ کے مطابق ۷۹ فیصد امریکی مرد عورتوں کو زدوکوب کرتے ہیں، خاص کر اپنی بیویوں کو۔ اس رپورٹ کے مطابق امریکہ میں بیویوں کو

مارنے پیٹنے کا رجحان بہت زیادہ پایا جاتا ہے، خاص طور پر یونیورسٹی کے طلباء میں۔ایک اور رپورٹ کے مطابق امریکی اسپتالوں کے ایمرجنسی وارڈ میں جو عورتیں علاج کیلئے لائی جاتی ہیں۔ان میں سے ۱۷ فیصد ایسی ہوتی ہیں جنہیں ان کے شوہروں یا بوائے فرینڈز نے مار پیٹ کر زخمی کیا ہوتا ہے اور باقی ۸۳ فیصد عورتیں بھی کم از کم ایک مرتبہ ایسے زخموں کے علاج کیلئے ضرور اسپتال آتی ہیں۔''ایون اسٹاک'' نامی امریکی صحافی خاتون نے ایک رپورٹ تیار کی جس میں نفسیاتی اسپتالوں میں آنے والی مریض عورتوں کے ۱۳۶۰ ریکارڈز چیک کرنے کے بعد بتایا گیا کہ دیگر حادثات میں زخمی ہونے والی عورتوں کی نسبت ان بدقسمت عورتوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے جو مردوں کے ہاتھوں مار کھا کھا کر نفسیاتی مریضہ بن جاتی ہیں، یا زخمی ہو جاتی ہیں۔ایک اور امریکی محقق خاتون ''جینس مور'' کا کہنا ہے کہ یہ ٹریجڈی امریکہ میں خطرناک حدوں کو چھو رہی ہے۔لیکن امریکہ کا کوئی بھی حصہ ان مردوں سے خالی نہیں جو اپنی عورتوں کو بری طرح مارتے ہیں جس کے نتیجے میں علاج کیلئے ہزاروں عورتوں کو اسپتال میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ اس مار پیٹ کے نتیجے میں عورتوں کو مختلف قسم کی چوٹیں آتی ہیں۔جیسے آنکھوں کے گرد نیل کے نشانات، ہڈی میں فریکچر، جلنے کے نشانات، خنجر زنی اور فائرنگ کے نتیجے میں آنے والے زخم اور لوہے، لکڑی کی ضرب سے وجود میں آنے والی مختلف قسم کی چوٹیں۔جینس مور کے مطابق امریکہ میں ہر سال تقریباً ساٹھ لاکھ عورتیں اپنے گھروں میں مار پیٹ کا شکار ہوتی ہیں۔

جرمنی کی ایک رپورٹ کے مطابق ہر سال تقریباً ایک لاکھ جرمن عورتیں اپنے شوہروں اور بوائے فرینڈز کی جسمانی اور نفسیاتی اذیت کا شکار بنتی ہیں۔بعض محققین ایسی بدنصیب جرمن عورتوں کی تعداد دس لاکھ تک بتاتے ہیں۔

فرانس میں ہر سال بیس لاکھ عورتیں مار پیٹ اور تشدد کا نشانہ بنتی ہیں جس کے بارے میں فرانسیسی پولیس کا کہنا ہے کہ یہ واقعات فرانس کے تقریباً ۱۰ فیصد خاندانوں میں پیش آتے ہیں۔حقوق نسواں کے تحفظ کی علم بردار فرانسیسی خاتون ''میشل آندرے'' کا کہنا ہے کہ یہاں پر جانوروں کے ساتھ عورتوں سے زیادہ اچھا برتاؤ ہوتا ہے کیونکہ مثال کے طور پر یہاں اگر کسی آدمی نے سڑک پر کسی کتے کی پٹائی کر دی اور اسے مارا تو کوئی نہ کوئی شخص ضرور اس معاملہ سے متعلق ذمہ دار افراد کے پاس شکایت لیکر پہنچ جاتا ہے۔جبکہ برخلاف اس کے، اگر سڑک پر کوئی آدمی اپنی بیوی کو مارتا نظر آجائے تو کوئی نظر اٹھا کر دیکھنے تک کی زحمت نہیں کرتا، کوئی کارروائی کرنا تو دور کی بات ہے۔فرانس کے متعلق ایک رپورٹ میں، جو

فرانسیسی پولیس کے تعاون سے تیار کی گئی، بتایا گیا کہ فرانس میں مار پیٹ اور تشدد کے ۹۳ فیصد واقعات میاں بیوی کے درمیان پیش آتے ہیں۔

برطانیہ میں کیئے گئے ایک سروے کی رپورٹ کے مطابق عورتوں کے خلاف تشدد کے واقعات ایسے ہوتے ہیں جن میں شوہر اپنی بیویوں کو بغیر کسی معقول وجہ سے مارتے ہیں۔ اسی رپورٹ کے مطابق ایک عورت نے بیان دیا کہ اس کی شادی کو ساڑھے تین سال ہو چکے ہیں اور وہ تقریباً ہر روز اپنے شوہر کے ہاتھوں پٹتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اگر میں کسی قسم کا احتجاج کرتی ہوں تو وہ مجھے پھر مارتا ہے، لہٰذا مجھے خاموشی میں ہی عافیت محسوس ہوتی ہے اور وہ مجھے مارنے کیلئے مختلف طریقے آزماتا ہے۔ کبھی طمانچے، تو کبھی لاتیں اور گھونسے اور کبھی میرا سر دیوار سے دے مارتا ہے۔ اس طرح تشدد کے نتیجے میں کئی عورتوں کی پسلیاں ٹوٹ چکی ہیں۔ بعض مرد تو اتنے جنونی ہوتے ہیں کہ وہ مار پیٹ کے دوران اپنی بیویوں کی گردن پکڑ کر اس پر اتنا دباؤ ڈالتے ہیں کہ اس کا دم گھٹ جاتا ہے اور بعض اپنی بیویوں کے جسم کو سگریٹ سے داغتے ہیں اور مزہ لیتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنی بیویوں کو زنجیروں سے جکڑ کر کمرے میں بند کر دیتے ہیں۔

کینیڈا میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ شوہر ایسے ہیں جو اپنی بیویوں کو مارتے ہیں اور ملک کے اجتماعی اور ثقافتی مرکز ان واقعات کو اپنے ملک کیلئے بدنما داغ گردانتے ہیں۔

یہ چند ادنیٰ سی جھلکیاں ہیں، اس مغربی دنیا میں بسنے والی خواتین کی حالتِ زار کی، جو حقوق نسواں اور آزادئ نسواں کی سب سے بڑی علمبردار کہلاتی ہے۔ ان حقائق کو پڑھ کر جہاں ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی دنیا میں عورت کی آزادی کی کیفیت کیا ہے۔ وہاں ہمیں یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ مغربی عورت کو اس قدر بدتر انجام تک پہنچانے میں سب سے اہم کردار ''تہذیب جدید'' کا ہے، جس نے عورت کو آزادی، ملازمت، تعلیم اور ترقی کے سبز باغات دکھا کر بے پردہ کیا، اور اس سے اس کی عصمت، عفت اور عزت گویا کہ سب کچھ چھین لیا۔

یہاں اس حقیقت کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ اسلام کی حسین تعلیمات کی بنیاد یہ ہے، کہ وہ فرد اور معاشرہ دونوں کی اصلاح چاہتا ہے، جبکہ مغربی تہذیب صرف اور صرف فرد کو آزادی فراہم کرنے کی خواہشمند ہے۔ پھر اس آزادی کے نتائج کیا نکلتے ہیں؟ مغربی تہذیب کی بنیادیں استوار کرنے میں اس امر کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اپنے پیروکاروں کو ایسے ہر کام سے رکنے کا حکم دیتا ہے، جو بظاہر برے نہ ہوں، لیکن برائی کی طرف لیجاتے ہوں، جبکہ مغربی تہذیب فرد کی آزادی کے حق کے نام پر اسے

کسی بھی کام سے یہ سوچ کر نہیں روکتی کہ یہ کام بُرا ہے یا برائی کی طرف لیجاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک صحیح مسلم معاشرے میں برائی کا ذریعہ بننے والے کام بھی ممنوع قرار پاتے ہیں، اور مغربی دنیا میں برائیوں کے عام طور پر پھیل جانے کے بعد ان کے نتائج کی روک تھام کی بے سود کوششیں کی جاتی ہیں۔ جیسا کہ آج کئی مغربی ممالک میں حرام طور پر پیدا ہونے والے بچوں کی تعداد میں کمی کرنے اور شراب نوشی و ہم جنس پرستی جیسے جرائم پر قابو پانے کیلئے سر توڑ جد وجہد کی جارہی ہے، مگر یہ سب محنت بے فائدہ نظر آتی ہے، کیونکہ مغربی دنیا اب بھی اسی تہذیب کی پیروکار بلکہ داعی ہے، جس نے انہیں یہ بُرے دن دکھائے ہیں۔

یہاں یہ امر بھی ضروری ہے کہ اس بات کی وضاحت کردی جائے کہ طالبان کے ظہور سے قبل افغان عورت کیسی زندگی بسر کر رہی تھی، اور افغانستان میں خواتین کن حالات سے دوچار تھیں؟ مشہور طالبان مخالف مصنف احمد رشید اپنی کتاب ''طالبان'' میں لکھتے ہیں:

> ''بہر حال افغان عورتوں اور افغان معاشرے کی بدحالی، طالبان کے آنے سے پہلے شروع ہوچکی تھی۔ بیس برس کی مسلسل جنگ نے افغان معاشرے کو مسخ کر کے رکھ دیا تھا۔ نسلی برادری اور خاندانی ڈھانچہ جو مصیبت اور اقتصادی شدائد سے بچانے کا وسیلہ بنتا تھا، تباہ ہوگیا تھا۔ افغانستان انسانی احوال کے حوالے سے دنیا کا سب سے مفلوک الحال ملک بن گیا۔ ایک ہزار نوزائیدہ بچوں میں سے ۱۶۳ زندہ نہیں بچتے، ۱۸ فیصد کی یہ شرح دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے۔ دوسرے ترقی پذیر ملکوں میں شرح ۱۰۰۰ میں سے ۷۰ ہے۔ ایک چوتھائی بچے پانچ برس کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں۔ ترقی پذیر ملکوں میں یہ تناسب ایک اور دس کا ہے۔ ایک لاکھ عورتوں میں سے ۱۷۰۰ زچگی کے دوران ہی موت کے منہ کا نوالہ بن جاتی ہیں۔ مرد اور عورتیں بمشکل ۴۳، ۴۴ برس کی عمر کو پہنچ پاتے ہیں۔ جبکہ دوسرے ترقی پذیر ملکوں میں مردوں اور عورتوں کی اوسط عمر ۶۱ برس ہے۔ ۲۹ فیصد لوگوں کو طبی امداد، ۱۲ فیصد کو پینے کا صاف پانی میسر ہے۔ ترقی پذیر ملکوں میں یہ تناسب ۸۰ اور ۷۰ کا ہے۔ بچوں کی اموات کا سبب خسرہ اور اسہال ایسی بیماریاں ہیں، جن کا با آسانی علاج بھی ہوسکتا ہے اور جن سے مناسب پرہیز سے بچا بھی جاسکتا ہے۔ لیکن یہاں طبی امداد کا انتظام

ہے اور نہ ہی صاف پانی میسر ہے، اس لئے بچوں کی شرح اموات اتنی زیادہ ہے۔ طالبان کے آنے سے پہلے ۹۰ فیصد لڑکیوں اور ۶۰ فیصد لڑکوں کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ دیہی علاقوں میں حالت اور بھی ابتر تھی۔''

احمد رشید نے اسی کتاب میں طالبان کی آمد سے پہلے افغانستان کی صورتحال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس دور میں افغانستان کے جنگی سردار من مانیاں کرتے تھے، وہ اپنی جنسی اور نفسیاتی تسکین کیلئے نوجوان لڑکیاں اور لڑکے اغوا کر لیتے تھے۔

ایک اور طالبان مخالف مغربی مصنفہ کرسٹینا لیمب اپنی کتاب ''طالبان کا افغانستان'' میں اس صورتحال کا تجزیہ ان الفاظ میں کرتی ہے:

''اس سے بھی بڑی مصیبت جبری عصمت دری کے واقعات تھے۔ کوئی بھی اپنے گھر میں سکون کی نیند نہیں سو سکتا تھا۔ نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کو جبراً اٹھا لیا جاتا تھا اور ان سے انسانیت سوز سلوک کیا جاتا تھا۔ بہت سے لوگوں نے خوفزدہ ہو کر بچوں کو اسکول بھیجنا بند کر دیا تھا۔''

ان تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ طالبان کے ظہور سے قبل افغان عورت انتہائی کسمپرسی کی زندگی گزار رہی تھی اور اس دور میں اسے جان و مال اور عزت و آبرو کا کوئی تحفظ حاصل نہیں تھا۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس دور میں بین الاقوامی ذرائع ابلاغ، میڈیا اور مغربی ممالک نے افغان عورت کے حقوق و تحفظ کیلئے نہ کوئی آواز اٹھائی اور نہ ہی افغانستان کی تباہ حال عورت کی حالت سدھارنے کیلئے کوئی اقدامات کئے گئے، اس کے برعکس جب طالبان نے منظر عام پر آنے کے بعد عورت کو تحفظ اور عزت فراہم کی، تو افسوسناک طور پر مغربی دنیا نے طالبان کی ان پالیسیوں اور اقدامات کو سراہنے کی بجائے نشانۂ تنقید بنانا شروع کر دیا۔ مغربی ممالک کا یہ رویہ ایک درمیانی سوچ رکھنے والے ذہن میں بھی ان کے کردار کے حوالے سے بہت سے شکوک و شبہات کو جنم دیتا ہے۔

آیئے! اب ہم طالبان کے ان اقدامات کا جائزہ لیتے ہیں جو انہوں نے خواتین کے حوالے سے کئے، اور وہ پالیسیاں اور قوانین جو ان کی حکومت نے عورتوں کیلئے جاری کیں۔

یہ ایک حیرت انگیز مگر خوشگوار حقیقت ہے کہ مغربی دنیا جن طالبان کو حقوق نسواں کے غاصب اور عورتوں کے دشمن قرار دیتی رہی ہے، ان کی تحریک کے ابتدائی ظہور کی بنیاد ہی عورت کے تحفظ کیلئے جنگ

تھی۔تحریک طالبان کے منظر عام پر آنے کے ایسے تو بہت سے عوامل بیان کیے جا سکتے ہیں، لیکن طالبان کی سب سے پہلی جنگی کارروائی کا سبب جو واقعہ بنا تھا، اسکی تفصیلات احمد رشید کے الفاظ میں یہ ہیں:

''ملا عمر نے طالبان کے چھوٹے سے گروہوں کو کس طرح قندھار کے جنگی سرداروں کے خلاف صف بستہ کیا، اس کے بارے میں اب طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہیں۔سب سے قابل اعتبار کہانی جو اکثر دہرائی جاتی ہے یہ ہے کہ ۱۹۹۴ء کے موسم بہار میں سنگسیر میں چند پڑوسی انہیں یہ بتانے آئے کہ ایک کمانڈر نے دو نوعمر لڑکیوں کو اغوا کر لیا ہے، ان کے سر مونڈ دیئے ہیں اور ایک فوجی کیمپ میں لے جا کر ان سے کئی بار بداخلاقی کی ہے۔ ملا عمر نے ۳۰ طلبا کو ساتھ لیا اور اسی حالت میں کہ ان کے پاس صرف سولہ رائفلیں تھیں، فوجی کیمپ پر حملہ کر دیا، لڑکیوں کو چھڑا لیا اور کمانڈر کو جس نے انہیں اغواء کیا تھا اور ان کے ساتھ زیادتی کی تھی، توپ کی نالی کے ساتھ لٹکا کر پھانسی دے دی۔ یہاں سے انہیں خاصی بڑی مقدار اور تعداد میں گولہ بارود اور ہتھیار ہاتھ لگے، بعد میں ملا عمر نے کہا کہ ہم ایسے نام نہاد مسلمانوں کے خلاف لڑ رہے ہیں جو غلط راہ پر چلنے لگے ہیں۔ ہم عورتوں اور غریبوں کے خلاف جرائم ہوتے دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتے۔''

یہی واقعہ کرسٹینا لیمب نے بھی ''طالبان کے افغانستان'' میں ذکر کیا ہے۔

اسی دور کا ایک اور واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ قندہار کے نواح میں ایک شخص کی بیوی دردِ زہ میں مبتلا تھی، انتہائی ہنگامی صورتحال میں وہ شخص اسے رات کے وقت شہر کے کسی اسپتال میں لے جا رہا تھا کہ راستے میں پھاٹک لگا کر بیٹھے ہوئے ایک جنگی سردار کے اہلکاروں نے اسے روک لیا، اور پھر جب اس سردار کو صورتحال کا پتہ چلا تو اس نے زبردستی کر کے اس مجبور عورت کو گاڑی سے اتار کر اپنے پاس ٹھہرا لیا۔ اس سنگدل شخص کا کہنا تھا کہ اس نے کبھی بچے کی پیدائش کا منظر نہیں دیکھا، لہٰذا وہ آج یہ منظر دیکھنا چاہتا ہے۔ پھر اس نے ایسا ہی کیا، لیکن صبح ہونے سے پہلے ہی وہ عورت اور اس کا نوزائیدہ بچہ دم توڑ چکے تھے۔ مظلوم عورت کا بے بس شوہر امداد کا طالب بن کر ملا محمد عمر کے پاس آیا، اور انہوں نے اس پر ہونے والے ظلم کے جواب میں اس جنگی سردار کے خلاف اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر کارروائی کی۔ اس جنگی کمانڈر کا نام فتح علی تھا۔

ایسے ہی واقعات کا سدباب کرنے کیلیۓ طالبان نے جب قندھار شہر پر باقاعدہ قبضہ کرلیا، تو انہوں نے شہر کی عوام کیلیۓ جو اصلاحی اعلانات اور ہدایات جاری کیں، ان میں عورتوں سے کہا گیا کہ وہ گھروں سے برقع پہن کر نکلا کریں۔ طالبان کا مؤقف یہ تھا کہ عورت کے بے پردہ ہو کر گھر سے نکلنے سے نہ صرف یہ کہ اسلامی احکامات پامال ہوتے ہیں، بلکہ ان سے معاشرے میں ایسا فساد بھی جنم لیتا ہے جو مذکورہ بالا افسوسناک واقعات کے رونما ہونے کا باعث بنتا ہے۔ طالبان کی طرف سے خواتین کیلیۓ پردہ کرنے کا حکم چونکہ افغان روایات کے بھی عین مطابق تھا، چنانچہ عوامی سطح پر اسے قبول کیا گیا اور خواتین نے اس کا پورے طور پر اہتمام کیا۔ لیکن دوسری جانب مغربی حلقوں میں اب اس تشویش کا اظہار کیا جانے لگا کہ طالبان نے عورتوں کو گھروں میں قید کر دیا ہے، اور ان پر پردے کی پابندی عائد کر کے انہیں اجتماعی معاشرے میں شامل ہونے سے روک دیا ہے۔ مغربی حلقوں کی یہ تشویش اس وقت تو اس قدر کھل کر سامنے نہیں آئی، کیونکہ اوّل تو قندہار کے علاقے میں مغربی اداروں کی کوئی خاص سرگرمیاں تھیں ہی نہیں اور پھر دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت تک کسی کو یہ وہم وگمان بھی نہ تھا کہ قندھار کے افق سے رونما ہونے والا طالبان کا یہ چھوٹا سا گروہ ان جنگی سرداروں کو شکست دے کر آگے بڑھتا چلا جائے گا، جنہوں نے برسہابرس سے افغانستان کے طول وعرض کو اپنی خونی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

لیکن جب ستمبر ۱۹۹۵ء میں طالبان نے ہرات کو فتح کیا تو مغربی حلقوں کی طرف سے یکدم بہت تیزی سے طالبان کے بارے میں یہ آوازیں اٹھائی جانے لگیں کہ وہ عورتوں کے ساتھ ناانصافی کر رہے ہیں، انہیں تعلیم سے محروم رکھ رہے ہیں اور گھروں میں قید کر رہے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ طالبان نے ہرات کی فتح کے بعد عورتوں کیلیۓ وہی اصلاحات جاری کی تھیں، جو انہوں نے قندہار میں کی تھیں، لیکن فرق یہ تھا کہ ہرات کا نیا معاشرہ اپنے اوپر جدت پسندی کی گہری چھاپ رکھتا تھا، اور پھر یہ علاقہ ایران کے پڑوس میں تھا، جہاں خمینی انقلاب کے بعد شیعہ مذہب کی شریعت کا اس طرح نفاذ کیا گیا تھا کہ اس سے کسی قسم کے سیاسی اور مادّی مفادات پر زد نہ پڑے۔ چنانچہ ایرانی حکومت نے اپنے ہاں کی عورتوں کو پردہ کی ہدایت تو کر رکھی تھی، لیکن عورت کی حفاظت اور معاشرے کی اصلاح کیلیۓ پردے کی نوعیت اور صورت کیا ہونی چاہیۓ، ایرانی حکومت کو اس سے غرض نہیں تھی، کیونکہ ان کے خیال میں ایسا کرنے سے وہ مغربی دنیا کی نظر میں تنگ نظر ٹھہرائے جاتے، اور پھر انہیں بھی ویسی ہی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا، جیسی مخالفت کا سامنا طالبان کر رہے تھے۔ اسی ''مصلحت'' کے پیش نظر ایران نے اپنے ہاں

خواتین کو ایک بہت محدود قسم کے پردے کا پابند کیا، اور چونکہ نئی ایرانی حکومت کی پیشانی پر اسلامی انقلاب کا لیبل چسپاں تھا، لہٰذا اسی محدود پردے کو "اسلامی پردے" کا نام دیدیا گیا۔ ہرات پر ایران کے ان نظریات کا کافی حد تک اثر تھا، چنانچہ جب طالبان نے یہاں باقاعدہ اسلامی شریعت کی رو سے تلقین کردہ پردہ کو لازمی قرار دیا، تو مغربی حلقوں میں اسے شدت سے محسوس کیا گیا اور پھر افغانستان میں موجود غیر ملکی این جی اوز اور مغربی حکومتوں کی جانب سے باقاعدہ طور پر، طالبان پر عورتوں کے حقوق غصب کرنے کے الزامات عائد کئے جانے لگے۔

طالبان نے ہرات کی فتح کے بعد یہاں خواتین کے حوالے سے جو اصلاحات جاری کیں، وہ یہ تھیں:

۱۔ خواتین اپنے گھروں سے باہر بے پردہ حالت میں نہیں نکل سکتیں۔

۲۔ خواتین کسی اجنبی شخص کے ساتھ سفر نہیں کرسکتیں۔

۳۔ خواتین ملازمت نہیں کرسکتیں، البتہ جو خواتین ضرورت مند ہیں، انہیں حکومتی بیت المال سے ماہانہ امدادی وظائف جاری کئے جائیں گے۔

۴۔ خواتین کی تعلیم کیلئے قائم کئے جانے والے جدید مغربی طرز کے اسکول تاحکم ثانی بند کردیئے گئے، اور طالبات سے کہا گیا کہ وہ گھروں میں رہ کر حسب ضرورت دینی تعلیم حاصل کریں اور گھریلو فنون میں دسترس حاصل کریں۔

۵۔ خواتین کو تلقین کی گئی کہ وہ بلا ضرورت کسی اجنبی مرد ڈاکٹر سے علاج نہ کروائیں اور اگر ضرورت پڑے تو باپردہ ہو کر علاج کروائیں۔

ان احکامات میں سے بعض ایسے تھے جو محض وقتی طور پر ضرورت کے تحت نافذ کئے گئے، جبکہ بعض مستقل تھے۔ مثال کے طور پر عورتوں کیلئے باپردہ ہو کر گھروں سے نکلنے کا حکم مستقل تھا، اور اس سلسلہ میں طالبان کسی بھی قسم کی رعایت دینے کیلئے تیار نہیں تھے۔ کیونکہ یہ ایک اسلامی حکم تھا اور طالبان اسلامی شریعت سے کسی صورت بھی دستبردار ہونے کیلئے تیار نہیں تھے، لیکن دیگر احکامات ایسے تھے جو وقتی طور پر نافذ کئے گئے۔ چنانچہ طالبان نے اس بات کی یقین دہانی کرائی تھی کہ عورتوں کے ملازمت کرنے یا تنہا سفر کرنے پر پابندی صرف اس وقت تک ہے جب تک عورتوں اور مردوں کی ملازمت کے جداگانہ دفاتر اور سفر کی علیحدہ سہولت مہیا نہیں ہو جاتی۔ انہوں نے انسانی فلاحی اداروں کو بھی اجازت دے دی تھی کہ وہ اپنے یہاں افغان خواتین کو ملازم رکھ سکتے ہیں بشرطیکہ ان کے معاملات صرف خواتین کی حد تک ہوں۔

اسی طرح خواتین کی تعلیم کا معاملہ تھا، پیٹر مارسڈن لکھتے ہیں:

''جہاں تک خواتین کا تعلق ہے طالبان ان کو تعلیم دینے کے خلاف نہیں ہیں لیکن ان کا کہنا ہے کہ جب پورا افغانستان ان کے کنٹرول میں آجائے گا تب وہ علماء کی ایک کمیٹی بنائیں گے جو نیا نصاب مرتب کرے گی۔ اس کے بعد ہی لڑکیوں کی تعلیم شروع ہو سکے گی۔''

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ طالبان نے اپنے ابتدائی دور میں جدید تعلیم کے اسکول اس لئے بند کر دیئے تھے کیونکہ افغانستان میں طالبان کی آمد سے قبل مغربی امدادی ادارے جس تعلیمی نصاب کو جاری کئے ہوئے تھے وہ مشترکہ طور پر امریکہ کی اوماہا یونیورسٹی اور پاکستان میں قائم شدہ سابقہ مجاہدین کی عبوری حکومت نے مرتب کیا تھا۔ اس کے اخراجات امریکی امداد سے پورے ہوتے تھے۔ یہ امدادی ادارے اسکولوں کو کتابیں بھی فراہم کرتے تھے اور اسکولوں کی عمارتوں کی دیکھ بھال اور اساتذہ کی تنخواہیں بھی ادا کرتے تھے۔

عورتوں کی تعلیم کے سلسلہ میں طالبان کا مؤقف یہ بھی تھا کہ تعلیم لازمی ہے، نہ کہ اس کے حصول کے ذرائع، لہٰذا حسب ضرورت تعلیم تو بچیوں کو گھروں میں رکھ کر بھی دی جاسکتی ہے۔ مغربی اداروں کی سر پرستی میں قائم شدہ اسکولوں میں دی جانے والی تعلیم کے بارے میں طالبان کا مؤقف ان کے اٹارنی جنرل مولوی جلیل الدولہ مولوی زادہ نے ان الفاظ میں بیان کیا:

''ہمارا موقف یہ ہے کہ جس نوع کی تعلیم اقوام متحدہ چاہتی ہے، وہ ایک ملحدانہ تعلیم ہے، جو عورتوں کو بے حیائی سکھاتی ہے اور حرام کاری کی طرف لے جاتی ہے۔ اس سے اسلام کیلئے تباہی کی صورت پیدا ہوجاتی ہے۔ کسی بھی اسلامی ملک میں جہاں حرام کاری عام ہوجاتی ہے، وہ ملک تباہ ہوجاتا ہے اور ملحدوں کے قبضے میں چلا جاتا ہے کیونکہ وہاں کے مرد عورتوں کی طرح بن جاتے ہیں اور عورتیں اپنا دفاع نہیں کرسکتیں۔ جسے بھی ہم سے بات کرنی ہے، اسلامی حدود میں رہتے ہوئے بات کرے، قرآن مجید لوگوں کے مطابق اپنے آپ کو نہیں ڈھال لیتا بلکہ لوگوں کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو قرآن کے مطابق ڈھالیں اور قرآن کے تقاضے پورے کریں۔''

عورتوں کی تعلیم کے حوالے سے وزارتِ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کابل کے سربراہ مولوی کلام الدین نے ایک مرتبہ کہا کہ "ایک مسئلہ تو حفاظت اور سلامتی کا ہے۔ عورتوں کیلئے علیحدہ ٹرانسپورٹ کا بھی بندوبست نہیں۔ اسکولوں کیلئے علیحدہ عمارتیں بھی نہیں، عورتوں کو تعلیم دینے کیلئے جن سہولتوں کی ضرورت ہے، ان کا بھی فقدان ہے، عورتیں، مردوں سے مکمل طور پر علیحدہ ہونی چاہئیں، ہم میں ایسے مرد بھی موجود ہیں، جو عورتوں سے اچھی طرح پیش نہیں آتے۔ سوویت یونین کے خلاف جنگ میں ہم نے اس لئے بیس لاکھ جانیں گنوائی ہیں کہ ہم شرع کے پابند نہیں تھے۔ طالبان نے شریعت کیلئے جنگ لڑی ہے، وہ شریعت نافذ کرنے کے پابند ہیں۔ چاہے جو کچھ ہو، ہم یہ مقصد پورا کر کے رہیں گے۔"

باقی رہا شعبۂ صحت کا معاملہ، تو اس سلسلہ میں خواتین کی شرکت ایک مجبوری تھی، جسے طالبان نے خوشدلی سے قبول کیا، کیونکہ اسلامی شریعت بھی اس کی اجازت دیتی ہے۔ چنانچہ طالبان نے مناسب ہدایات کے ساتھ خواتین کو اس شعبے میں کام کرنے دیا بلکہ انہوں نے غیر سرکاری اداروں کی غیر ملکی خواتین کو بھی اس شعبے میں مصروف عمل رہنے کی اجازت دیدی۔ اس طرح سے افغانستان میں کام کرنے والے غیر ملکی فلاحی اداروں کو بھی اپنی خدمات پیش کرنے میں سہولت میسر رہی۔ احمد رشید کے بقول "یہ طے پایا کہ میڈیکل شعبے میں کام کرنے والی عورتیں ڈرائیور کے ساتھ نشست پر نہیں بیٹھ سکتیں، وہ کسی ایسی گاڑی میں سفر نہیں کر سکتیں، جس میں کوئی مغربی باشندہ موجود ہو۔"

صحت کے شعبے میں خواتین کو کام کرنے کی اجازت دینے کے باوجود طالبان نے اس سلسلے میں اپنی نگرانی ہمیشہ کڑی رکھی۔ ان کی تشویش بجا بھی تھی۔ کیونکہ تاریخی حقائق اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ غیر ملکی این جی اوز افغانستان میں غیر اسلامی نظریات، تہذیب اور عقائد پھیلانے میں اس شعبے کو خاص طور پر استعمال کرتے رہے ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں، جب افغانستان پر ظاہر شاہ کی حکمرانی تھی، اور اس نے ملک میں مغربی تہذیب کی درآمد کیلئے تمام دروازے کھول رکھے تھے، ٹائمز آف انڈیا کے ایک یورپین نامہ نگار RITCHIE COLDER نے افغانستان کے جشن استقلال میں شرکت کی۔ اس رپورٹر کی لکھی ہوئی رپورٹ ۲۸ / جولائی ۱۹۶۳ء کے ٹائمز آف انڈیا میں شائع ہوئی۔ جس میں اس نے افغان عورت کی بے پردگی کے حوالے سے لکھا کہ:

"تین سال قبل یہاں کی عورتیں پردہ میں تھیں، اس وقت اگر ایسے مواقع پر اسے باہر نکلنے کی اجازت ملتی بھی تو اسے چادر میں ملفوف ہو کر آنا پڑتا جو اسے سر

سے پیر تک ڈھکے رہتی اور نقاب اس کے چہرہ کو ڈھانپے ہوئی ہوتی جس میں دیکھنے کیلئے سوراخ بنے ہوتے۔اب یہ سب نذر انقلاب ہو چکا ہے، اب بھی جشن کے مجمع میں ایسی عورتیں خاصی نظر آتی ہیں، جو اب بھی الگ تھلگ رہنے والا برقع پہنے ہیں، اور وہ ابھی اس کی خوگر نہیں ہوئی ہیں کہ ان کو اپنا چہرہ کھلا رکھنے کی آزادی نصیب ہو چکی ہے، لیکن اب عورتوں کی عظیم اکثریت بے نقاب ہو چکی ہے۔''

آگے چل کر یہ نامہ نگار لکھتا ہے کہ:

''یہ دعویٰ تقریباً صحیح ہوگا کہ افغان عورتوں کی پردہ سے ''نجات'' کا آغاز زچہ و بچہ کے طبی مراکز سے ہوا، جبکہ ڈاکٹر اینا میریا گیڈ (جو اس وقت عالمی ادارہ صحت کے علاقائی ہیڈ کوارٹر دہلی کی صدر ہیں) آج سے دس سال قبل ڈنمارک سے افغانستان وارد ہوئی تھیں، اس وقت وہاں بچہ جنانے والی لیڈی ڈاکٹر ایک بھی موجود نہ تھی، پورے افغانستان میں اس وقت ایک سو بیس ڈاکٹر تھے، اور وہ سب کے سب مرد ہی تھے، کسی مرد ڈاکٹر کو عورتوں کے معائنہ کی اجازت نہ تھی، مقامی قابلہ عورتیں جدید طریق علاج سے بالکل نا آشنا تھیں۔ڈاکٹر گید نے قابلہ (مڈوائف) عورتوں کی تربیت شروع کی اور ان میں شاہی خاندان کی عورتیں بھی شامل تھیں، زچہ و بچہ کی صحت کے مراکز قائم کئے گئے اور برقعہ پوش عورتیں وہاں بکثرت آنے لگیں، وہاں انہوں نے صرف جسمانی فائدے ہی حاصل نہیں کئے جن کے نتیجہ میں ان کے نقطۂ نظر میں انقلابی تبدیلی ہوئی، بلکہ لیڈی ڈاکٹروں اور نرسوں سے ملنے کے بعد انہیں یہ بھی علم ہوا کہ عورتیں بھی (اس پیشہ میں) مردوں کی طرح روزی کما سکتی ہیں، اور اس سے اہم چیز یہ کہ ان مریض عورتوں نے ان طبی مراکز میں اپنے بارے میں یہ محسوس کیا کہ ان کی حیثیت کتنی اہم ہے اور اب ان کا شمار چھپائے جانے والے خانہ داری کے سامان میں نہیں ہو سکتا۔آج ان عورتوں کیلئے اعلیٰ قسم کے اسپتال موجود ہیں جن کی انچارج اعلیٰ ڈگری یافتہ عورتیں ہیں جو انتہائی صاف ستھری اور حفظانِ صحت کے اصول وضوابط پر عامل ہیں، اور اس بارے میں ان روایات کو قائم

کیئے ہوئے ہیں جو ڈاکٹر گیڈ نے قائم کی تھیں۔افغانستان میں عورتوں نے اگست ۵۹ء سے بے نقابی شروع کی ہے، ایک شاہی فرمان کی رو سے عورتوں کو برقع سے باہر نکلنے کا حکم تو نہیں دیا گیا لیکن اجازت دے دی گئی تھی۔''

معلوم ہوا کہ طالبان کی یہ تشویش بجا تھی کہ غیر ملکی ادارے صحت اور فلاح و بہبود کے نام پر افغان خواتین میں اپنے نظریات اور عقائد پھیلا سکتے ہیں۔طالبان کی اس تشویش کو اس وقت مزید تقویت ملتی جب مبینہ طور پر ایسے واقعات سامنے آتے، جن میں غیر ملکی اداروں کے اہلکار افغان تہذیب وثقافت کے بگاڑ کیلئے خفیہ سرگرمیوں میں ملوث پائے جاتے۔ایسے ہی کئی واقعات کے نتیجہ میں طالبان نے غیر ملکی اہلکاروں پر سخت پابندیاں بھی عائد کیں اور بعض اوقات ان کی گرفتاری کی نوبت بھی آئی۔

طالبان کی طرف سے خواتین کیلئے جاری کی گئیں پالیسیوں کے حوالے سے ہرات کے طالبان گورنر نے ایک مرتبہ ریڈیو ایران کی پشتو سروس کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ:

''پورے افغانستان کیلئے یہ فخر کی بات ہے کہ ہم نے خواتین کو گھر میں ہی رہنے دیا۔شریعت نے معاشرے کے ہر فرد کیلئے اصول اور قاعدے بتائے ہیں۔عورت کو اس کی اجازت ہے کہ اگر وہ بیمار پڑے تو مرد ڈاکٹر سے علاج کروا سکتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں کسی ملک نے عورتوں کو اتنے حقوق نہیں دیئے جتنے ہم نے دیئے ہیں۔ہم نے وہی حقوق انہیں دیئے جو اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عطا کردہ ہیں یعنی وہ اپنے گھروں میں رہیں اور دینی تعلیم حجاب میں رہ کر حاصل کریں۔''

ہرات میں جاری شدہ طالبان کی اصلاحات پر مغربی حلقوں کی طرف سے تنقید کا سلسلہ ابھی رکا نہیں تھا کہ اگلے سال ۱۹۹۶ء میں انہوں نے حیرت انگیز طور پر کابل بھی فتح کرلیا۔طالبان جب کابل میں داخل ہوئے، اس وقت تک کابل پر پورے طریقے سے مغربی حلقوں کے پنجے گڑھے ہوئے تھے اور اس شہر میں، جہاں بچہ بچہ روٹی کے لقمے کو ترس رہا تھا، غیر ملکی اداروں نے اپنی تہذیب وثقافت کو حتیٰ الوسع پھیلا دیا تھا۔اپنی آب وہوا اور مناسب ترین موسم کی وجہ سے یہ شہر ہمیشہ ہی سے غیر ملکیوں کیلئے بہترین تفریح گاہ رہا ہے، اور پھر جب سے یہاں کی غربت وافلاس نے غیر ملکیوں کو یہاں کا مسیحا بن کر رہنے کا بہانہ فراہم کردیا، اس وقت سے بیرونی امداد سے بڑھ کر یہاں بیرونی تہذیب آنے لگی اور شہر اس حد تک

جا پہنچا کہ اسے لٹل ماسکو کہا جانے لگا۔ وہ ظاہر شاہ کا دور ہو، روس کا تسلط ہو، نجیب کی حکومت ہو یا احمد شاہ مسعود کی حکمرانی، ان تمام زمانوں میں مغربی تہذیب، کو اس شہر میں داخل ہونے سے کسی نے نہیں روکا، اور نہ ہی خود اس نے کوئی رکاوٹ محسوس کی۔ یہی وجہ ہے کہ طالبان کے داخلے تک اس شہر میں ہر طرح کی مادر پدری آزادی قائم رہی، اور اس قدر مضبوط قدموں کے ساتھ قائم رہی کہ شہر میں بہتی لہو کی ندیاں بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں۔

یہ ساری صورتحال طالبان کیلئے ناقابل عمل تھی، کیونکہ قندہار سے کابل تک وہ جو معقول اصلاحات نافذ کرتے آئے تھے، انہیں محض شہر کے بگڑے ہوئے ماحول کی وجہ سے ترک نہیں کیا جا سکتا تھا، طالبان اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ کابل افغانستان کا دل ہے اس کے ماحول کے اچھے یا برے اثرات پورے افغانستان پر مرتب ہوں گے، لہٰذا ضروری تھا کہ یہاں کا ماحول درست رکھا جائے اور کسی بھی قیمت پر اس سے صرف نظر نہ کیا جائے۔

ادھر طالبان ان اقدامات میں مصروف تھے اور دوسری جانب افغانستان میں موجود غیر ملکی ادارے اور مغربی حکومتیں اس بات پر پیچ و تاب کھا رہی تھیں کہ طالبان اپنے اصولوں کے معاملے میں ان کے ساتھ کسی قسم کا کوئی سمجھوتہ کرنے پر تیار نظر نہیں آ رہے تھے۔ طالبان اور ان کی پالیسیوں کے بارے میں ان سے اختلاف رکھنے والے ان حلقوں کے مابین فاصلوں کو مزید وسعت دینے میں اہم کردار مغربی میڈیا بھی ادا کر رہا تھا، جو شب و روز طالبان کے حوالے سے انتہائی پُرتعصب پروپیگنڈے میں مصروف تھا اور دنیا بھر کے سامنے طالبان کی حد درجہ خوفناک اور بھیانک تصویر پیش کر رہا تھا۔ مغربی میڈیا کے اس کردار نے نہ صرف اس کی غیر جانبداری کو واضح کیا بلکہ افغانستان کے بارے میں اس کی ہمدردی کو بھی مشکوک بنا دیا۔

۸/اکتوبر ۱۹۹۶ء کو اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل اور امریکی حکومت نے طالبان کو متنبہ کیا کہ اگر عورتوں کے بارے میں ان کی پالیسی تبدیل نہ ہوئی تو افغانستان کی نہ صرف امداد روک لی جائے گی بلکہ ان کی حکومت کو بھی تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ اگلے ہی دن یونیسیف نے اعلان کر دیا کہ افغانستان کی تعلیمی امداد اس وقت تک بند رہے گی جب تک حکومت خواتین کی تعلیم تسلیم نہیں کرے گی۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے بھی اپنی ایک قرارداد میں طالبان کو متنبہ کیا کہ وہ عورتوں کے ساتھ امتیازی سلوک سے باز رہیں۔

اقوام متحدہ اور امریکہ کی جانب سے اس مشترکہ دھمکی کے بعد، افغانستان میں کام کرنے والے غیر ملکی

اداروں نے ایک مرتبہ پھر کوشش کی کہ وہ طالبان کو ان کی پالیسیوں میں نرمی اختیار کرنے پر آمادہ کریں۔ چنانچہ ۱۵/اکتوبر ۱۹۹۶ء کو یہ سب ادارے سر جوڑ کر بیٹھے اور انہوں نے اپنے اپنے فلاحی منشور کے مطابق ایک متفقہ لائحۂ عمل تیار کیا۔ تاہم اس لائحۂ عمل میں اس بات کا اعتراف بھی شامل تھا کہ بین الاقوامی ادارے مقامی رسم ورواج کو احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس متفقہ لائحۂ عمل کی تیاری کے بعد انہوں نے طالبان کے سامنے اپنے مطالبات پیش کیے جن میں طالبان سے کہا گیا تھا کہ وہ صحت کے علاوہ بھی تمام ایسے شعبوں میں افغان عورتوں کو غیر ملکی اداروں میں ملازمت کرنے کی اجازت دیں، جن شعبوں میں یہ ادارے بزعم خود عورتوں کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ان اداروں کا کہنا تھا کہ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے عملے میں افغان خواتین شامل ہوں اور حسب ضرورت ان سے صنفی امتیاز کے بغیر رابطہ بھی کیا جا سکے۔

غیر ملکی اداروں کی جانب سے یہ مطالبات طالبان کی نظر میں قطعاً غیر معقول تھے، کیونکہ افغانستان میں فلاحی سرگرمیاں جاری رکھنے کیلئے افغان خواتین کو غیر ملکیوں کی ملازمت کی کوئی ضرورت نہ تھی، خاص طور پر اس لئے بھی کہ طالبان نے ان اداروں سے وابستہ غیر ملکی خواتین کو افغانستان میں رہنے کی اجازت دیدی تھی۔ تاہم ان کیلئے بھی شہری ماحول میں پھرنے کیلئے حجاب لازمی قرار دیا گیا تھا۔ حجاب کی اس پابندی کو ان اداروں نے کئی مرتبہ ناانصافی قرار دیا، لیکن طالبان کا مؤقف تھا کہ ان کے ملک میں رہتے ہوئے ہر فرد کیلئے ان کے قوانین کا احترام کرنا ضروری ہے۔

بہر حال غیر ملکی اداروں کی جانب سے پیش کیے گئے مطالبات کے بارے میں طالبان نے پھر بھی سنجیدگی کا مظاہرہ کیا، چنانچہ اس سلسلہ میں فریقین کے درمیان ایک اہم میٹنگ ہوئی۔ اس میٹنگ میں طالبان کی نمائندگی قائم مقام وزیر خارجہ حاجی محمد غوث اخوند نے کی، اس میٹنگ میں جب غیر ملکی اداروں نے اپنے مطالبات پیش کیے۔ تو اس کے جواب میں وزیر موصوف نے کہا کہ طالبان کے سامنے فی الوقت سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ملک میں امن وامان قائم ہو اور سارے ملک میں ایک مستحکم اسلامی حکومت قائم ہو جائے۔ امید ہے کہ اس کے نتیجے میں بین الاقوامی برادری طالبان کی حکومت کو تسلیم کرے گی۔ اس کے بعد ہی وہ دوسرے مسائل پر نظر ڈالیں گے۔ فی الحال انہیں بین الاقوامی اور قومی تقاضوں کو پورا کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے غیر ملکی نمائندوں سے واضح طور پر یہ بھی کہا کہ بہتر ہوگا کہ اقوام متحدہ اور فلاحی ادارے ہم سے وہ امیدیں نہ رکھیں جو ہماری قومی روایات کے خلاف ہیں۔ ہمارے ملک کی صرف ۲/فیصد خواتین نوکریاں کرتی ہیں آپ لوگ ساری توجہ صرف ۲/فیصد پر کیوں دے رہے ہیں؟

اکتوبر ۱۹۹۶ء کے بعد اگلے اٹھارہ ماہ تک غیر ملکی اداروں اور طالبان کے مابین اسی مسئلہ پر کئی مرتبہ مذاکرات ہوئے، لیکن ان کا منطقی طور پر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اس لئے کہ طالبان اپنے اصولی مؤقف پر قائم تھے کہ بین الاقوامی ادارے افغانستان میں کام کرتے ہوئے یہاں کی تہذیب وثقافت کا خیال رکھنے کے پابند ہیں اور اسلامی شریعت اور افغان ثقافت خواتین کو مردوں سے کھلے میل جول کی اجازت نہیں دیتی۔ جس شعبے میں عورتوں کی شدید ضرورت ہے، یعنی طب اور صحت، تو اس میں کام کرنے کی اجازت طالبان نے پہلے ہی دے رکھی ہے۔ اس کے برخلاف غیر ملکی ادارے اپنی ہٹ دھرمی پر قائم تھے کہ وہ اپنی امدادی سرگرمیاں اسی وقت جاری رکھیں گے، جب ان کی مرضی اور مطالبے کے مطابق افغان خواتین کو ''آزادی'' دی جائے گی۔

دونوں فریقوں کے مابین یہ اختلاف آخر دم تک باقی رہا، بلکہ ہر آئے دن اس میں شدت پیدا ہوتی چلی گئی۔ ۷ر اگست ۱۹۹۷ء کو کابل میں کام کرنے والی ایک غیر ملکی امدادی تنظیم نے افغانستان میں عورتوں کیلئے شروع کئے گئے اپنے تمام پروگرام یہ بہانہ کر کے بند کر دیئے کہ طالبان عورتوں کو کھل کر کام کرنے کی اجازت نہیں دے رہے۔ ۸ر مارچ ۱۹۹۸ء کو مغربی دنیا میں یومِ خواتین منایا گیا تو اس موقع پر افغان خواتین کو طالبان کے ''مظالم'' کا شکار قرار دے کر ان سے خصوصی ہمدردی کا اظہار کیا گیا۔ اس اقدام کے پس پردہ مبینہ طور پر افغانستان میں کام کرنے والے غیر ملکی اداروں اور مغربی مما لک کی سرکاری ایجنسیوں کا ہاتھ کار فرما تھا، جو دنیا بھر کے عوام کے سامنے یہ امر باور کروانا چاہتے تھے کہ طالبان نے عورتوں کے ساتھ ناانصافی کا رویہ اختیار کر رکھا ہے۔

۲۱ر اکتوبر ۱۹۹۸ء کو امریکہ کی ماؤس لیمونامی ایک فاؤنڈیشن نے، طالبان کے خلاف اقتصادی اور سماجی دباؤ بڑھانے کا مطالبہ کیا۔ اس تنظیم نے طالبان کی صنفی پالیسیوں کے خلاف پروپیگنڈہ مہم چلانے کیلئے ایک لاکھ ڈالر خرچ کرنے کا اعلان کیا۔

۴ر مارچ اور ۲۹ر اپریل ۱۹۹۹ء کو امریکی خاتونِ اوّل ہیلری کلنٹن نے طالبان پر تنقید کی کہ وہ عورتوں پر ظلم کر رہے ہیں۔ امریکی وزیر خارجہ میڈیلین البرائٹ نے بھی جون ۲۰۰۰ء میں اقوام متحدہ میں ہونے والی خواتین کی عالمی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے طالبان پر نکتہ چینی کی۔ ہیلری کلنٹن اور البرائٹ کی طالبان پر تنقید اس لحاظ سے کافی مضحکہ خیز تھی کہ خود امریکہ میں خواتین کی حالتِ زار کا جائزہ لیتے ہوئے امریکی خفیہ ایجنسی سی آئی اے نے اپنی ایک رپورٹ میں بتایا کہ ہر سال امریکہ میں پچاس

ہزار خواتین، نوعمر لڑکیاں اور بچے اسمگل کیے جاتے ہیں اور انہیں جسم فروشی، بیگار خانوں یا کم اجرت پر کام کرنے کیلئے مجبور کیا جاتا ہے۔ سی آئی اے کی رپورٹ کے مطابق ان بدنصیبوں میں ۲۵ سال سے کم عمر کی لڑکیاں اور ۹ سال سے کم عمر کے بچے شامل ہوتے ہیں۔ ایک اور رپورٹ کے مطابق امریکہ میں جنسی استحصال کی مارکیٹ میں فروخت ہونے والی بے بس خواتین کی سالانہ تجارت سات بلین ڈالر سے بارہ بلین ڈالر تک ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مغرب عورت کے حوالے سے اپنی وسعتِ نظری کے جس قدر بھی دعوے کرے، حقائق کے آئینہ میں وہ کچھ حیثیت نہیں رکھتے چنانچہ پیٹر مارسڈن کے بقول:

> ''اگر افغان خواتین میں نسل، مذہب، دولت اور دیہی وشہری زندگی کی بنیاد پر فرق پایا جاتا ہے تو مغربی معاشرے میں بھی قومیت، طبقہ، عمر، آمدنی اور ماحول کی بنیاد پر یہ فرق موجود ہے۔''

اس صورتحال میں اہل مغرب کا اپنے آپ کو طالبان کے مقابلے میں خواتین کا زیادہ بڑا ہمدرد ثابت کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ اور پھر اس مشکل میں اس وقت مزید اضافہ ہو جاتا ہے، جب طالبان کے ناقابل تسخیر چیلنج سامنے آتے ہیں۔ ایک موقع پر طالبان کے ایک وزیر نے مغربی دنیا کو چیلنج کیا تھا کہ ان کے ملک میں عورت کو جو تحفظ اور سلامتی حاصل ہے وہ کسی اور ملک میں نہیں۔ طالبان کے اس وزیر نے کہا کہ میں مغربی ممالک کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اپنی کسی بھی عورت کو افغانستان میں بھیجیں، جو زیور اور دولت سے لدی ہو، یہ عورت اپنی دولت سمیت تن تنہا قندھار سے چھ سو کلومیٹر کا سفر طے کر کے کابل تک جائے، اگر اسے اثنائے سفر میں کوئی شخص بری نگاہ سے بھی دیکھ لے، تو طالبان اپنی پالیسی میں ناکام ٹھہرائے جائیں۔ طالبان کی طرف سے اس قدر بھاری چیلنج واقعی بہت بڑی اہمیت رکھتا تھا، خاص طور پر اس لئے بھی کہ ہر طرح کی مخالفت کے باوجود افغانستان آنے والے تقریباً ہر مغربی شخص نے کھلے دل سے اس کا اعتراف کیا ہے کہ کچھ بھی ہو، طالبان نے بہر حال اپنے مقبوضہ علاقوں میں امن وامان نافذ کیا اور عوام کو ہر سطح پر تحفظ فراہم کیا۔

ان سب باتوں کے باوجود مغربی حلقوں کی طرف سے تنقید اور طعن وتشنیع کا سلسلہ جاری تھا اور طالبان اپنی پالیسیوں پر کاربند تھے کہ دسمبر ۲۰۰۱ء میں طالبان حکومت کا خاتمہ ہو گیا...... لیکن جاتے جاتے بھی طالبان عورتوں کیلئے، اپنے ہمدردانہ عمل کی ایک ایسی روشن مثال چھوڑ گئے، جو اہل مغرب کیلئے

ناقابل انکار حقیقت بن گئی۔

''ایون ریڈلی'' ایک برطانوی صحافی خاتون ہے، جو ۲۸ ستمبر ۲۰۰۱ء کو، امریکہ کی طرف سے افغانستان پر حملے کے امکانات بڑھنے کے بعد، افغانستان کے حالات کا مشاہدہ کرنے کیلئے غیر قانونی طور پر افغانستان میں داخل ہوئی۔ اپنے داخلے کے تھوڑی دیر بعد ہی طالبان نے اس خاتون کو جلال آباد میں حراست میں لے لیا۔ پھر یہ خاتون دس دن تک طالبان کی تحویل میں رہی۔ اس دوران اس خاتون نے اپنے ساتھ پیش آنے والے طالبان کے حسن سلوک کی جو روداد بیان کی، وہ طالبان پر عورتوں کی حق تلفی کے حوالے سے تنقید کرنے والوں کی آنکھیں کھولنے کیلئے کافی ہے۔

ایون ریڈلی اپنے ایام حراست کی کہانی سناتے ہوئے کہتی ہے:

''ایک وقت ایسا بھی آیا جب کابل کی جیل میں قید کے دوران میری قوت برداشت اس حد تک جواب دے گئی کہ میں نے اپنے قید کرنے والوں کے منہ پر تھوکا اور ان کو گالیاں دیں۔ مجھے اس کے بدلے میں ان سے بدترین جواب کی امید تھی لیکن ان لوگوں نے میرے اشتعال دلانے والے رویے کے باوجود مجھے بتایا کہ ''میں ان کی بہن اور مہمان ہوں۔''

ایک اور واقعہ کا تذکرہ وہ یوں کرتی ہے:

''میں خواتین کے درمیان بیٹھی تھی۔ اس ماحول میں ایک خاتون نے جو خود کو ایک ننھی سی مشین ہی سمجھتی ہے مجھے کھینچ کر کمرے سے باہر لے گئی تاکہ میں کچھ کھا پی سکوں۔ ان کی فیاضی تو کیا محبت امڈی پڑتی ہے۔ اگرچہ ان کے پاس بہت کم خوراک ہے مگر وہ اسے میرے ساتھ مل کر کھانا چاہتے ہیں۔ میں چاول، شوربا، گوشت اور روٹی نہیں کھا سکتی کیونکہ اس کیلئے تو ہاتھ بلکہ انگلیاں استعمال کرنا پڑتی ہیں۔ چنانچہ وہ مجھے مکئی کا ایک سٹا دیتی ہے جو بڑا میٹھا ہے مگر میں گرم ہونے کے باعث اسے نیچے گرا دیتی ہوں تو وہ میری طرف غصے اور حیرت سے دیکھتی ہے۔ کچھ دوسری خواتین میری طرف دیکھ کر زیر لب مسکراتی ہیں گویا میں کوئی کمزور سی مغربی عورت ہوں۔''

ریڈلی ایک دوسرا منظر یوں قلم بند کرتی ہے:

”خوب، بہت خوب! میں تو چاہتی ہوں کہ میں ہر ایک کو بتاؤں کہ میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ میری امی کو علم ہو جائے، میرا کمرہ ایئر کنڈیشنڈ ہے اور کمرے سے ملحق باتھ میں فلش بھی لگا ہوا ہے۔ مجھے ایک ریڈیو دیا گیا تاکہ میں بی بی سی کی عالمی سروس سن سکوں، مجھ سے یہ پوچھا جا رہا ہے کہ مجھے کسی اور چیز کی تو ضرورت نہیں؟ حمید کہتا ہے کہ ہر ایک کو یہی فکر ہے کہ میں کھانا نہیں لیتی اور وہ پوچھتا ہے کہ آیا خوراک میری پسند کی نہیں، کیا میں کوئی خاص کھانا لینا چاہتی ہوں یا میرے لئے ہوٹل کے کھانے کا بندوبست کیا جائے؟ وہ بار بار مجھے اپنے مہمان بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر میں مغموم ہوں تو وہ بھی غم زدہ ہو جاتے ہیں، میں اس پر یقین نہیں کر سکتی۔ یہ طالبان مجھے مہربانی کے ساتھ مارنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ کئی اعتبار سے نرم خو، خوش خصال، شریف، مہربان اور دوسروں کا خیال رکھنے والے، ہاں جب وہ لڑنے پر آتے ہیں تو وہ دنیا کے خوفناک ترین جنگجو ہیں۔ میری خواہش ہے کہ میرے گھر میں کسی کو معلوم ہو جائے کہ وہ مجھ سے کیسا سلوک روا رکھے ہوئے ہیں۔ میں شرط لگاتی ہوں کہ لوگ تو یہ سوچ رہے ہوں گے کہ مجھے اذیت دی جا رہی ہوگی، مارا پیٹا جا رہا ہوگا اور وہ میری عزت سے کھیل رہے ہوں گے۔ مگر...... مگر؟

طالبان کے حسن سلوک کا تذکرہ کرتے ہوئے ریڈلی کہتی ہے:

”وہ سب بڑے مہربان محسوس ہوتے ہیں۔ وہ بڑے فراخ دل ہیں مگر یہ بات بھی بڑی تیزی کے ساتھ سمجھ میں آ جاتی ہے کہ وہ کسی سے ڈرنے والے نہیں ہیں اور اپنی آزادی کی حفاظت کیلئے جنگ کرنے کو تیار ہیں۔“

ایون ریڈلی ابھی طالبان کی قید میں تھی کہ افغانستان پر امریکی اور اتحادی افواج کا حملہ شروع ہو گیا، طالبان چاہتے تو اس حملے کی سزا ایون ریڈلی کو دے سکتے تھے، لیکن انہوں نے اس موقع پر اس خاتون کو رہا کر کے ساری دنیا کو حیران کر دیا۔ اپنی رہائی کا تذکرہ کرتے ہوئے ریڈلی کہتی ہے:

”آخر کار وہ وقت بھی آ گیا جب طالبان نے مجھے رہائی کی نوید سنائی۔ انہوں نے مجھے چوڑے افغان روایتی تکیے پر بیٹھنے کو کہا اور پھر قید خانے کے

نگران نے مجھے خوبصورت دبیز مخمل کا لباس دیا اور کہا کہ یہ روایتی افغان لباس ہے باہر نکلنے سے قبل اسے پہن لو اور وہ خود سارے کمرے سے باہر نکل گئے تا کہ میں لباس تبدیل کرلوں...... آخر کار جب میں طورخم بارڈر پر پہنچی اور میں نے افغانستان سے باہر پاکستان میں قدم رکھا ہی تھا کہ میرا چہرہ ٹیلی ویژن کیمروں کی روشنیوں سے چمکنے لگا۔ میں وقتی طور پر چکرا سی گئی، مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک آواز آئی ''طالبان نے آپ سے کیا سلوک کیا؟'' گزرے ہوئے دس دنوں کی تمام یادیں اور ذہنی کرب سب میرے لوح ذہن پر نمودار ہونے لگے۔ میں نے جواب میں کہا ''شائستگی اور احترام کا سلوک'' میں سوچتی ہوں کہ ان کے اندر ہمارے خلاف کوئی کینہ معلوم نہیں ہو رہا۔ نامعلوم ان پر بمباری کیوں کی گئی؟''

ایون ریڈلی کی ایام اسارت کی خودنوشت یہ داستان دنیا کے مختلف مغربی و مشرقی ذرائع ابلاغ نے شائع کی۔ ریڈلی نے چونکہ اپنی قید کے دوران طالبان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسلام کا مطالعہ کرے گی۔ چنانچہ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۳۰ رجون ۲۰۰۳ء کو اس نے اپنے قبول اسلام کا اعلان کردیا۔ جون ۲۰۰۴ء میں سعودی عرب سے شائع ہونے والے انگریزی و عربی کے ایک رسالے الحج والعمرہ'' نے ریڈلی کا ایک انٹرویو شائع کیا۔ اس انٹرویو میں ریڈلی سے جب یہ پوچھا گیا کہ گوانتاناموبے کے ایکسرے کیمپ اور کابل کے قید خانے کا موازنہ آپ کس طرح کرتی ہیں، تو اس نے کہا:

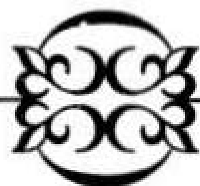
''میں لوگوں کو بتاتی رہتی ہوں کہ میں اس حوالے سے بہت خوش قسمت واقع ہوئی ہوں کہ مجھے امریکہ کی بجائے ''روئے زمین کے سب سے زیادہ برے اور وحشی لوگوں'' کی قید میں رہنے کا موقع ملا۔ مجھے مسلسل چھ دن تک ایک ائیر کنڈیشنڈ کمرے میں رکھا گیا جس کی چابی تک مجھے دے دی گئی۔ میرے ساتھ ہمدردی اور احترام کا سلوک کیا گیا۔ مجھے ذہنی یا جسمانی طور پر ہراساں کرنے، کسی قسم کی تعذیب دینے یا حملہ کرنے کی کوشش نہیں ہوئی، گو کہ کچھ سوال جواب ضرور ہوئے۔ وہ مجھے مسلسل یہ بتاتے رہے کہ وہ مجھے خوش رکھنا چاہتے ہیں اور یہ کہ میں ان کی بہن اور مہمان ہوں۔''

اپنے اس انٹرویو میں ریڈلی نے کہا کہ ٹونی بلیئر اور جارج بش نے طالبان کی سب خوبیوں کے باوجود انہیں ایک بہت بڑی برائی کے طور پر پیش کیا۔ ریڈلی نے طالبان کو ''شائستہ لوگ'' کہہ کر یاد کیا۔

طالبان کی قیدی اس برطانوی خاتون کی باتوں کا موازنہ جب ہم امریکی خواتین کے بارے میں جاری ہونے والی ایک رپورٹ سے کرتے ہیں تو ہمیں حقائق بہت آشکار انظر آتے ہیں۔ اس رپورٹ کے مطابق امریکی جیلوں میں جو خواتین قید ہیں، ان کی عزت و ناموس جیل کے مرد اہلکاروں کے ہاتھوں ہر وقت خطرے میں رہتی ہے۔ ۳۷ امریکی ریاستوں کی جیلوں میں قید خواتین کی بے حرمتی روز کا معمول ہے، اور ان خواتین پر مردوں کے مجرمانہ حملے، بے حرمتی اور گالیاں کسی قسم کے جرم کے زمرے میں نہیں آتیں امریکی فوج نے کچھ عرصہ قبل عراقی قید خانے ابوغریب میں عراق کی مسلمان قیدی خواتین کے ساتھ جو سلوک کیا، وہ بھی طالبان اور امریکہ کے درمیان فرق کو واضح کرتا ہے۔ ابوغریب جیل سے ایک مسلمان لڑکی ''نور'' کا خط حال ہی میں سامنے آیا ہے، اس خط میں نور لکھتی ہے کہ:

> ''ہمارے پاکیزہ دامن آلودہ اور سر ڈھانپنے والے آنچل دریدہ ہو چکے ہیں...... امریکی درندے ہم پر ایسے ستم ڈھاتے ہیں جو جسم پر ہی نہیں، روح پر بھی آبلے ڈال دیتے ہیں۔ ان کی ہوس اور شیطنیت ہم کمزوروں پر اپنے پنجے گاڑھ دیتی ہے تو ہم میں احتجاج کی سکت بھی نہیں ہوتی۔ ہم کو ہر عصمت لٹا چکی ہیں اور اب آنکھیں بند کئے موت کی منتظر ہیں کہ جینے کو کچھ بچا ہی نہیں''

طالبان نے افغانستان میں عورتوں کیلئے جو قوانین اور پالیسیاں نافذ کیں، ان سے کیسے خوشگوار اثرات مرتب ہوئے؟ اس امر کا اندازہ طالبان کے جانے کے بعد افغان خواتین کی تشویشناک صورتحال سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ ''جدید افغانستان'' میں خواتین کی حالت زار کی مختصر تفصیلات آپ ''طالبان کے بعد'' کے عنوان سے اسی کتاب میں ملاحظہ فرمائیں گے۔





میں نے کابل بستے دیکھا

افغانستان کے خلاف اقوام متحدہ کی جانب سے اقتصادی پابندیاں عائد ہونے میں صرف ایک دن باقی تھا۔ جب میں نے اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ ۱۳رنومبر ۱۹۹۹ء کی دوپہر بارہ بجے چمن بلوچستان کے مقام پر پاک افغان بارڈر کراس کرکے اپنے فرائض منصبی سرانجام دینے کیلئے سرزمین افغانستان پر قدم رکھا۔ میں اس سے پہلے بارہا افغانستان کا سفر کرچکا تھا لیکن حالیہ سفر اس لحاظ سے بالکل مختلف نوعیت کا تھا کہ اس مرتبہ خصوصی طور پر افغانستان کی تازہ ترین صورتحال کا جائزہ لینے گیا تھا۔ دراصل امریکہ کے اشاروں پر اقوام متحدہ کی جانب سے افغانستان جیسے تباہ حال ملک پر اقتصادی پابندی کے اعلان نے ہر شخص کو ششدر کر کے رکھ دیا تھا۔ بیرونی دنیا کا ہر فرد یہی سوچ رہا تھا کہ اب اس ملک کو زبردست اقتصادی ومعاشی بحران سے دوچار ہونا پڑے گا اور اس کے نتیجے میں طالبان حکومت کو بہر صورت اپنی پالیسیوں میں لچک پیدا کرنی ہوگی۔ یہی وہ خیالات تھے جو میرے اس سفر کا باعث بنے۔

ہماری گاڑی جس کی بکنگ کوئٹہ تک کروائی گئی تھی جب سرحدی چوکی پر پہنچی تو معلوم ہوا کہ حکومت پاکستان نے اقوام متحدہ سے ایک روز پہلے ہی گاڑیوں کے ذریعہ افغانستان میں داخلے پر پابندی لگادی ہے۔ یہ پابندی عالمی پابندیوں کی ابتداء تھی یا ایک روز قبل اسلام آباد میں امریکی اور سعودی سفارت خانوں کے قریب ہونے والے دھماکوں کا منطقی نتیجہ؟ میں کچھ فیصلہ نہ کرسکا۔ بہرحال ہم نے پیدل ہی سرحد پار کی اور افغانستان میں داخل ہوگئے۔



پاکستانی سرحد سے ملحق افغانستان کا پہلا علاقہ ''ویش'' نامی ہے۔ جو دنیا بھر کی الیکٹرک مصنوعات کی بہت بڑی منڈی ہے۔ یہ مارکیٹ جو ریڈیو، ٹیپ اور کمپیوٹر وغیرہ کی خریداری کیلئے پورے پاکستان اور افغانستان میں مشہور و معروف ہے نہ صرف افغان تاجروں کیلئے بلکہ پاکستانیوں کیلئے بھی بہت مفید ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ جہاں آپ کو اس میں افغان تاجر خریداری کرتے ہوئے نظر آئیں گے وہاں پاکستان کے پٹھان تاجروں کی بھی کمی نہیں ہے۔ بلکہ یہاں سے صرف سو میٹر کے فاصلے پر واقع پاکستانی سرحد پر نظر دوڑائیں تو کراچی کے تاجر بھی افغان لڑکوں کے ذریعے اس سامان کی خریداری میں سرگرم عمل نظر آئیں گے۔ لیکن طالبان کے دور میں یہ لوگ افغان سرزمین میں داخل نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ ان کے چہروں پر اسلامی شناختی علامت ''داڑھی'' نہیں ہوتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ امریکہ کی جانب سے عائد شدہ پابندیوں اور پھر اقوام متحدہ کی جانب سے کیے گئے اعلان نے اس منڈی کی رونق کو تہہ و بالا کر دیا ہوگا لیکن وہاں پہنچے تو اس بازار میں پہلے سے بھی زیادہ رش پایا۔

ویش بارڈر پر واقع اتنی بڑی الیکٹرانک منڈی کے قیام کا سہرا طالبان حکومت کو جاتا تھا جنہوں نے اپنے ملک میں درآمد شدہ تجارتی سامان پر ٹیکس کی شرح انتہائی کم کر کے نہ صرف افغانستان میں تجارت کی راہیں ہموار کیں بلکہ پاکستانی تاجروں پر بھی احسان کیا۔ ''ویش'' ہی میں استعمال شدہ گاڑیوں کی بھی ایک بہت بڑی مارکیٹ تھی۔ جہاں عرب امارات سے درآمد شدہ مستعمل گاڑیاں بہترین حالت میں فروخت ہوتی تھیں اور ان کی قیمتیں بھی اس قدر کم تھیں کہ جو گاڑی آپ کو پاکستان میں نو دس لاکھ سے کم میں نہیں مل سکتی وہی گاڑی آپ اس مارکیٹ سے ڈیڑھ دو لاکھ میں باسہولت خرید سکتے تھے۔ اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ طالبان حکومت نے ان گاڑیوں پر صرف دس فیصد ٹیکس مقرر کر رکھا تھا۔ لیکن یہی گاڑی آپ پاکستان مین لانا چاہیں تو آپ کو اس کی قیمت کی دوگنی رقم بطور کسٹم ٹیکس ادا کرنی پڑتی تھی۔

ویش کی یہ گرم بازاری طالبان حکومت کے دوران خوب عروج پر رہی۔ لیکن اب جب کہ افغانستان پر امریکی تسلط کے بعد وہاں کا نظام حکومت بدل چکا ہے تو ویش بھی اپنی رونقیں کھو چکا ہے۔ اس بے رونقی کی بڑی وجہ پاک افغان بارڈر پر قائم کڑی نگرانی ہے جس کے ذریعے ہر آنے جانے والے شخص پر نگاہ رکھی جاتی ہے۔



ویش سے دو گاڑیوں میں سوار ہو کر ہم اسپین بولدک پہنچے۔ یہ وہی مقام ہے جس پر طالبان نے

سب سے پہلے قبضہ کر کے اپنی عظیم الشان فتوحات کی بنیاد رکھی تھی۔ بولدک پہنچ کر دوپہر کے کھانے کیلئے ایک ہوٹل کا رخ کیا۔ جہاں چاول، گوشت اور سبزی پکی ہوئی تھی۔ ہمارے قافلے کو دیکھتے ہی ہوٹل کے مالک کی باچھیں کھل گئیں۔ شاید ایک ہی وقت میں اتنے زیادہ گاہک اسے کبھی کبھی ہی نصیب ہوتے تھے۔ بہر حال یہاں کھانے کی قیمتیں معلوم کیں تو اس طرح تھیں۔ سبزی ۲۵۰۰۰ ہزار افغانی، گوشت اور پلاؤ ۳۰۰۰۰ افغانی۔ سبزی اور گوشت کے پیسوں میں ایک اتنی بڑی روٹی کی قیمت بھی شامل تھی جو ہمارے ہاں کی کم از کم چار تنوری روٹیوں کے برابر ہوتی ہے۔ یہ روٹی علیحدہ لینے پر ۸۰۰۰ کی ملتی تھی اور پلاؤ کی ایک خوراک میں چاول کی ایک پلیٹ، گوشت کی ایک چھوٹی پلیٹ اور آدھی روٹی شامل تھی۔ کھانے کی قیمتیں سن کر سب حیران رہ گئے۔ لیکن اس سے زیادہ حیرانگی اس وقت ہوئی جب سب نے خوب سیر ہو کر کھانا کھانے کے بعد بل پوچھا تو ساڑھے تین لاکھ افغانی بنا تھا۔ جو پاکستانی صرف ۳۷۵ روپے بنتے تھے۔ ایکس افراد کا اتنے کم پیسوں میں سیر ہو کر کھانا کھالینا قطعاً مہنگا نہیں تھا۔ افغانستان میں ہوٹلوں میں کھانے کی مناسب قیمتیں واقعی حیران کن تھیں اور اس سلسلہ میں سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہاں شاہراہ عام پر واقع ہوٹلوں میں مسافروں کو اس طرح لوٹا نہیں جاتا تھا جیسا کہ پاکستان میں ہوتا ہے۔ ان مسافر ہوٹلوں کی قیمتیں وہی تھیں جو شہری ہوٹلوں کی۔ کھانے کے بعد ہم نے بقدر ضرورت کرنسی تبدیل کرائی تو ہمیں ۱۰۴ روپے کے بدلے ایک لاکھ افغانی کرنسی ملی۔ یعنی ایک روپے کے نو سو ساٹھ افغانی۔ ایک سال قبل جب میں افغانستان آیا تھا تو ان دنوں عموماً ایک روپے کے ۵۷۷ افغانی ملتے تھے۔ کرنسی میں یہ زوال امریکہ اور اقوام متحدہ کی جانب سے پابندیوں کے اعلان کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔

بولدک سے قندھار تک ایک سو کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ لیکن یہ روڈ اس قدر خراب تھا کہ سفر کار میں دو گھنٹوں میں، ہائی ایس میں تین گھنٹے میں اور بس میں پانچ گھنٹوں میں طے ہوتا تھا۔ ایک سال قبل طالبان نے از سر نو اس سڑک کی تعمیر کا پروگرام بنایا تھا لیکن وہ اس قدر مہنگا تھا کہ طالبان اس کو پورا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ اس روڈ کے بارے میں حکومت پاکستان نے بھی وعدہ کیا تھا کہ وہ تعمیر کروائے گی لیکن وہ وعدہ بھی وفا نہ ہو سکا۔ اس صورتحال میں طالبان نے خود ہی اس سڑک کی مرمت کا کام شروع کر رکھا تھا اور اب تک کم از کم بیس فیصد راستہ ہموار ہو چکا تھا۔

مغرب سے کچھ دیر پہلے ہم قندھار پہنچ گئے۔ جہاں ہم نے صرف ایک رات قیام کرنا تھا اور یہ قیام

فوجی چھاؤنی کے مہمان خانے میں ہونا تھا۔



قندھار شہر کا بازار اتنا بڑا نہیں کہ آپ کو اس میں گھومنے پھرنے کیلئے سواری کی ضرورت ہو۔ ویسے بھی یہ چھاؤنی کے قریب ہی واقع ہے۔ لہٰذا ہم نے پیدل ہی اس کی سیر کا پروگرام بنایا۔ اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلے قندھار شہر کے مشہور ''ہرات بازار'' میں پہنچے، جہاں اب بھی لوگوں کی چہل پہل جاری تھی۔ حالانکہ یہ وہی شہر تھا جہاں آج سے صرف پانچ سال قبل مغرب کے بعد دکان کھولنا تو کجا گھر سے باہر قدم رکھنا بھی محال سمجھا جاتا تھا۔ جبکہ آج رات کے نو بج رہے تھے اور بیشتر دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ دوستوں کا اصرار تھا کہ افغانی آئسکریم ''شیریخ'' کھانی ہے، چنانچہ ہم آئسکریم کی دکان پر جا پہنچے۔ چھ ہزار افغانی (تقریباً سات روپے) فی کپ کے حساب سے ہر شخص نے ایک ایک کپ آئسکریم کھائی۔ آئسکریم کا معیار بلند جبکہ قیمت بالکل کم تھی۔ آئسکریم کھا کر ہم نے چوک شہداء سے دو من انار خریدے (جو پاکستانی دس کلو بنتے ہیں) قندھار میں انار کے موسم کے یہ آخری دن چل رہے تھے اور اب یہ اپنی عام قیمت سے کافی مہنگے ہو چکے تھے لیکن پھر بھی ہمیں دس کلو انار نوے ہزار افغانی (تقریباً پچانوے روپے پاکستانی) کے ملے۔ ایک اور دکان سے بیس ہزار افغانی فی کلو کے حساب سے دو کلو انگور خریدے۔ یاد رکھئے! اگر آپ کو قندھار جانے کا اتفاق ہوا اور آپ نے وہاں کے انار اور انگور نہیں کھائے تو سمجھئے آپ نے قندھار دیکھا ہی نہیں۔ تھوڑی سی دیر میں لاکھوں کی ''شاپنگ'' کرکے ہم مہمان خانے میں واپس پہنچ گئے جہاں کھانا ہمارا منتظر تھا۔



صبح فجر کی نماز کے بعد ناشتہ کیا اور پھر کابل کے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ دن کے ساڑھے دس بجے دو ٹویوٹا ہائی ایس گاڑیاں قندھار سے کابل کیلئے روانہ ہوئیں۔ جن میں ہم کل چھبیس افراد سوار تھے۔ اس سفر کے آغاز میں ایک ایسا معاملہ پیش آیا جس سے ہمیں طالبان حکومت کے حسن انتظام کا اعتراف کرنا پڑا۔ ہوا یوں کہ جب ہم نے چھبیس افراد کے گروپ کی شکل میں کابل تک کیلئے سواری تلاش کرنا چاہی تو معلوم ہوا کہ بہ یک وقت اتنے افراد کیلئے گاڑیاں دستیاب نہیں۔ کیونکہ دونوں شہروں کے درمیان آمد و رفت بہت زیادہ تھی، کاروباری افراد اور سامان تجارت بھی بڑے پیمانے پر نقل و حرکت میں تھا، لہٰذا گاڑیوں کی شدید قلت ہو گئی تھی۔ ایسے عالم میں جب ہمیں دو گاڑیوں کے ڈرائیور نے ۷۵ ہزار افغانی فی

سواری کی بجائے ایک لاکھ افغانی بتایا تو ہم نے اسی کو غنیمت جانا اور ان سے معاملہ طے کرلیا۔ گاڑیوں میں سوار ہونے کے بعد جب ہم شہر سے باہر نکل کر طالبان کی پہلی چیک پوسٹ پر پہنچے تو وہاں کسی سواری کی کھسر پھسر سے طالبان اہلکاروں کو بھنک پڑ گئی کہ ڈرائیوروں نے کرایہ زیادہ لیا ہے۔ انہوں نے ہم سے پوچھا تو ہم نے بھی تصدیق کی۔ یہ صورتحال جان کر سرکاری اہلکاروں نے ڈرائیوروں کو ڈانٹا اور کہا کہ تم نے قانونی طور پر طے شدہ کرائے سے زیادہ کیوں وصول کیے ہیں؟ اور پھر یہ تو پردیسی مہمان ہیں۔ ان سے تم نے ایسا سلوک کیوں کیا؟ ڈرائیور لا جواب تھا اور طالبان برہم۔ چنانچہ ہم نے معاملہ رفع دفع کروایا لیکن طالبان نے بھی چوکی کی زنجیر اس وقت تک نیچے نہیں کی جب تک کہ ڈرائیوروں نے زائد وصول کردہ رقم ہمیں واپس نہیں کردی۔

ایک مسلسل جاری رہنے والی جنگ کے دوران ایسے چھوٹے چھوٹے معاملات کی نگرانی اور ان پر کنٹرول طالبان کے حسن انتظام کی بہترین مثال تھا۔

قندھار کے مرکزی دروازے سے نکلتے ہی سڑک کی دائیں جانب قندھار کا مشہور اسپتال ''مستشفیٰ عمر'' واقع تھا۔ یہ شاندار عمارت والا ہسپتال سابقہ دور کی نشانی تھی لیکن مختلف جنگوں کے دوران یہ عمارت بذات خود عبرت کا نمونہ بن گئی تھی۔ طالبان نے آکر اس کی تعمیر نو کی اور آج اس میں بیس سے زائد تجربہ کار ڈاکٹروں کا عملہ علاج معالجہ کی خدمات سرانجام دے رہا تھا، جن میں سے بیشتر پاکستانی تھے۔ اس ہسپتال میں ہر قسم کی طبی سہولت مہیا کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور اس کی افادیت کا اندازہ اس امر سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ بسا اوقات یہاں ایک ایک دن میں دس دس کامیاب آپریشن کیے جاتے تھے۔ سنا ہے کہ افغانستان پر امریکی حملوں کے دوران یہ اسپتال ایک مرتبہ پھر کھنڈر بن گیا ہے۔

☆ ☆

مستشفیٰ عمر سے گزر کر ہم قندھار سے کابل جانے والی سڑک سے ذرا فاصلے پر واقع قشلہ جدید نامی مقام میں واقع اس عظیم الشان قبرستان میں پہنچے جس میں وہ مبارک ہستیاں مدفون ہیں جنہوں نے اپنے جوان لہو سے سرزمین افغان کی آبیاری کی، جنہوں نے تحریک طالبان کے پرچم تلے اپنے خون کے نذرانے پیش کرکے اسلامی پرچم کو بلند کیا۔ اس وسیع وعریض قبرستان کی ایک جانب تقریباً ایک سو قبریں ہیں جن میں مختلف اوقات میں شہید ہونے والے علماء اور طلباء مدفون ہیں۔ انہی میں ان چودہ پاکستانی طلباء کی قبریں بھی ہیں جنہیں دو سال قبل بامیان جیل میں شہید کردیا گیا تھا۔ قبرستان کی دوسری جانب

ایک بہت بڑی چار دیواری میں واقع تین ہزار سے زائد قبریں ان عظیم المرتبت شہداء کی ہیں جنہیں محرم ۱۴۱۷ھ میں پیش آنے والے سانحہ مزار شریف کے نتیجے میں شمالی افغانستان کے صحراؤں اور ریگستانوں میں انتہائی بے دردی سے شہید کر دیا گیا تھا۔ ایک ایسی مسحور کن مہک، جس کی مثال کسی بھی عام خوشبو سے نہیں دی جاسکتی، سے معطر اس گلزار شہداء پر عقیدت کے پھول نچھاور کر کے ہم گاڑیوں میں سوار ہو کر کابل کی طرف روانہ ہو گئے۔

قندھار سے کابل تک ۵۲۵ کلومیٹر کا راستہ ہے جس پر روس سے بھی پہلے دور میں پختہ سڑک تعمیر کی گئی تھی۔ لیکن بیس سال سے زائد عرصہ پر محیط جنگ میں یہ سڑک بھی مکمل طور پر تباہ ہو چکی تھی۔ افغانی لوگ بتاتے ہیں کہ جب یہ روڈ صحیح تھا تو اس وقت ہم ۶ گھنٹے میں قندھار سے کابل تک سفر کرتے تھے لیکن تباہی کے بعد یہ سفر اگر پرائیویٹ گاڑی میں کیا جائے تو جب بھی اٹھارہ گھنٹے سے کم وقت میں طے نہیں ہو سکتا تھا۔ طالبان حکومت نے اپنی گوناں گوں اقتصادی مشکلات کے باوجود جگہ جگہ سے اس کی تعمیر نو کا کام شروع کیا ہوا تھا۔ جو اگرچہ کافی سست تھا لیکن پھر بھی قابل ہزار ستائش تھا۔ خاص طور پر اب، جب کہ آج صبح سے افغانستان کے خلاف اقوام متحدہ کی اقتصادی پابندیوں کا اطلاق ہو چکا تھا لیکن میں نے جگہ جگہ دیکھا کہ سرکاری کارندے اب بھی حسب معمول اپنے وطن کی تعمیرِ نو میں مگن تھے۔



ان دنوں قندھار سے صبح سویرے چلنے والی گاڑیاں رات ''غزنی'' میں قیام کرتی تھیں لیکن ہماری گاڑی مغرب کے بعد غزنی سے پانچ گھنٹے کی مسافت پر ''گمرک'' کے مقام پر خراب ہو گئی چنانچہ رات ہم وہیں ٹھہرے۔ رات کے آخری پہر میں تین بجے وہاں سے دوسری گاڑیاں کرائے پر لیکر غزنی کیلئے روانہ ہوئے۔ غزنی پہنچ کر کابل کیلئے گاڑی تبدیل کی اور اپنی منزل کی جانب چل دیئے۔

غزنی شہر سے نکل کر ''روضہ شریف'' نامی علاقہ آتا ہے، جہاں تاریخ اسلام کے مشہور بادشاہ سلطان محمود غزنویؒ کا مزار ہے۔ یہ وہ عظیم فاتح ہیں جنہوں نے موجودہ افغانستان کے علاوہ وسطی ایشیا، ایران اور برصغیر کے بیشتر علاقوں پر مثالی حکمرانی کی اور ہندوستان پر پے در پے حملے کر کے اس بت کدے کو اسلام کی روشن کرنوں سے منور کیا۔

مزار پر بنی ہوئی قدیم، سادہ طرز مگر پرشکوہ اس بلند عمارت کے احاطے میں اس عظیم بادشاہ کی آخری آرامگاہ کے پاس گزرنے والے چند ہی لمحوں میں اپنے تابناک ماضی کے ہزار ہا اوراق تصور کی

نظر سے گزر گئے جن میں سے ہر ایک ورق پر اس شہنشاہ جیسے لاکھوں فرزندان اسلام نے اپنا لہو دیکر عظمت و عزیمت کی ہزار ہا داستانیں رقم کی تھیں۔ وہی داستانیں جو آج قصہ پارینہ بن چکی ہیں۔

سلطان کے مزار پر دعا کرنے کے بعد ہم گاڑیوں کی طرف واپس لوٹ رہے تھے کہ سامنے کی جانب سے جہاد افغانستان کے فاتح مولانا جلال الدین حقانی اپنے رفقاء کے ہمراہ آتے دکھائی دیئے۔ جو طالبان حکومت میں وزیر سرحدات کے عہدہ پر فائز تھے۔ جہاد افغانستان کا ایک ناقابل فراموش کردار، عظیم گوریلا کمانڈر، افغانستان کے وفاقی وزیر انتہائی خاموشی کے ساتھ، پروقار انداز میں سلطان کے مقبرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں چونکہ اس سے قبل کمانڈر حقانی سے مل چکا تھا چنانچہ پہچان لیا اور سلام دعا کی۔ اس کے بعد ہم گاڑیوں میں سوار ہوئے اور پھر کابل کی طرف روانہ ہو گئے۔



شام کے چار بج رہے تھے جب ہم افغان دارالحکومت کابل شہر میں داخل ہوئے۔ کابل میں داخل ہوتے ہوئے سب سے پہلے جس خوشگوار صورتحال کا سامنا ہوا وہ یہ تھی کہ شہر کے بازار میں دس بارہ بڑے بڑے ٹرالر کھڑے تھے جن میں کئی ٹن گندم لدی ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ گندم کی یہ کھیپ ابھی ابھی ترکمانستان سے پہنچی ہے۔ ہماری گاڑیاں کابل کے مشہور بازار پل خشتی سے ہوتی ہوئی چھاؤنی میں پہنچیں۔ دو دن کے تھکا دینے والے سفر کی وجہ سے کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس وقت شہر کی سیر کو نکلتا۔ لہٰذا ہر قسم کی تفریح آنے والی کل تک مؤخر کر کے آرام کرنے کا فیصلہ کیا۔

اگلے دن سے کابل میں ہمارا قیام شہر کے جنوب میں واقع ایک چھاؤنی میں ہونا تھا۔ ریش خور نامی حکمت یار کی اس تباہ شدہ چھاؤنی کو از سر نو آباد کر کے طالبان نے بہترین قسم کی فوجی قرارگاہ قائم کی تھی۔ چھاؤنی کے گیٹ پر لشکر محمدی کا بڑا سا سفید پرچم لہرا رہا تھا، جبکہ دو طلبہ پہرے پر موجود تھے۔ ان سے اجازت لے کر ہم اندر پہنچے اور چھاؤنی کے بعض ذمہ داروں سے مختصر سی ملاقات ہوئی۔ اسی دوران معلوم ہوا کہ کچھ ہی دیر بعد چھاؤنی سے طالبان کی ایک جماعت محاذ کی جانب روانہ ہونے والی تھی۔ میں اس وقت اگرچہ صرف کابل کے حالات کا جائزہ لینے آیا تھا لیکن لگے ہاتھوں ملنے والا اگلے مورچوں (جسے افغانی اصطلاح میں خط اول یا کمر بند کہا جاتا ہے) کی سیر کا یہ موقع ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ ان کے ساتھ محاذ کی طرف روانہ ہو گیا۔



گذشتہ سال جب میں کابل آیا تھا تو طالبان کا خط اول کابل کے مغرب میں قلعہ مراد بیگ اور شمال میں بگرام کے علاقے تک تھا۔ لیکن اب یہاں سے تقریباً تین ماہ قبل طالبان پیش قدمی کرتے ہوئے گزشتہ محاذوں سے ۲۵ کلومیٹر آگے بڑھ گئے تھے۔ چنانچہ ہماری گاڑی قلعہ مراد بیگ کی پہاڑی کو پیچھے چھوڑتی ہوئی تیزی سے اس سڑک پر آگے بڑھ گئی جو کابل سے پنج شیر کی طرف جاتی ہے۔ مراد بیگ کی یہ پہاڑیاں وہ تاریخی مقام ہے جہاں سے آگے بڑھنے کیلئے طالبان کو دو سال تک انتظار کرنا پڑا اور پھر ۵۰۰ سے زائد جوانوں کا لہو دشمنوں کو یہاں سے دور بہا کر لے گیا۔

قلعہ مراد بیگ کے بعد تقریباً آدھے گھنٹے کا سفر کر کے ہم قرہ باغ پہنچ گئے جہاں موجودہ محاذ کی فرنٹ لائن تھی۔ یہاں سے دشمن کے مورچے بھی بالکل قریب تھے اور صاف طور پر دکھائی دیتے تھے۔ چنانچہ دن میں کئی مرتبہ فریقین کے مابین فائرنگ کا تبادلہ بھی ہوتا رہتا تھا۔ میں نے وہ دن اور اس سے اگلی رات انہی مورچوں میں گزاری۔

اللہ کے دین کی سربلندی اور ملت اسلامیہ کی حفاظت کی خاطر اپنی جانوں کو ہتھیلیوں پر رکھ کر دن رات موت کے منہ میں رہنے والے ان شاہین صفت نوجوانوں کے ساتھ گزرنے والی وہ چند ساعتیں وجد آفریں تھیں۔ میں نے خط اول (فرنٹ لائن) پر جو نوجوان دیکھے ان میں سے بیشتر کی عمریں ۱۸ سے ۲۵ سال کے درمیان تھیں۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کی آنکھوں میں بلا کی چمک اور چہروں سے چھلکنے والے شجاعت کے آثار واقعی مسحور کن تھے۔ دنیا بھر کی طرف سے ملنے والے ''بنیاد پرست' مذہبی جنونی' جذباتی'' جیسے تمغے سینوں پر سجائے ان نوجوانوں کو جب میں نے ہر قسم کی آسائش و راحت سے بے نیاز ہو کر دشت و بیابان میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر مورچہ زن پایا تو اقبال مرحوم کا پیغام یاد آ گیا۔

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

خط اول پر قیام کے دوران کچھ دیر کیلئے عرب مجاہدین کے مورچوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ مصر، یمن، سوڈان اور نہ جانے کہاں کہاں سے اٹھ کر آنے والے یہ عرب شہزادے آج دنیا کی ہر راحت کو ٹھکرا کر اپنے بلند مقصد کی جستجو میں ان مورچوں میں کانٹوں کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے تھے۔ ان عرب مجاہدین کے عقابی چہرے اور ہمالہ کو بھی شرما دینے والے بلند حوصلے دیکھ کر مجھے ان کا مرتبہ اتنا عالیشان لگا کہ تیل خزانوں کے مالک، عرب شہنشاہ ان کے پیروں کی خاک محسوس ہونے لگے۔

عرب مجاہدین کے امیر شیخ سعدی تھے۔ ان سے کافی تفصیلی گفتگو رہی۔ ہم نے جب ان سے اقتصادی پابندیوں کے بارے میں پوچھا تو مسکرا کر کہنے لگے "ہمارا مالک اللہ ہے، رزق اسی کے ہاتھ میں ہے، کلنٹن کے ہاتھ میں نہیں"

انہوں نے بتایا کہ "اگر معاملہ صرف شیخ اسامہ کا ہوتا تو وہ کب کے افغانستان چھوڑ کر جا چکے ہوتے لیکن انہیں یقین ہے کہ اصل ہدف وہ نہیں بلکہ طالبان ہیں۔"

دوران گفتگو میں نے کئی مرتبہ ان عرب مجاہدین کے مسکراتے چہروں کا بغور جائزہ لیا۔ لیکن ان میں بناوٹ کا شائبہ تک نہ تھا۔

خط اول پر ایک یادگار دن گزار کر دوسرے دن میں واپس کابل پہنچ گیا۔ جہاں اب میرے دوست محترم سیف اللہ بھی آ چکے تھے جنہوں نے پروگرام کے مطابق مجھے شہر کی سیر کرانی تھی۔ چنانچہ ان کے ساتھ مل کر کابل شہر کے تفصیلی جائزے کا پروگرام طے کیا اور اس پر اسی دن سے عمل شروع کر دیا۔ اس کے بعد میں تین دن کابل میں رہا۔ میں نے وہاں کیا دیکھا؟ چند مشاہدات قارئین کی نذر کر رہا ہوں۔



امن انسانی معاشرے کی بنیادی ضرورت ہے۔ لیکن افغان قوم کی بدقسمتی کہ گذشتہ پچیس سال سے زائد عرصے تک امن کی فاختہ نے گلشن افغان کا رخ نہیں کیا۔ طالبان کی آمد سے قبل صرف کابل ہی نہیں پورا افغانستان بری طرح خانہ جنگی اور قتل و غارتگری کا شکار تھا۔ جگہ جگہ پر عوامی راستوں میں پھاٹک لگا کر غریب عوام کو لوٹنا، عورتوں کی عصمت دری کرنا، قومی تعصب کی بناء پر قتل کرنا اور راہزنی اور چوری چکاری کی وارداتیں عام تھیں۔ خوف و ہراس کا یہ عالم تھا کہ کوئی شخص شام کو اندھیرا پھیلنے کے بعد گھر سے نکلنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ خود کابل شہر کا عجیب و غریب حال تھا۔ اس شہر کی گلیوں میں کبھی احمد شاہ مسعود کے فوجیوں کی حکومت ہوتی اور کبھی جنرل دوستم کی ملیشیا دندناتی پھرتی اور پھر جب مسعود، سیاف، حزب وحدت اور حکمت یار کے مابین فائرنگ کے تبادلے ہوتے تو پورا کابل شہر لرز جاتا اور ان سب باتوں سے بڑھ کر حزب وحدت کے جنگجوؤں کے وہ انسانیت سوز جرائم تھے جن کے بارے میں سن کر انسان کا دل لرز کر رہ جاتا ہے۔ حزب وحدت کا مرکز کابل شہر کا جنوبی حصہ تھا جہاں باغ وحش (چڑیا گھر) واقع ہے۔ باغ وحش کے بالکل قریب ایک بڑا سا چوک ہے، چوک کی تین اطراف میں اجڑی ہوئی دکانیں ہیں، جو اب کسی کھنڈر کا منظر پیش کرتی ہیں۔ مجھے محترم سیف اللہ نے بتایا کہ حزب

وحدت والے رات کے اندھیرے میں کابل شہر سے سنّی نوجوانوں کو اغواء کر کے لاتے اور پھر یہاں ان دکانوں میں ان کے ہاتھ پاؤں آہنی میخوں کے ساتھ دیواروں میں گاڑھ دیتے۔ انہوں نے بتایا کہ آج بھی ان مظلوم سینوں کے خون کے نشانات ان دکانوں کی دیوار پر موجود ہیں۔ میرے کہنے پر انہوں نے وہ دردناک مناظر مجھے بھی دکھلائے۔

غرضیکہ طالبان کی آمد سے قبل پورے افغانستان میں ہر طرف جور وستم کا راج تھا۔ لیکن آج کا کابل چار سال قبل کے کابل سے بالکل مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ آپ پورے شہر میں گھوم جائیں آپ کو کہیں بھی کسی قسم کے جرم کا نام ونشان نہیں ملے گا۔ شہر کے تمام باشندوں کو معلوم تھا کہ رات دس بجے سے پہلے پہلے وہ مکمل آزادی کے ساتھ گھوم پھر سکتے ہیں۔ البتہ حفاظتی انتظامات کے پیش نظر رات دس بجے سے صبح چار بجے تک کرفیو نافذ رہتا تھا۔ امن وسلامتی کا یہ عالم تھا کہ طالبان حکومت نے یہاں تک دعویٰ کیا کہ ہم عالمی اداروں کو دعوت دیتے ہیں کہ ''وہ ایک کھلی گاڑی میں سونا چاندی بھر کر قندھار سے کابل تک لے جائیں، چوبیس گھنٹے کے اس سفر میں کوئی شخص ان کی طرف میلی نگاہ سے بھی نہیں دیکھے گا''۔ اگر بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو پوری دنیا کی تنقید کا نشانہ بننے والی طالبان حکومت کی جانب سے یہ چیلنج جدید دنیا کے منہ پر ذلت آمیز طمانچہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جیسا امن وامان افغانستان میں طالبان نے قائم کیا تھا اس کی مثال آج کے ترقی یافتہ ممالک بھی پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ خصوصاً ہم پاکستانیوں کو تو یہاں کی پر امن فضا کا احساس اور بھی زیادہ ہو رہا تھا کہ پاکستان میں آپ قانون کے رکھوالوں کے سائے سے بھی ڈرتے ہیں اور وہاں تاریک رات میں تنہا سفر کرتے ہوئے بھی کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔

افغانستان میں امن وامان کی یہ صورتحال پیدا کرنے میں طالبان کی اعلیٰ قیادت کا کردار خاصا اہم رہا۔ خود ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ رات کے بارہ بجے گورنر قندھار ملا محمد حسن جو کہ ایک ٹانگ سے معذور بھی تھے، چند طالبان کے ساتھ قندھار کے مشہور شہداء چوک کے پاس کھڑے پہرہ دے رہے تھے۔ مجھے ملا محمد حسن کو اس حال میں کھڑا دیکھ کر اسلام کے خلیفۂ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ یاد آ گئے جو راتوں کو گھوم گھوم کر اپنے عوام کی رکھوالی کرتے تھے اور ان کی خبر گیری کیا کرتے تھے۔

طالبان نے اپنے دور حکومت میں افغانستان میں امن وامان کا جو ماحول قائم کیا، اس کا اعتراف طالبان کے مخالفین نے بھی واضح الفاظ میں کیا ہے۔ پیٹر مارسڈن لکھتے ہیں:

”طالبان کے بارے میں شہرت تھی کہ وہ جس شہر کو فتح کرتے تھے وہاں مہذب انداز سے داخل ہوتے تھے، عام لڑائیوں کی طرح وہ لوٹ مار، قتل وغارت گری اور خواتین کی بے حرمتی جیسے جرائم میں ملوث نہیں ہوتے تھے۔“

ایک اور جگہ وہ لکھتے ہیں:

”ملک کے جنوبی صوبوں اور کابل کے عوام نے طالبان کے قبضے کے بعد اطمینان کا سانس لیا ہے، کیونکہ انہیں بموں اور راکٹوں کی بارش سے نجات مل گئی ہے۔“

پیٹر مارسڈن ایک اور جگہ یوں رقمطراز ہیں:

”بعض دوسرے انسانی حقوق جن کی افغانوں کو تلاش ہے وہ یہ ہیں: ملک میں امن واستحکام، مناسب معیار زندگی، اچھی صحت اور جان ومال کی حفاظت (یعنی انہیں چوری ڈکیتی، تشدد اور آبروریزی کا خطرہ نہ ہو) طالبان نے اپنے ہم وطنوں کو امن وسکون کی دولت تو دے دی ہے، یعنی وہ گھر اور سفر دونوں جگہ چوری ڈکیتی سے کافی حد تک محفوظ ہو گئے ہیں۔ چوری یا آبروریزی کا کوئی خطرہ نہیں ہے اور پہلی حکومتوں کے مقابلے میں ان کا ریکارڈ بہت بہتر ہے۔“

دوسرے طالبان مخالف مصنف احمد رشید امن وسلامتی کے حوالے سے طالبان کے اقدامات کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

”جو علاقے ان کے پاس تھے ان میں لوگوں کو غیر مسلح کر دیا گیا۔ ان پر قانون نافذ کیا گیا۔ شریعت پر عمل کرنا لازمی قرار دیا گیا۔ سڑکیں ٹریفک کے لئے کھل گئیں، جس کے باعث کھانے پینے کی اشیاء کی قیمتوں میں فوری طور پر کمی ہو گئی۔ طویل عرصے سے مصائب برداشت کرنے والی آبادی کیلئے یہ اقدامات خوشگوار تھے۔“

احمد رشید ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

”طالبان نے اپنے فوجیوں کو لوٹ مار سے منع کر رکھا تھا۔“

افغانستان کی اقتصادی اور معاشی صورتحال کا تجزیہ کرتے ہوئے احمد رشید رقمطراز ہیں:

''عالمی خوراک پروگرام میں ۱۹۹۸ء میں غذائی اجناس کی پیداوار کا اندازہ ۸۵ء۳ملین ٹن تھا۔اس سے پہلے سال کی پیداوار سے پانچ فیصد زیادہ۔ ۱۹۷۸ء کے بعد غذائی پیدوار کے لحاظ سے یہ سب سے اچھا سال تھا۔اس سے پتہ چلتا تھا کہ طالبان کے قبضے میں دیہی علاقوں میں امن وقانون کی حالت قدرے بہتر ہوئی ہے۔لڑائی میں کمی آئی ہے اور مہاجروں نے واپس آ کر کھیتی باڑی شروع کردی ہے۔تاہم پاکستان میں ۱۲لاکھ اور ایران میں ۱۴لاکھ افغان مہاجر ابھی تک موجود ہیں۔۱۹۹۲ء اور ۱۹۹۹ء کے درمیان ۴۰ لاکھ مہاجر واپس آ چکے ہیں۔طالبان اور اقوام متحدہ کی ایجنسیوں کو شہروں میں غذائی قلت پر قابو پانے کیلئے ۷ لاکھ ۵۰ ہزار ٹن گندم درآمد کرنا پڑی۔ صاف عیاں ہے کہ افغانستان میں اقتصادی تباہی طالبان کی پیدا کردہ نہیں ہے، انہیں یہ خانہ جنگی ورثے میں ملی ہے، جو۱۹۹۲ء سے مختلف گروہوں نے برپا کررکھی ہے۔''



امن وامان کی بحالی اور مسلم معاشرہ کی ترقی صرف اور صرف شریعت اسلامیہ میں مضمر ہے۔ طالبان سے پہلے حکمرانوں نے اسلام کے نام پر کابل کے اقتدار پر تو قبضہ کرلیا تھا لیکن وہ اس مقصد کو فراموش کر بیٹھے جس کے حصول کیلئے سولہ لاکھ شہداء نے ان کی قیادت میں اپنے خون کا نذرانہ پیش کیا تھا۔طالبان تحریک جب ابتدائی مراحل میں تھی تو اس وقت انہوں نے کابل حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ شریعت نافذ کردے تو طالبان اقتدار کے مطالبے سے دست بردار ہو جائیں گے لیکن اس وقت ربانی حکومت نے طالبان کے اس مطالبے کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔

طالبان کی حیرت انگیز کامیابیوں کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ انہوں نے اول روز سے اپنے مفتوحہ علاقوں میں شریعت نافذ کی۔ملک کی تینوں عدالتوں کے تمام تر فیصلے قرآن وحدیث کی روشنی میں صادر کیے جاتے تھے اور شریعت کے مقابلے میں کسی بھی شخص سے کسی قسم کی کوئی رعایت روا نہیں رکھی جاتی تھی۔

حسن اتفاق کہیے کہ طالبان کے اس عدالتی نظام سے خود مجھے بھی سابقہ پڑ چکا ہے۔اس واقعہ کی تفصیل میں نے کافی عرصہ قبل ایک اخبار میں لکھی تھی، قارئین کی آگاہی کیلئے وہی مضمون پیش خدمت ہے:

یہ آج سے پانچ سال قبل کا ذکر ہے، میں ان دنوں قندھار میں تھا، جب ہمارے بعض دوست افغانستان میں فلاحی ورفاہی کام کے حوالے سے پانی کے کچھ کنویں کھدوانا چاہتے تھے اور بورنگ کروا کر پانی کے پائپ لگوانا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے کوئٹہ کے ایک ٹھیکیدار سے بات کی تھی، چنانچہ فریقین کے مابین ایک معاہدہ طے پایا تھا جس کی رو سے ٹھیکیدار نے اپنا ساز وسامان کوئٹہ سے لانا تھا اور مقررہ میعاد میں بورنگ کر کے دینی تھی۔ مگر ہوا یوں کہ وہ طے شدہ مدت تک کوئٹہ سے اپنا سامان نہ لا سکا اور ہمارے دوستوں نے کسی دوسرے ٹھیکیدار سے معاملہ کر کے بورنگ شروع کروادی۔ اب جب کوئٹہ والا ٹھیکیدار چند دن بعد اپنا سامان لے کر آیا تو ہمارے ساتھیوں نے اس سے کام کروانے سے انکار کر دیا، یوں معاملہ جھگڑے کی صورت اختیار کر گیا۔

ایک دن صبح کے وقت ہمیں اپنی رہائشگاہ پر ایک چھوٹی سی پرچی موصول ہوئی جو دراصل قندھار کی شرعی عدالت کی طرف سے ''سمن'' تھا۔ اس پرچی پر لکھا تھا کہ فلاں شخص (ٹھیکیدار) نے آپ پر دعویٰ کیا ہے لہٰذا کل صبح دس بجے آپ عدالت میں پیش ہوجائیں۔ اس سمن کے ملنے پر ہمارے دوستوں نے مجھے عدالت بھیجنے پر اتفاق کیا کہ میں فارسی اور پشتو میں تھوڑی بہت شد بدر کھنے کے باعث ''اندھوں میں کانا راجہ'' کی طرح تھا۔ دوسری طرف میرے لیے پریشانی کی بات یہ تھی کہ اس سے قبل راقم کو دنیا کے کسی ملک کی کسی بھی عدالت میں کبھی بحیثیت فریق پیش ہونے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ افغانستان تو کجا، مجھے پاکستان کے عدالتی نظام کے بارے میں بھی کچھ معلومات نہیں تھیں، ہاں! بس اتنا معلوم تھا کہ جب بھی کسی کو عدالت میں پیش ہونا ہوتا ہے تو وہ وکیل کی خدمات حاصل کرتا ہے کیونکہ وکیل ہی وہ شخصیت ہوتی ہے جو عدالت عالیہ میں سخن گوئی کی تاب رکھتی ہے۔ مگر یہاں تو جب ہم نے معلومات کیں تو پتہ چلا کہ شرعی عدالت میں پیشی کیلئے وکیل کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ آپ خود جا کر بھی اپنی زبان سے اپنا مؤقف پیش کر سکتے ہیں۔ یہ سن کر ہمیں خوشی بھی ہوئی کہ لیجئے کم از کم اس مملکت کی حدود تک تو شیطان بے اولاد ہے۔ لیکن ڈر بھی لگا کہ نجانے اپنے دوستوں کا مؤقف مضبوط انداز سے عدالت میں پیش کر بھی سکوں گا یا نہیں؟ بہر حال اگلے دن صبح دس بجے کے قریب ہم قندھار کی شرعی عدالت کے احاطے میں پہنچ چکے تھے۔

کمرۂ عدالت کے قریب پہنچ کر میں نے وہاں موجود بعض لوگوں کی راہنمائی کے بعد عدالتی سمن کی پرچی کمرے کے اندر کی جانب کھڑے ایک شخص کو پکڑادی جسے آپ منشی یا پیش کار بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس

شخص نے مجھ سے پرچی وصول کر کے پڑھی اور پھر تھوڑی دیر انتظار کرنے کا کہہ کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ تقریباً نصف گھنٹے بعد ہم دونوں فریقوں کا اسی شخص نے نام پکارا تو ہم کمرۂ عدالت میں داخل ہو گئے۔

ایک درمیانے درجے کے ہال نما کمرے میں جس کا طول و عرض ۳۰×۱۵ فٹ تک ہوگا میں قالین بچھا ہوا تھا اور تین جانب، بالکل ویسے تین مکتب (ڈیسک) رکھے تھے جیسے ہمارے ہاں حفظ قرآن کی درس گاہ میں قاری صاحبان کیلئے رکھے ہوتے ہیں۔ ان مکاتب (ڈیسکوں) کے ساتھ ساتھ ایک ایک سفید ریش بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ قاضی صاحبان ہیں۔ ہم جب کمرے کے اندر داخل ہوئے تو دو قاضی صاحبان تو مقدمات کی سماعت کر رہے تھے جبکہ ایک فارغ تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ ہمارے مقدمے کی سماعت یہی کریں گے۔ چنانچہ ہم دونوں ان کے سامنے جا کر بیٹھ گئے۔ ساٹھ سال کی لگ بھگ عمر کے نورانی صورت والے قاضی صاحب نے بیٹھتے ہی ہمارے نام پوچھے پھر پوچھا کہ مدعی کون ہے؟ ٹھیکیدار نے اپنا بتایا کہ وہ مدعی ہے۔ قاضی صاحب نے فرمایا کہ اپنا دعویٰ بیان کرو، چنانچہ اس نے پوری تفصیل کے ساتھ تقریباً دس منٹ میں اپنی بات بڑی تسلی اور اطمینان کے ساتھ بیان کی۔ پھر قاضی صاحب نے مجھے حکم دیا کہ تم اس دعوے کے جواب میں کیا کہتے ہو؟ میں نے سب سے پہلے وضاحت کرنا چاہی کہ میں آپ کا اہل زبان یعنی پشتون نہیں ہوں لہٰذا ممکن ہے کہ اپنا مؤقف صحیح بیان نہ کرسکوں، قاضی صاحب نے میری یہ کیفیت دیکھی تو کہنے لگے خیر ہے تم اپنی بات کرو میں سمجھنے کی کوشش کروں گا۔ چنانچہ میں نے پشتو اور فارسی کے اشتراک سے اپنا مؤقف مختصر انداز میں ان کے سامنے رکھدیا، میری بات سن کر انہوں نے مدعی ٹھیکیدار سے میری باتوں کا جواب دینے کیلئے کہا، پھر اسی طرح مجھے بھی اس بحث کا موقع دیا۔ بعد ازاں قاضی صاحب نے از خود دونوں سے سوالات کیے جن کے ہم دونوں نے جواب دیے۔ اس مختصر سی بحث و تمحیص کے بعد قاضی صاحب نے فیصلہ سنا دیا کہ ہمارے ساتھی ٹھیکیدار سے معاہدہ منسوخ کرنے میں حق بجانب ہیں، لہٰذا انہیں اسی ٹھیکیدار سے کام کروانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا اور ٹھیکیدار سے کہا کہ دس ہزار روپے کی جو پیشگی رقم لی تھی وہ بھی واپس لوٹا دے۔

یہ فیصلہ سن کر ٹھیکیدار نے کچھ چیں بہ جبیں ہونے کی کوشش کی تو قاضی صاحب نے جلال میں آکر ٹھیکیدار کو ڈانٹتے ہوئے کہا کہ ایک تو میں نے تمہارے مقدمے کا شریعت کے مطابق فیصلہ کیا ہے اور اوپر سے تم اعتراض کرتے ہو؟ اگر میرا فیصلہ سمجھ میں نہیں آتا تو جاؤ بڑی عدالت (ہائی کورٹ) میں چلے جاؤ۔ یہ کہہ کر انہوں نے ہم دونوں کو کمرۂ عدالت سے رخصت کر دیا۔ عدالت سے نکلتے ہوئے میں نے

دیکھا کہ دوسرے قاضی صاحبان بھی اب نئے مقدمات کو نمٹا رہے تھے۔ میں نے ایک لمحہ رک کر دلچسپی وعقیدت کے بھرپور جذبات کے ساتھ اس سادہ سی عدالت کو دیکھا، فقیر صفت قاضیوں کو دیکھا، خوش قسمت عوام کو دیکھا اور یہ سوچتا ہوا باہر چلا آیا کہ ہمارا یہی مقدمہ اگر پاکستان کی کسی عدالت میں چلایا جاتا تو اسے نمٹانے میں کتنے دن گزر جاتے اور کتنے اخراجات ہو جاتے؟''

طالبان کے قائم کردہ عدالتی نظام کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے احمد رشید لکھتے ہیں:

''قندھار کی اسلامی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مولوی سید محمد پاسانی جنہوں نے ملا عمر کو شریعت کے بنیادی احکام پڑھائے اور سکھائے تھے، ملا عمر کے مشیر اعلیٰ بن گئے۔ انہوں نے لاقانونیت کے خاتمے کیلئے اسلامی سزائیں دینے کا اہتمام کیا۔ انہوں نے ۱۹۹۷ء میں مجھے بتایا کہ ۱۳ صوبوں میں ۱۳ ہائی کورٹس ہیں، جن کی سربراہی ججوں کے پاس ہے، وہ جرائم کے ارتکاب پر اسلامی سزائیں تجویز کرتے ہیں۔ میں خود نصف صدی سے دیہات میں مجرموں کو اسلامی سزائیں دیتا آیا ہوں۔ جہاد کے دوران مجاہدین کو بھی ان سزاؤں کے اطلاق کے سلسلے میں بتاتا رہا ہوں۔ ملا عمر سے قرب کی بناء پر قندھار کی اسلامی سپریم کورٹ ملک کی سب سے اہم عدالت بن گئی ہے۔ سپریم کورٹ صوبوں میں ججوں قاضیوں اور نائب قاضیوں کا تقرر کرتی ہے۔ ان سب کا سال میں ایک یا دو مرتبہ قندھار میں اجتماع ہوتا ہے۔ جس میں مقدمات پر بحث ہوتی ہے اور ان کے حوالے سے قانون شریعت کے اطلاق کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ کابل میں ایک متوازی نظام انصاف موجود ہے۔ یہاں وزارت انصاف بھی ہے اور سپریم کورٹ برائے افغانستان بھی ہے۔ کابل کی سپریم کورٹ ہفتے میں ۴۰ مقدمات کا فیصلہ کرتی ہے۔ یہ آٹھ شعبوں پر مشتمل ہے جو تجارت، جرائم اور عمومی قانون سے تعلق رکھتے ہیں۔''

پاکستان کی جن معروف شخصیات نے طالبان کا طرز حکومت افغانستان جا کر دیکھا ان میں شاعر مشرق علامہ اقبال مرحوم کے صاحبزادے جسٹس (ریٹائرڈ) جاوید اقبال بھی شامل ہیں۔ اپنے دورہ افغانستان کے بعد انہوں نے ایک پاکستانی ہفت روزہ رسالے کو اپنی داستان سفر سناتے ہوئے طالبان

حکومت کی عدلیہ کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا:

"افغانستان میں اتنی تباہی آ چکی ہے کہ ابھی تک وہاں عدلیہ صرف فوجداری قوانین پر ہی عمل درآمد کر رہی ہے۔ کرپشن کا خاتمہ، بے حیائی اور شراب نوشی جیسے مسائل دور کرنے کی ابھی زیادہ کوششیں ہو رہی ہیں۔ ان کی سزائیں وہی ہیں جو سعودی عرب میں چوروں اور زانی افراد کو دیتے ہیں لیکن مقام حیرت ہے کہ مغرب اور یورپ کی طرف سے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور بنیاد پرستی کا سارا پروپیگنڈہ طالبان کے خلاف ہی ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ اس وقت اپنے آپ کو سپر پاور سمجھنے والے انصاف پسند نہیں ہیں اور امریکہ ہو یا روس طالبان دشمنی اور مخالفت میں ایک ہیں...... آپ انصاف کی بات ہیومن رائٹس کے حوالے سے پوچھیں تو میں کہوں گا کہ افغانستان ابھی تک حالت جنگ میں مبتلا ہے اس صورتحال میں جو جراثیم پرورش پاتے ہیں۔ ان کے خاتمے کیلئے عدالتوں کو چلایا جا رہا ہے۔ ایسی صورتحال میں سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ جلد انصاف ہو، جلد سزا ہو تا کہ مجرم عبرت کا نشانہ بن جائے۔ اس وقت جلد انصاف اور جلد سزا کو طالبان اہمیت دے رہے ہیں۔"



پچیس سال تک آتش وخون کی لپیٹ میں رہنے والے ملک کی کیا حالت ہوتی ہے؟ اس کی ادنیٰ سی جھلک آپ اس وقت دیکھ سکتے ہیں جب قندھار سے آنے والی سڑک پر آپ کابل شہر کے دروازے سے اندر داخل ہوں۔ مرکزی دروازے سے گزرنے کے بعد کم از کم پانچ کلومیٹر تک تو آپ یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ آپ کسی ملک کے دارالحکومت تو کجا، کسی ایسے علاقے میں داخل ہو رہے ہیں جہاں انسان نامی کوئی مخلوقِ خدا ابھی بستی ہے۔ سڑک کی دونوں جانب تاحد نگاہ پھیلے ہوئے تباہ شدہ مکانات اور بلند وبالا عمارتیں جنہیں تعمیر ہوئے بھی شاید تیس چالیس سال سے زیادہ عرصہ نہ گزرا ہوگا آج کھنڈرات کا منظر پیش کرتی ہیں۔ اس علاقے میں آپ کو کوئی بجلی کا کھمبا ایسا نظر نہ آئے گا جس پر گولیوں کے درجنوں نشانات نہ ہوں۔ یہ سب چیزیں حزب وحدت، حکمت یار، سیاف، دوستم اور احمد شاہ کی کارستانیوں کا منہ

بولتا ثبوت ہیں۔ اس کے علاوہ مسلسل جنگ کی وجہ سے افغانستان کی سڑکوں کی جو صورتحال ہے اس کے بارے میں بھی پہلے لکھ چکا ہوں۔

طالبان نے زمام اقتدار سنبھالی تو تباہ حال ملک کی تعمیرِ نو ان کے لئے ایک بہت بڑا چیلنج تھی لیکن طالبان نے اسے نہایت خندہ پیشانی سے قبول کیا اور پوری طرح اس میں مصروف ہو گئے۔ طالبان نے یہ نہیں سوچا کہ ان کے اپنے گھر پختہ بنے ہوئے ہوں اور ان کی اپنی چھاؤنیاں خوشنما ہوں بلکہ ان کی تمام تر توجہ عوامی ضروریات کی جانب رہی۔ یہی وجہ ہے کہ قندھار وغیرہ کے عوامی راستوں پر طالبان نے از خود نئی پختہ سڑکیں بنائیں جبکہ چھاؤنیوں کے اندر کی سڑکیں ویسی ہی ٹوٹی پھوٹی رہیں۔ افغان عوام کو ہر طرح کی سہولت میسر کی گئی تا کہ وہ اپنی تباہ شدہ عمارتوں کو از سرِ نو تعمیر کر سکیں۔ ایک سال قبل جب مجھے کابل جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں میں نے بہت سی بلند و بالا زیرِ تعمیر عمارتوں کے برابر میں بڑی بڑی عمارتی کرینیں کھڑی دیکھیں، جو نجانے کتنے عرصے سے تعمیراتی کام بند ہونے کی بناء پر بیکار کھڑی تھیں لیکن اب کی بار کابل شہر کافی بدلا ہوا لگ رہا تھا۔ بارہ بارہ پندرہ پندرہ منزلہ عمارتوں کی مرمت اور تعمیرِ نو کا کام تیزی سے جاری تھا۔ اس کے علاوہ کابل کے بعض علاقوں مثلاً ''شہرِ نو'' اور ''وزیر اکبر خان'' کے علاقے میں کئی ایک جدید طرز کی بنی ہوئی نئی عمارتیں بھی دیکھنے کو ملیں جن کا گزشتہ سال نام و نشان تک نہ تھا۔ کابل کی رونقیں انتہائی سرعت کے ساتھ واپس لوٹ رہی تھیں اور افغان قوم امریکی طعنوں اور بین الاقوامی اقتصادی پابندیوں سے بے نیاز ہو کر طالبان کے فراہم کردہ امن و سکون کے سائے میں اپنے ملک کی تعمیرِ نو میں مگن تھی۔

طالبان نے اپنے پہلے سات سالہ دورِ تحریک یا پانچ سالہ دورِ حکومت میں ابتداء سے انتہاء تک ذرا بھی سکون کا سانس نہیں لیا۔ بے انتہا جنگی مصروفیات، اقتصادی پابندیوں، خشک سالی کی پریشانیوں اور آئے دن سامراجی طاقتوں کی طرف سے ملنے والی دھمکیوں کے باوجود امریکی در اندازی کے وقت طالبان کے پاس کم و بیش ایک ہزار تعمیری منصوبے موجود تھے۔ یہ منصوبے تین قسم کے تھے:

۱۔ روسی در اندازی سے پہلے کے ادوار کے ادھورے چھوڑے ہوئے منصوبے۔

۲۔ روسی در اندازی سے لیکر طالبان کی آمد تک کے تباہ و برباد ہو جانے والے منصوبے۔

۳۔ ملک اور عوام کی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے نئے منصوبے۔

طالبان جس کام کے کرنے کی ضرورت محسوس کرتے اس پر بحث شروع ہو جاتی اور بحث کے کسی

نتیجے پہ پہنچتے ہی بغیر کسی تاخیر کے کام کا آغاز کر دیا جاتا۔



کابل میں اس قیام کے دوران ایک دن شہر کے مشہور تجارتی مرکز پل خشتی بازار جانا ہوا۔ یہ کابل شہر کا سب سے بڑا بازار ہے۔ جس میں ایک تخمینہ کے مطابق دس ہزار دکانیں ہیں۔ دنیا بھر کی مصنوعات اور ہر قسم کا سامان بہترین کوالٹی میں دستیاب تھا۔ اس بازار میں کپڑے کی ایک بہت بڑی مارکیٹ تھی جس میں اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کا جاپانی کپڑا فروخت ہو رہا تھا۔ الیکٹرانک مارکیٹ بھی جس میں ریڈیو، ٹیپ اور بجلی کا دیگر سامان بک رہا تھا۔ یہیں سے میں نے ایک ڈیجیٹل ریڈیو خریدا جو ابھی تک پاکستانی مارکیٹوں میں نہیں آیا تھا۔ اتنی بڑی بڑی مارکیٹیں جو یقیناً پاکستان کے بیشتر شہروں میں بھی نہ ہوں۔ میرا خیال تھا کہ اقتصادی پابندیوں کے بعد اس بازار کی رونق ماند پڑ گئی ہوگی لیکن میری حیرت کی اس وقت انتہاء نہ رہی جب میں نے یہاں دیکھا کہ پہلے سے کئی گنا زیادہ رش تھا اور لوگوں کی اتنی بھیڑ کہ بازار میں چلنا دشوار ہو رہا تھا۔ کابل کے لوگ اس قدر اطمینان کے ساتھ خرید و فروخت میں مصروف تھے کہ انہیں دیکھ کر کوئی آدمی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس شہر سے ۵۰ کلومیٹر سے بھی کم فاصلے پر محاذ جنگ ہے۔

دراصل طالبان نے جس طرح اپنی جانوں کو جوکھوں میں ڈال کر عوام کو امن و سکون عطا کیا، اس نے پوری قوم کو ہر غم سے بے غم کر دیا تھا۔ صرف کابل ہی نہیں قندھار، جلال آباد، قندوز سمیت میں نے افغانستان کے دیگر کئی شہروں کے بازار دیکھے، ان سب کی رونق اور چہل پہل کا یہی حال تھا۔

بات آئی بازار اور کاروبار کی تو یاد آیا کہ طالبان نے اپنے سپاہیوں پر یہ پابندی عائد کر رکھی تھی کہ وہ کسی بھی دکاندار سے خریداری کرتے وقت قیمتوں میں کمی نہیں کروا سکتے۔ دکاندار جو قیمت مانگے انہیں وہی ادا کرنا ہوتی تھیں۔ میں نے خود ایک بار سنا کہ طالبان کے ایک کمانڈر ایک سپاہی کو ڈانٹ رہے تھے کہ اس نے فلاں چیز خریدتے ہوئے قیمت کیوں کم کروائی؟ طالبان کی اس پالیسی نے دکانداروں کو اس قدر ہمت دیدی تھی کہ وہ طالبان کو قیمتیں باقی لوگوں سے بھی کچھ زیادہ ہی بتاتے تھے۔

سن ۱۹۹۸ء میں جب طالبان نے شمالی افغانستان کا شہر حیرتان فتح کیا تو میں اسی دن حیرتان پہنچ گیا تھا۔ وہاں میں نے یہ عجیب صورتحال دیکھی کہ طالبان کو شہر کے مختلف مقامات پر لہرانے کیلئے اپنے پرچموں کا سفید کپڑا چاہئے تھا مگر دکانوں پر تالے تھے اور شہر کے باشندے ڈر کے مارے گھروں کے اندر دبکے بیٹھے تھے۔ تلاش کرتے کرتے طالبان کو کپڑے کی ایک دکان مل گئی، لیکن بند

تالے سے وہ کپڑا کیسے نکال سکتے تھے؟ چنانچہ انہوں نے تالا توڑنے کی بجائے دکان کے مالک کا گھر تلاش کیا اور جب وہ مل گیا تو اس سے کہا کہ وہ اپنی دکان سے سفید کپڑے کے تھان نکال دے۔ اس نے اپنے آپ کو مجبور پاتے ہوئے ایسا ہی کیا۔ لیکن جب اس نے کپڑا طالبان کے حوالے کیا تو طالبان نے اس سے کپڑے کی قیمت پوچھی، وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان ''فاتحین'' کے چہرے تکنے لگا اور کہنے لگا کہ میں آپ سے کوئی پیسے نہیں لوں گا۔ مگر طالبان نے اس کے انکار کو رد کرتے ہوئے اسے کپڑے کی معقول قیمت بااصرار ادا کی۔ طالبان کی انہی پالیسیوں اور طرزعمل نے افغان تاجروں کو حوصلہ اور ہمت فراہم کیا۔

عمومی تجارت کے علاوہ طالبان نے صنعت کو بھی ترقی کے زبردست مواقع فراہم کیے۔ چنانچہ اب کابل شہر کے گردونواح میں کپڑے، دھاگے اور صابن وغیرہ کی بہت سی فیکٹریاں فعال ہو چکی تھیں اور دن بدن افغانستان صنعتی میدان میں آگے بڑھ رہا تھا۔

مزار شریف میں قائم کھاد کی ایک پرانی فیکٹری پر سابق افغان حکمرانوں کی توجہ کا یہ حال تھا کہ یہاں سے یومیہ صرف پانچ سو بوری کھاد حاصل ہوتی تھی۔ طالبان نے مزار شریف پر قبضے کے بعد مشینوں اور عمارت کی مرمت کر کے اور انجینئر و مزدور فراہم کر کے فیکٹری کی روزانہ آمدنی کو ایک لاکھ ڈالر سے اوپر تک پہنچا دیا۔ اس کے علاوہ پل خمری کی سیمنٹ فیکٹری مکمل طور پر ناکارہ ہونے کی وجہ سے بند پڑی تھی۔ ملک دوست طالبان نے اس پر بھی توجہ دی جس کے نتیجہ میں کارخانے نے فعال ہو کر زبردست منافع دینا شروع کر دیا جس سے بے روزگار لوگوں کو روزگار مہیا کرنے میں بھی سہولت ہوئی۔

افغانستان ایک ایسا بدقسمت ملک ہے جو گذشتہ تین عشروں سے مسلسل خونریزی کا شکار ہے۔ اس جنگ اور خونریزی نے ملک میں فقروفاقہ کو بے حد بڑھا دیا ہے، غربت عام ہے اور ملک کے ہر شہر میں نادار اور پریشان حال بھکاری نظر آتے ہیں۔ غربت کی اس صورتحال کے خاتمے کیلئے طالبان سے پہلے کے حکمرانوں نے بھی اگرچہ اقدامات کیے لیکن وہ عمل کی بجائے قول کی حد تک محدود رہے۔ طالبان نے کابل کی فتح کے بعد اعلان کیا تھا کہ وہ بیواؤں اور یتیموں کے باقاعدہ وظائف جاری کریں گے، انہوں نے اپنے وعدہ کے مطابق اس کا آغاز بھی کر دیا تھا، لیکن افسوس کہ قومی فنڈ میں انتہائی قلت کے باعث یہ سلسلہ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔

ظاہر شاہ کے دور میں ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کرنے کیلئے ادارہ ہلال احمر کا قیام عمل

میں آیا تھا۔ ربانی کے دور میں ایک اور اضافہ کر کے وزارت شہداء ومہاجرین کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ طالبان نے ادارہ ہلال احمر اور وزارت شہداء ومہاجرین پر بھی بھرپور توجہ دی اور اس کے علاوہ وزارت عشر وزکوٰۃ کو بھی قائم کیا۔ شہداء کے لواحقین، نو آمدہ بے در و بے گھر مہاجرین اور تنگ دستوں کی دادرسی کے ساتھ ساتھ بھیک مانگنے والوں کا باضابطہ اور مستقل حل نکالنے پر بھی اب غور شروع ہو گیا تھا۔



جس ملک میں ایک ایک کھمبے پر سینکڑوں گولیوں کے نشانات ہوں وہاں کی بجلی کے نظام کا کیا عالم ہوگا؟ اس کا اندازہ بھی آپ بخوبی کر سکتے ہیں۔ پچیس سالہ جنگ کے دوران پورے افغانستان میں صرف کابل شہر ہی ایسا بچا تھا جہاں بعض مقامات پر بجلی تھی۔ جبکہ اس کے علاوہ دیگر تمام شہروں میں بجلی کی تنصیبات کا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ قندھار کے رہنے والے بتاتے ہیں کہ طالبان کی آمد سے قبل اس شہر میں بیس سال سے بجلی نہیں تھی لیکن طالبان نے آکر بھرپور کوشش کی اور بالآخر وہ پورے شہر کو بجلی فراہم کرنے میں کامیاب ہو گئے اور اب یہاں بجلی کے نرخ اس قدر کم تھے کہ میں سن کر ششدر رہ گیا۔ آپ بھی ملاحظہ فرمایئے!

قندھار شہر میں بجلی کا ایک یونٹ ۱۵۰۰ افغانی یعنی صرف پاکستانی ساٹھ پیسے کا تھا۔ ہرات بازار، قندھار کے ایک دکاندار فیض محمد کے بقول گرمیوں میں اس کی دکان کی بجلی کا بل صرف ۶۰ روپے پاکستانی کے برابر تھا اور سردیوں میں چونکہ وہ ہیٹر وغیرہ بھی استعمال کرتا تھا اس لیے بجلی کا بل ۱۰۰ روپے کے برابر آتا تھا۔ قندھار کے علاوہ افغانستان کے دیگر شہروں میں بھی بجلی کی فراہمی اور اس کے نرخوں کا یہی عالم تھا۔ افغان عوام کو بجلی جیسی اہم ضرورت فراہم کرنے کیلئے طالبان نے اپنے کم وسائل کے باوجود بڑے بڑے اقدامات کیے۔ طالبان کی آمد سے قبل کابل کو بجلی فراہم کرنے والے ماہیپر، سروبی اور نغلو کے تینوں ڈیم آپس کی لڑائیوں میں مکمل طور پر ناکارہ ہو چکے تھے اور کابل کی بجلی منقطع ہو چکی تھی۔ تار وغیرہ چوری ہو گئے تھے۔ طالبان نے آکر ان کی مرمت کر کے فعال بنا دیا۔ نغلو ۱۰۰ میگا واٹ، ماہیپر ۶۰ اور سروبی تقریباً ۳۰ میگا واٹ بجلی پیدا کرنے کے قابل ہو گئے اور کابل بہت عرصے بعد ایک مرتبہ پھر روشنیوں سے بھر گیا۔

قندھار کو بجلی فراہم کرنے کی غرض سے صوبہ ہلمند میں واقع کجکی ڈیم کا منصوبہ طالبان سے پہلے کا تھا لیکن اس پر یہ کہہ کر کام بند کرایا گیا تھا کہ لاکھوں ڈالر کا منصوبہ ہے اور پیسے نہیں ہیں۔ رشوت اور

خرد برد سے عاری طالبان نے انتہائی قلیل رقم سے یہ منصوبہ پورا کر کے قندھار کی بجلی چالو کرادی تھی۔ صوبہ ہرات کا سلمیٰ ڈیم جس پر ۴۰ فیصد کام پہلے ہو چکا تھا، لوگر کے چرخ اولسوالی میں مولانا زیارت صاحب والا ڈیم اور ننگر ہار کے کامہ ڈیم پر طالبان نے خوب زور وشور سے کام شروع کرایا تھا اور کئی دوسری جگہوں پر ڈیموں کی تعمیر کے منصوبے بن رہے تھے۔ اس کے علاوہ بلخ کیلئے ازبکستان کے ساتھ، مشرقی صوبوں کیلئے پاکستان کے ساتھ اور جوزجان، فاریاب، بادغیس اور ہرات کے صوبوں کیلئے ترکمانستان کے ساتھ بجلی کی فراہمی کیلئے معاہدے زیرغور تھے اور باقاعدہ بات چیت چل رہی تھی۔

یہی وہ پرکشش مراعات تھیں جن کی بناء پر اب نہ صرف افغان تاجر بڑی تیزی سے اپنے اپنے کاروبار بیرون ممالک سے اپنے ملک میں منتقل کر رہے، بلکہ بیشتر غیرملکی لوگ بھی افغانستان میں سرمایہ کاری میں دلچسپی لے رہے تھے۔



روز بروز استحکام اور خوشحالی کی جانب بڑھتی ہوئی طالبان کی حکومت نے افغان عوام کو دل وجان سے ان کا حامی بنادیا تھا۔ چنانچہ لوگ دل کھول کر طالبان کی پالیسیوں کی موافقت اور ان کی حمایت کر رہے تھے۔ میں نے قندھار میں ایک تاجر سے جو کرنسی کا کاروبار کرتا تھا پوچھا ''اسامہ کی وجہ سے آپ لوگوں پر اتنی مشکلات آرہی ہیں کیا خیال ہے، طالبان کو اسامہ امریکہ کے حوالے کر دینا چاہئے؟'' وہ جھٹ سے بولا ''کیوں؟ اسامہ نے بیس سال تک ہمارے دفاع کی جنگ لڑی، اس نے ہمارے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا، ہم اتنے بے غیرت نہیں کہ اب اس کے تمام احسانات بھلا کر اسے امریکہ کے حوالے کر دیں۔''

ایک اور افغان تاجر سے میں نے کہا ''اقتصادی پابندیوں کی وجہ سے آپ کو کاروبار میں مشکلات تو ضرور پیش آرہی ہوں گی؟'' وہ مسکرا کر کہنے لگا ''ہمارا رزق اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، امریکہ یا اقوام متحدہ کے ہاتھ میں نہیں۔''

طالبان کے ایک راہنما سے کسی نے کہا ''آپ کو اسامہ امریکہ کے حوالے کر دینا چاہئے'' وہ غصہ ہو کر کہنے لگے ''ٹھیک ہے آج امریکہ نے اسامہ کا مطالبہ کیا ہے تو اسے دیدیتے ہیں، کل اگر امریکہ نے تمہاری ماں بیٹی بھی مانگ لی تو کیا وہ بھی دیدو گے؟''



کابل میں قیام کے دوران کابل کے سب سے بڑے اسپتال ''چہار صد بستر'' جانا ہوا۔ اسپتال کا نام سن کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید اس اسپتال میں چار سو بستروں کا انتظام ہوگا۔ لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو صرف ایک ہی منزل میں چالیس کے قریب کمرے تھے اور ہر کمرے میں کم از کم دس بستروں کا انتظام تھا۔ اسی طرح کی دس منزلہ عمارت میں یہ اسپتال واقع تھا۔ ہر منزل میں مختلف وارڈ تھے جن میں ڈاکٹروں کی ایک بہت بڑی کھیپ ہمہ وقت مصروف خدمت تھی۔

''چہار صد بستر'' اسپتال کے علاوہ کابل شہر میں کئی دیگر سرکاری اور پرائیویٹ اسپتال کام کر رہے تھے۔ قندھار کے مستشفیٰ عمر کا تذکرہ میں پہلے کر چکا ہوں۔ اس کے علاوہ میرا قندوز کے اسپتال اور قندھار میں واقع چینائی اسپتال میں جانا ہوا، جسے میرویس اسپتال بھی کہتے ہیں، یہ سب اسپتال تمام جدید وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے علاج معالجے میں مصروف تھے۔ طالبان انتظامیہ نے انتہائی سرعت کے ساتھ افغانستان بھر میں اسپتالوں اور صحت کے اداروں کی تعمیر کی طرف توجہ دی تھی جس کی وجہ سے علاج کے سلسلہ میں افغان قوم کو ہر قسم کی سہولیات میسر تھیں۔



ایک دن محترم سیف اللہ کے ہمراہ کابل کی میڈیکل یونیورسٹی بھی جانا ہوا۔ جسے مقامی زبان میں ''پوهنتون'' کہا جاتا ہے۔ اس یونیورسٹی کی سند کو پوری دنیا میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس میں آٹھ ہزار طلبہ زیر تعلیم تھے جن میں کافی تعداد پاکستانی طلباء پر مشتمل تھی۔ کابل یونیورسٹی کی برانچیں قندھار اور جلال آباد میں بھی قائم تھیں۔ یہاں تعلیم مفت تھی جبکہ ہر طالب علم کو ہفتہ وار خرچہ بھی دیا جاتا تھا۔ دنیا بھر کی مشہور یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل ماہر اساتذہ کرام یہاں تدریسی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ کابل یونیورسٹی، ربانی کے دور میں فعال تو تھی لیکن وہ مخلوط تعلیمی درسگاہ کے طور پر جانی جاتی تھی۔ پشتو فارسی کا زبردست تعصب بھی وہاں پایا جاتا تھا۔ پہلے آٹھ لاکھ کتابیں ہوا کرتی تھیں جن میں اکثر جل گئیں یا پھٹ گئی تھیں۔ لائبریریاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اکثر کتابیں لائبریریوں کے اندر زمین پر پڑی رہتیں۔ تعمیر کیلئے ملنے والے فنڈ خرد برد کا شکار ہو جاتے اور یونیورسٹی کے اکثر حصے مرمت کیلئے ترس رہے تھے۔

طالبان نے آتے ہی مخلوط طرز تعلیم ختم کر دی اور لڑکیوں کو تاحکم ثانی گھر میں بٹھایا تا کہ نئے انتظامات اور نصاب کے بعد چادر اور چار دیواری کے تحفظ کے ساتھ دوبارہ تعلیم شروع کر سکیں۔ لیکن

میڈیکل کی تعلیم کیلئے انتہائی زبردست بندوبست کرتے ہوئے لڑکیوں کے میڈیکل کالج کھلے رکھے تاکہ طب کا شعبہ جو انتہائی اہم ہے اسے کارآمد لیڈی ڈاکٹر مہیا ہوتی رہیں۔ کابل یونیورسٹی کے چانسلر کی فہم وفراست سے پشتو فارسی کے تعصب کو جڑ سے اکھاڑ دیا گیا۔ یونیورسٹی کی تمام خراب عمارتوں کی مرمت کی گئی۔ بیرونی دنیا کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں سے رابطے کیے گئے۔ کمپیوٹر کے شعبے کو فعال بنایا گیا۔ جدید کتابیں فراہم کی گئیں۔ جدید سلیبس تیار کیے گئے۔ اسلامی ثقافت کا شعبہ بڑھایا گیا۔ ہر شعبہ میں دینی مضامین کا اضافہ کیا گیا۔ موسیقی اور مجسمہ سازی کے شعبوں کو ختم کر دیا گیا۔ دور کے علاقوں سے تعلق رکھنے والے تقریباً تین ہزار طلباء کو ہاسٹل میں جگہ اور خوراک کی مفت سہولت فراہم کی گئی۔ ملک کی دوسری یونیورسٹیوں میں بھی طالبان حکومت کی یہی کارکردگی تھی۔

کابل یونیورسٹی کے علاوہ کابل شہر اور دیگر شہروں میں مدارس اور اسکول کام کر رہے تھے۔ مدارس کا نصاب تعلیم وہی تھا جو ہمارے ہاں کے مدارس اسلامیہ کا ہے۔ جبکہ اسکولوں میں قرآن مجید اور اسلامیات کی تعلیم لازمی قرار دیدی گئی تھی۔ ان تعلیمی اداروں میں سب سے بہتر نظامِ تعلیم ''جہادی مدرسہ'' کا تھا جس کا مرکز قندھار میں تھا۔ یہ ادارہ براہ راست امیر المؤمنین ملا محمد عمر مجاہد کی زیر سرپرستی چلتا تھا۔ یہاں کے ایک نوجوان طالب علم سے میری ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے اردو، عربی اور انگلش میں سے کسی بھی زبان میں گفتگو کرنے کی پیش کش کی۔ اس طالبعلم نے بتایا کہ اب وہ کمپیوٹر کی تعلیم بھی حاصل کر رہا ہے۔

محترم قارئین! یہ تھے افغانستان کے وہ حالات جن کا میں نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔



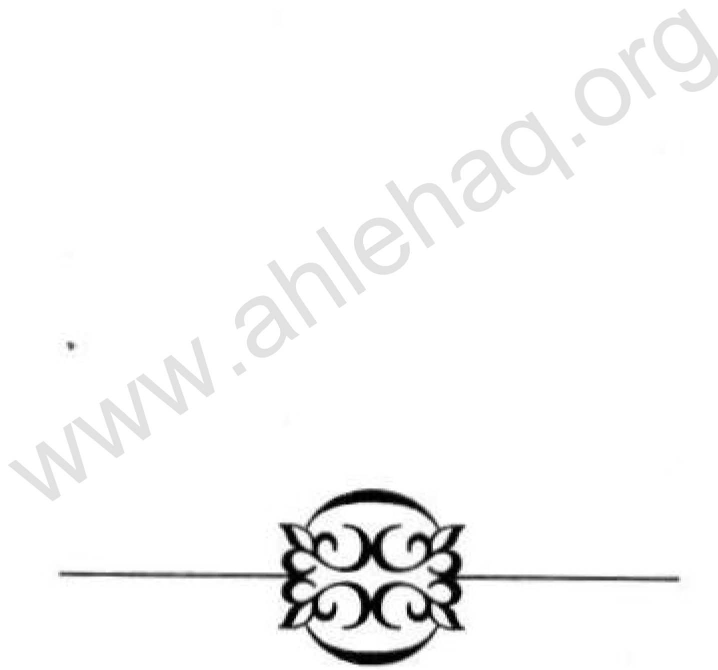
کابل میں اپنی زندگی کے چار یادگار دن گزار کر قندھار واپسی ہوئی۔ کابل سے قندھار تک سفر کیلئے آریانا ائیر لائن کا انتخاب کیا۔ یہ افغانستان کی واحد ائیر لائن ہے۔ ۱۴ ر نومبر ۱۹۹۹ء کو اقوام متحدہ کی جانب سے لگائی جانے والی اقتصادی پابندیوں میں اسکی بندش بھی شامل تھی۔ چنانچہ آریانا کے بیرون ممالک تمام اثاثے منجمد کر دیئے گئے تھے اور اب اس کی پرواز بیرون ملک نہیں جاسکتی تھی۔ یہ پابندی اگرچہ طالبان کیلئے جن کی اچھی خاصی آمدنی آریانا ہی کے ذریعے ہو رہی تھی، ایک بہت بڑا دھچکا تھا لیکن اپنے مؤقف کی خاطر طالبان نے اسے خوشدلی کے ساتھ قبول کیا۔ البتہ آریانا ائیر لائن کی اندرون ملک پروازیں اب بھی جاری تھیں۔

کابل سے قندھار تک آریانا کے چھوٹے جہاز پر سوا گھنٹے کا سفر ہے اور کرایہ دس لاکھ افغانی یعنی

صرف گیارہ سو بیس روپے پاکستانی تھا۔ کرایوں میں کمی کے باعث بیشتر خوشحال افغانی طیارے میں سفر کرنے کو پسند کرتے تھے۔ مجھے ایک چھوٹے طیارے میں سیٹ ملی جس میں پچاس افراد کی گنجائش تھی۔ طیارے نے ٹھیک گیارہ بجے پرواز شروع کی اور بارہ بج کر پچیس منٹ پر ہمیں قندھار پہنچا دیا۔

قندھار میں چار دن قیام رہا۔ اس دوران طالبان کے مختلف راہنماؤں سے ملاقات ہوئی جن میں گورنر قندھار ملا محمد حسن رحمانی، صوبائی وزیر تعلیم محمد معصوم افغانی، وزیر اطلاعات ملا عبدالحیٔ مطمئن اور افغان سپریم کورٹ کے جج مولانا حمید اللہ فائز شامل تھے۔

☆ ☆



۸

طالبان اور منشیات

افغانستان دنیا کو افیون فراہم کرنے والا سب سے بڑا ملک ہے۔ اس سرزمین پر پوری دنیا میں استعمال ہونے والی ہیروئن کا ستر فیصد حصہ پیدا ہوتا ہے۔ ہر سال موسم بہار کی ابتداء میں افغان کاشتکار اپنی زمینوں میں بڑی احتیاط سے پوست کے دانے بوتے ہیں، اچھی فصل کیلئے فاضل جڑی بوٹیاں تلف کرتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ پانی فراہم کرنے کیلئے آب رسانی کا بندوبست کرتے ہیں۔ چند ہفتوں بعد ان کی زمینوں پر نوخیز، سرسبز اور نرم پتے پیدا ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور پھر جب یہ پتے پوری طرح نکل آتے ہیں تو ان کے درمیان سرخ پھول جنم لیتے ہیں، پھر ان پھولوں سے پتیاں جھڑ جاتی ہیں اور ان میں پوست نمایاں ہونے لگتی ہے، بیج بونے کے چار ماہ بعد ان فصلوں میں پوست کے ڈوڈے پک کر تیار ہو جاتے ہیں، پھر تیز دھار چھریوں سے ان پر خراشیں لگائی جاتی ہیں، پھر انہیں انگلیوں سے دبایا جاتا ہے تو ان سے دودھ کی طرح سفید مواد نکلنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ مواد دوسرے دن جمنے اور بھورا رنگ اختیار کرنے لگتا ہے۔ یہ افیون ہوتی ہے جسے کھرچ کر اتار لیا جاتا ہے۔ یہ عمل ہر چند روز بعد دہرایا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ سفید مواد نکلنا بند ہو جاتا ہے۔ اس دوران خام افیون کو جمع کر کے اسے چپاتی کی شکل دیدی جاتی ہے۔ بعد ازاں اسے پلاسٹک کی تھیلیوں میں بند کر کے احتیاط کے ساتھ رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے خریدار کا انتظار کیا جاتا ہے۔

افغانستان میں پیدا ہونے والی افیون کا اسی فیصد حصہ یورپ میں جاتا ہے اور باقی بیس فیصد حصہ دوسرے ممالک میں پہنچتا ہے۔ افیون کی یہ اسمگلنگ پاکستان کے مکران کی بندرگاہوں سے خلیجی ممالک تک اور ایران کے راستے ترکی سے ہوتی ہوئی یورپ جا پہنچتی ہے۔ اقوام متحدہ کے ڈرگ کنٹرول

پروگرام کی ایک رپورٹ کے مطابق افیون کی اس تجارت سے حاصل ہونے والی آمدنی کا صرف ایک فیصد افغان کاشتکاروں کو اور ۲٫۵ فیصد افغان اور پاکستانی ڈیلروں کو ملتا ہے۔ پانچ فیصد ان ممالک میں صرف ہوتا ہے، جن کے راستے ہیروئن گزر کر مغربی ممالک میں پہنچتی ہے اور باقی سارے کا سارا نفع یورپ اور امریکہ میں موجود ہیروئن کے بڑے بڑے بیوپاریوں کو ملتا ہے۔

افیون جیسی اس موذی اور انسان کش شے کی پیداوار نے افغانستان کو ساری دنیا میں بدنام اور افغانیوں کو ذلیل کر رکھا ہے، اس ملک کے باشندوں کو منشیات فروشی کا کھلے عام طعنہ دیا جاتا ہے، لیکن ایسا کرتے ہوئے دنیا ان کرداروں کو بھول جاتی ہے جنہوں نے افغانستان میں افیون کی کاشت کو ترقی دی، افغانوں کو اس سے متعارف کروایا اور انہیں اس غلط اور غلیظ راستے پر چلایا۔ آیئے یہ حیرت انگیز اور افسوسناک کہانی، احمد رشید کی زبانی سنتے ہیں:

> ''ہیروئن کی پیداوار میں دھماکہ خیز اضافہ، افغانستان میں نہیں بلکہ پاکستان میں ہوا۔ پاکستان ۱۹۸۰ء کے عشرے میں ہیروئن پیدا کرنے والے ملکوں میں شمار ہونے لگا۔ یہاں ہیروئن کی سالانہ پیداوار ۸۰۰ میٹرک ٹن اور پوری دنیا کیلئے سپلائی ہونے والی ہیروئن کا ۷۰ فیصد تک پہنچ گئی۔ سی آئی اے اور آئی ایس آئی کی چھتری تلے منشیات کی تجارت کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ افغان مجاہدین نے اس سے بیش از بیش فائدہ اٹھایا۔ ۱۹۹۲ء کے ایک جائزے میں منشیات سے متعلق امریکی پالیسی کی ناکامی کے حوالے سے بتایا گیا کہ ۱۹۸۰ء کے عشرے میں بدعنوانی، مخفی اقدامات اور منشیات باہم اس طرح گڈمڈ ہو گئے کہ پاکستان میں منشیات کی ترسیل، علاقائی سلامتی اور جنگ کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا ممکن نہیں رہا۔ ویت نام کی طرح جہاں سی آئی اے نے کمیونسٹ مخالف گوریلوں کو منشیات کی تجارت سے صرفِ نظر کیا اس طرح امریکہ نے افغانستان میں منشیات کے کاروبار میں مجاہدین اور پاکستان کے کاروباری افراد اور فوجی عناصر کے عمل دخل کو نظر انداز کیے رکھا۔
>
> ۱۹۸۰ء کے عشرے میں اس ملی بھگت کا ہلکا سا عکس نمایاں ہوا۔ نیچے جو کچھ ہو رہا تھا یہ اس کے عشر عشیر بھی نہیں تھا۔ ۱۹۸۳ء میں آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل

اختر عبدالرحمٰن نے کوئٹہ میں آئی ایس آئی کے پورے عملے کو اس بناء پر ہٹا دیا کہ وہ منشیات کی تجارت اور سی آئی اے کی طرف سے مجاہدین کیلئے دیئے جانے والے اسلحے کی فروخت میں ملوث تھا۔ ۱۹۸۶ء میں میجر ظہور الدین آفریدی کو پشاور سے ۲۲۰ کلوگرام اعلیٰ گریڈ کی ہیروئن کراچی لے جاتے ہوئے پکڑا گیا۔ اتنی بڑی مقدار میں ہیروئن پہلے کبھی نہیں پکڑی گئی تھی۔ دو مہینے بعد فضائیہ کے ایک افسر فلائٹ لیفٹیننٹ خلیل الرحمٰن اسی راستے پر ۲۲۰ کلوگرام ہیروئن لے جاتا ہوا پکڑا گیا۔ اس نے تسلیم کیا کہ ہیروئن لے جانے کی اس کی یہ پانچویں بار تھی۔ دو دفعہ پکڑی جانے والی ہیروئن کی قیمت ۶۰۰ ملین برابر تھی۔ دونوں افسروں کو کراچی میں رکھا گیا، جس سے وہ پراسرار انداز میں فرار ہو گئے۔ لارنس لف شلٹز نے لکھا کہ آفریدی اور رحمٰن کے معاملات سے پتہ چلا کہ فوج بھی ہیروئن کا ناجائز کاروبار کرنے کا ایک باقاعدہ ادارہ بن گیا ہے۔ جس سے آئی ایس آئی اور افغانستان کا تعلق ہے۔ ۱۹۸۰ء میں امریکی ڈرگ ایڈمنسٹریشن پاکستان میں ۷ اکل وقتی افسر تھے، جنہوں نے منشیات کا کاروبار کرنے والے ۴۰ بڑے اداروں کی نشان دہی کی، ان میں سے بعض کو اعلیٰ سرکاری افسروں کی سرپرستی حاصل تھی، اس عشرے کے دوران ان میں سے ایک ادارے کو بھی نہیں توڑا جا سکا۔ صاف عیاں ہے کہ سی آئی اے مجاہدین اور پاکستانی افسروں کے درمیان مفادات کا ٹکراؤ تھا۔ سی آئی اے نہیں چاہتی تھی کہ مجاہدین اور پاکستانی افسروں اور منشیات کی ترسیل کے ذمہ دار افراد اور امریکہ کے انسداد منشیات کے ادارے کے باہمی رابطے کا اس طرح انکشاف ہو، جو ان میں سے کسی کیلئے بھی خفت کا موجب ہو۔ انسداد منشیات کے امریکی ادارے کے کئی افسر چاہتے تھے کہ انہیں کوئی اور کام سونپا جائے۔ ایک افسر نے استعفیٰ دے دیا کیونکہ سی آئی اے نے انہیں فرائض انجام دینے کی اجازت نہ دی تھی۔

جہاد کے دوران مجاہدین اور کابل کی کمیونسٹ فوج کے افسروں نے موقعے سے فائدہ اٹھایا۔ منشیات کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کا طریقہ بڑا آسان تھا۔ افغانستان کے لئے اسلحے لے جانے والے جو گدھے، اونٹ اور

ٹرک واپس خالی آتے تھے، اب وہ افیون لانے لگے۔ سی آئی اے اور آئی ایس آئی پشتون سرداروں کو ان کے علاقوں سے اسلحہ گزارنے کیلئے رشوت دیتی تھیں۔ اسی مقصد سے افیون اور ہیروئن کے لئے بھی رشوت دی جانے لگی۔ فوج کا ٹرانسپورٹ کا ادارہ نیشنل لاجسٹک سیل (این ایل سی) اپنے ٹرکوں کے ذریعے سی آئی اے کا جنگی سازوسامان کراچی کی بندرگاہ سے لے کر پشاور اور کوئٹہ کے راستے افغانستان پہنچاتا تھا۔ بااثر ڈیلروں نے اسی کے ذریعے افیون اور ہیروئن کراچی بھجوانا شروع کر دی۔ فوج، حکومت اور سی آئی اے کے درمیان اعلیٰ سطح کے افسروں کے تعاون سے نہ سہی لیکن ان کے علم کے بغیر یہ ممکن نہ تھا۔ ہر ایک نے سوویت یونین کو شکست دینے کے برتر مقصد کے پیش نظر تعرض کرنا مناسب نہ سمجھا، منشیات کا انسداد، ان میں سے کسی کے ایجنڈے پر نہیں تھا۔''

اس ساری کہانی سے معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان کو پوست کی کاشتکاری پر لگانے والوں میں امریکی خفیہ ایجنسی سی آئی اے اور پاکستانی خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی شامل تھیں۔ ان لوگوں نے اپنے مفادات کی خاطر افغانوں اس بدراہ پر لگایا حتی کہ ایک وقت ایسا آیا جب ۱۹۹۲ء سے ۱۹۹۵ء تک ہر سال افغانستان میں تقریباً جو بیس سو میٹرک ٹن افیون پیدا ہوئی۔ اس ریکارڈ پیداوار نے افغان کو منشیات کا عالمی چیمپئن بنا دیا اور اب یورپ و امریکہ اس مشکل سے نمٹنے کیلئے راہیں تلاش کرنے لگے۔

۱۹۹۴ء کے آخر میں طالبان نے قندھار پر قبضہ کیا تو انہوں نے اعلان کیا کہ وہ اپنے اہداف ومقاصد میں منشیات کی پیداوار کا خاتمہ بھی شامل رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں طالبان نے سب سے پہلے تو اپنے مقبوضہ علاقوں کسی بھی قسم کی منشیات کے استعمال پر پابندی عائد کر دی۔ انہوں نے عوام کو خبردار کر دیا کہ ان میں سے جو بھی چرس (جو کہ ہیروئن سے کم نشہ آور ہے) استعمال کرے گا یا اس کی تجارت کرے گا اسے سخت سزا دی جائے گی۔ احمد رشید اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''دریں اثناء طالبان نے حشیش کے خلاف مؤثر مہم کا آغاز کیا ہے۔ حشیش ٹرک ڈرائیوروں کے استعمال کا نشہ ہے، اس مہم کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ اگر افیون پر پابندی لگانے کی مہم شروع ہوئی تو یہ بھی نہایت کامیاب ثابت ہوگی۔ قندھار کے دو گوداموں میں حشیش کے ہزاروں

تھیلے رکھے ہوئے ہیں۔ یہ حشیش کاشتکاروں اور کاروباری لوگوں سے ضبط کی گئی ہے، عام آدمی کہتے ہیں کہ جب سے طالبان نے حشیش پر پابندی لگائی ہے وہ اسے پیتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ جو لوگ چھپ کر حشیش پیتے رہے، ان کی اصلاح کیلئے عجیب طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ عبدالرشید نے بتایا کہ جب ہم حشیش کا کوئی اسمگلر پکڑتے ہیں تو ہم اس سے سچ اگلوانے کیلئے مارتے اور پوچھ گچھ کرتے ہیں۔ دن میں دو تین بار انہیں کئی گھنٹے تک ٹھنڈے پانی میں رکھتے ہیں۔ یہ بڑا اچھا علاج ہے۔ بعد میں انہیں جیل میں بند کر دیتے ہیں، رشید نے حشیش کے عادی دو تین خوفزدہ افراد کو جیل سے بلوا کر مجھ سے ملوایا۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ طالبان نے انہیں سزا کی صورت میں جو صدمہ پہنچایا ہے وہ بہت مؤثر ثابت ہوا ہے۔ بخت محمد نے بتایا کہ جب مجھے مارا پیٹا جاتا ہے یا ٹھنڈے پانی میں ڈال دیا جاتا ہے تو میں حشیش کے بارے میں سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ بخت محمد دکاندار ہے، حشیش کا کاروبار کرتا ہے، اب وہ تین ماہ کے لئے جیل میں بند کر دیا گیا ہے۔''

چرس پر پابندی کی طرح طالبان پوست کی کاشتکاری پر بھی پابندی عائد کر دیتے، لیکن بڑی دشواری یہ تھی کہ افغانستان کے کم از کم دس لاکھ افراد اس ذریعہ معاش سے گزر بسر کر رہے تھے، اگر انہیں بغیر کوئی متبادل فراہم کیے ان پر پابندی عائد کر دی جاتی تو یقیناً یہ ایک عوام دشمن بلکہ انسان کش اقدام ہوتا، چنانچہ طالبان نے یہ کوشش شروع کر دی کہ کسی بھی طرح ان کاشتکاروں کو متبادل فراہم کیا جائے اور انہیں پوست کی کاشتکاری سے باز رکھنے کا جواز فراہم کیا جائے۔ اسی سلسلہ میں اکتوبر ۱۹۹۷ء میں اقوام متحدہ کے ڈرگ کنٹرول پروگرام نے طالبان کے ساتھ ایک معاہدہ کیا، جس کے تحت طالبان نے اس پر رضامندی کا اظہار کیا کہ اگر عالمی برادری متبادل فصلیں اگانے کیلئے سرمایہ فراہم کرے تو افغانستان میں پوست کی کاشت ختم کی جاسکتی ہے۔ پروگرام کے سربراہ پینو ارلاچی نے امداد دینے والے ملکوں سے ۲۵ ملین ڈالر دینے کیلئے کہا۔ اس رقم سے آئندہ دس برس میں پوست کی جگہ دوسری فصلیں بونے کی صورت نکالی جاتی۔ پینو ارلاچی کا کہنا تھا کہ ہم دنیا کو سپلائی ہونے والی ہیروئن میں نصف کمی کرنا چاہتے ہیں اور نئی نقد آور فصلیں متعارف کرانا چاہتے ہیں۔ آبپاشی کے نظام کی اصلاح، نئی صنعتوں کا قیام اور قانون کی

عمل داری بھی اس پروگرام کا حصہ ہے۔

لیکن اقوام متحدہ اس معاہدے کی تکمیل میں سنجیدہ ثابت نہ ہوئی، ۱۹۹۸ء میں تمام غیر ملکی این جی اوز کے افغانستان سے نکل جانے کے بعد یہ پروگرام ادھورا رہ گیا اور پوست کی کاشت کاری جاری رہی۔ اس تسلسل میں ان ممالک کا بھی پورا پورا کردار تھا جنہوں نے پوست کی کاشت کے خاتمے کے منصوبے کی تکمیل کیلئے کوئی مؤثر اقدام نہیں کیا۔ چنانچہ ۱۹۹۳ء سے ۱۹۹۷ء کے دوران اقوام متحدہ کے انسداد منشیات کے ادارے نے افغانستان میں منشیات کی پیداوار کے خاتمے کیلئے عالمی برادری سے ۱۶۴۴ ملین ڈالر کے فنڈ طلب کیے، لیکن اسے بڑی مشکل سے نصف رقم حاصل ہوسکی۔ یوں لگتا ہے جیسے یورپ وامریکہ کی حکومتیں بھی ان انڈر ورلڈ منشیات کا کاروبار کرنے والوں کے سامنے بے بس رہی ہیں جو اپنے منافع کی خاطر افغانستان میں منشیات کی پیداوار جاری رکھنا چاہتے تھے۔ جبھی تو یہ ممالک طالبان کی منشیات کیخلاف مہم اور مؤثر پالیسیوں کی حوصلہ افزائی کرنے اور طالبان کے واسطے سے افغانستان سے منشیات کا خاتمہ کرنے کی بجائے ہمیشہ طالبان پر تنقید کرنے اور انہیں برا بھلا کہنے میں لگے رہے۔ حالانکہ طالبان نے بارہا بجا طور پر عالمی برادری کو یہ حقیقت جتلائی کہ اگر وہ واقعی افغانستان میں منشیات کی پیداوار کا خاتمہ کرنا چاہتی ہے تو اسے طالبان کی حکومت کو غنیمت جاننا چاہئے اور اس کی وساطت سے اس مقصد کو حاصل کرنا چاہئے، لیکن بے چاری عالمی برادری کے پاس اس قدر فرصت ہی کہاں تھی کہ وہ کچھ دیر رُک کر طالبان کی اس پیشکش کو سنتی، اس پر غور کرتی اور اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتی۔ اس ساری صورتحال کا منطقی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ افغانستان میں پوست کی کاشت ہوتی رہی، طالبان اس کے خاتمے کیلئے منصوبہ بندی کرتے رہے، لیکن وسائل کی عدم موجودگی کے باعث عملی قدم نہ اٹھایا جاسکا۔ اس دوران ۱۹۹۸ء سے ۲۰۰۱ء تک اقوام متحدہ کے طالبان کے حوالے سے جتنے بھی اجلاس ہوئے، ان میں منشیات کو زیر بحث لایا گیا اور طالبان کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا، تاہم کسی نے بھی انسداد منشیات کیلئے طالبان کے ساتھ تعاون کا اعلان نہیں کیا۔

بالآخر ۲۹ جولائی ۲۰۰۰ء کو طالبان راہنما امیر المؤمنین ملا محمد عمر مجاہد نے پورے افغانستان میں پوست کی کاشت پر مکمل پابندی کا باقاعدہ حکم نامہ جاری کر دیا۔ اس فرمان میں کہا گیا تھا کہ:

> ''چونکہ چرس کا استعمال شرعی نقطہ نظر سے ایک ناجائز عمل ہے جس کی وجہ سے انسانی عقل وحواس کمزور ہوجاتے ہیں بلکہ بسا اوقات زائل بھی ہوجاتے ہیں۔ لہذا وزارت امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے وزیر اور تمام ذمہ داروں کو یہ

اختیار دیا جارہا ہے کہ جہاں کہیں چرس کا کاروبار یا اس کے کارخانے قائم ہیں ان کا مکمل خاتمہ کردیں اور عوام سے اپیل ہے کہ اسلامی اور انسانی ہمدردی کے تحت ان کا بھرپور ساتھ دیں تاکہ کسی کو ان کی مزاحمت کا موقع نہ ملے۔''

ملا محمد عمر کے اس فرمان کو اور اس کے نتیجے میں طالبان کی مہم کو ابتدائی طور پر بین الاقوامی سطح پر محض ایک زبانی کلامی اقدام سمجھا گیا۔ لیکن جب آنے والے دنوں میں اس کے حیرت انگیز اثرات سامنے آئے تو پوری دنیا حیران وششدر رہ گئی۔ طالبان نے واقعی اپنے تمام مقبوضہ علاقوں میں پوست کی کاشت کا خاتمہ کردیا اور اس حقیقت کی شہادت ان کے مخالفین نے بھی دی۔ اس سلسلے میں ہم یہاں صرف ایک گواہی پیش کر رہے ہیں، جو برطانیہ کی لفبرا یونیورسٹی کے پروفیسر گریہم فیرل نے دی۔ ۱۹ جنوری ۲۰۰۴ء کو بی بی سی اردو ڈاٹ کام نے پروفیسر گریہم کی یہ گواہی ''طالبان کی پالیسی کامیاب ترین'' کے عنوان سے مندرجہ ذیل الفاظ میں پیش کی:

''منشیات کے خلاف طالبان کی پالیسی دوسری حکومتوں کی نسبت سب سے زیادہ کامیاب رہی۔ یہ بات برطانیہ کی لفبرا یونیورسٹی کے ایک ماہر جرمیات پروفیسر گریہم فیرل کی ایک رپورٹ میں کہی گئی ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق منشیات کے خلاف افغانستان میں طالبان حکومت کی پالیسی حالیہ برسوں کی کامیاب ترین پالیسی تھی۔

انیس سو نوے کی دہائی میں افغانستان دنیا کو ہیروئن کی سب سے بڑی تعداد سمگل کرتا تھا۔ تاہم طالبان حکومت کی سخت انسداد منشیات پالیسی کے باعث دنیا میں ہیروئن کی پیداوار میں پینسٹھ فیصد تک کمی آ گئی تھی۔ جولائی سن دو ہزار سے طالبان کی یہ پالیسی عمل میں آئی اور ایک سال سے زیادہ رہی۔ ہیروئن کو پوست سے بنایا جاتا ہے لیکن طالبان حکومت نے پوست کی کاشت پر ہی مکمل پابندی لگا دی تھی۔

پروفیسر فیرل نے بی بی سی کے ریڈیو پروگرام ''ورلڈ ٹوڈے'' کو بتایا کہ طالبان پالیسی کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اس کو مقامی سطح پر چلایا۔ مذہبی رہنماؤں اور مقامی گروپوں کو اس پر عمل کرانے کی ذمہ داری سونپ

دی گئی تھی اور اگر علاقے میں پوست کی کاشت ہوتی تو انہی افراد کو جوابدہ ہونا پڑتا اور ان کو سزا ہو جاتی تھی۔ پوست کاشت کرنے والے کاشتکاروں کو بھی سزا ہوتی تھی، ان کے منہ کالے کر دیے جاتے اور ان کو جیل بھیج دیا جاتا۔ طالبان حکومت کے خاتمے کے بعد ملک میں پوست کی کاشت میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ پروفیسر فیرل کا کہنا ہے کہ طالبان کی پالیسی کی کامیابی سے بین الاقوامی سطح پر چلائی جانے والی انسداد منشیات پالیسی کے بارے میں کئی سوالات اٹھتے ہیں۔''

بی بی سی نے اپنی ویب سائٹ پر اس رپورٹ کے ساتھ طالبان دور میں انسداد منشیات کے ایک نوٹس بورڈ کی تصویر بھی شائع کی، جو شاہراہ عوام پر لگایا گیا تھا۔ اس بورڈ پر پشتو اور انگریزی زبان میں تحریر کیے جانے والے اعلان کا ترجمہ درج ذیل ہے:

''امارت اسلامیہ افغانستان نہ صرف غیر قانونی سرگرمیوں کے خلاف مہم جوئی کرتی ہے، بلکہ منشیات کے خلاف بھی مؤثر اقدامات کرتی ہے، کیونکہ یہ شخصیت، شعور، زندگی، صحت، معیشت اور اخلاق کے منافی ہیں۔''

پوست کی کاشت کے خلاف طالبان کی مہم کے آغاز کے بعد جسٹس جاوید اقبال نے افغانستان کا دورہ کیا تو انہوں نے بھی واپسی پر بتایا کہ طالبان پوست کی فصلوں کو نذر آتش کر رہے تھے، اسی طرح اقوام متحدہ اور بی بی سی لندن کے نمائندوں نے بھی گواہی دی کہ طالبان کی اس مہم کے بعد انہوں نے کہیں بھی پوست کاشت ہوتی نہیں دیکھی۔

طالبان حکومت کی طرف سے پوست کی کاشت کیخلاف اس کامیاب مہم کا نتیجہ یہ نکلنا چاہیئے تھا کہ اب تو بین الاقوامی برادری انہیں تسلیم کر لیتی لیکن افسوسناک کہ ان کی خدمات کو نہ سراہا گیا اور بالآخر انہیں اقتدار سے الگ کر دیا گیا۔

آج طالبان کے بعد افغانستان میں پوست کی کاشت کی جو کیفیت ہے اور عالمی ادارے اور حکومتیں اس حوالے سے جن پریشانیوں کا سامنا کر رہی ہیں، اس کی چند جھلکیاں آپ ''طالبان کے بعد'' کے عنوان سے اسی کتاب میں ملاحظہ فرمائیں گے۔



۹

اقوام متحدہ کا کردار

طالبان اور اقوام متحدہ کی آپس میں کبھی نہیں بن سکی۔ اقوام متحدہ کو ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ طالبان اس کی مانتے کیوں نہیں ہیں اور طالبان کا کہنا تھا کہ وہ اس ادارے کی بات اس لیے نہیں مانتے کیونکہ وہ انہیں نہیں مانتا۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ اقوام متحدہ اپنا اعتماد اور تشخص گنوا کر جن سامراجی طاقتوں کی مان مان کر چل رہا ہے، طالبان ان کی کوئی بھی فرمائش ماننے کیلئے تیار نہ تھے، اور اسی وجہ سے وہ سامراجی طاقتیں بھی طالبان کو ماننے کیلئے تیار نہیں تھیں۔

ویسے حقیقت یہ ہے کہ افغانستان کے حمام میں اقوام متحدہ کا ادارہ جس قدر ننگا ہوا ہے، کوئی دوسرا نہیں ہوا۔ اقوام متحدہ کے قیام کے اسباب، وجود کے جواز، انسانی حقوق کے حوالے سے اصول وضوابط، قراردادیں اور مطالبات...... یہ سب چیزیں اس وقت کاغذی پھول کی طرح بناوٹی دکھائی دینے لگے جب اس ادارے کا افغانستان دوغلا اور منافقانہ کردار سامنے آنا شروع ہوا۔

بات اگر بہت پہلے سے شروع کی جائے تو سوائے ایک افسوسناک داستان کے کچھ سامنے نہیں آئے گا، تاہم اتنی بات واضح ہے کہ جب سے طالبان کا افغانستان میں ظہور ہوا، اقوام متحدہ غیر جانبدار رہنے کی بجائے مبینہ طور پر افغان جنگ کے ایک ایسے فریق کے طور پر سامنے آیا، جس نے اس بحران کو بجائے سلجھانے کے مزید الجھادیا۔ طالبان کی آمد سے قبل افغانستان کے بارے میں اقوام متحدہ کا پروگرام بظاہر وہی تھا، جس کو طالبان نے عملی طور پر نافذ کر کے دکھایا۔ مثلاً امن وامان کی بحالی اور افغان قوم کی معاشی واقتصادی خوشحالی۔ لیکن جب طالبان نے ہر کھلی نگاہ کے سامنے ایسے اقدامات کیے جو

سراسر بحالی وخوشحالی کیلئے سنگ میل کی حیثیت رکھتے تھے تو حیرت انگیز طور پر اقوام متحدہ کا ادارہ یوں بھپرتا نظر آنے لگا جیسے طالبان نے کسی بھیانک جرم کا ارتکاب کیا ہو۔ اس صورتحال کو دیکھ کر ہر باشعور شخص کو شدت سے یہ احساس ہونے لگا کہ آخر اقوام متحدہ کن اصول وضوابط کے تحت طالبان حکومت کو رد کرتا ہے اور ان کی مخالفت میں ہمہ وقت کمر بستہ رہتا ہے۔

اس موقع پر ایک عام سی بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ اقوام متحدہ کا مرتب کردہ انسانی حقوق کا منشور اور اس پر عملدرآمد کا دستور چونکہ طالبان نے مکمل طور پر قبول نہیں کیا، اس لیے اقوام متحدہ نے طالبان کی مخالفت کی۔ لیکن ہم یہ بات بالکل بے جا سمجھتے ہیں، اس لیے کہ:

ا۔ اس وقت دنیا میں کئی ممالک ایسے ہیں جو اقوام متحدہ کے رکن ہوتے ہوئے، انسانی حقوق کی ایسی ایسی خلاف ورزیاں کر رہے ہیں جن کی اقوام متحدہ کا منشور قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ مثال کے طور پر کشمیر میں بھارت، فلسطین میں اسرائیل، چیچنیا میں روس اور عراق میں امریکہ و برطانیہ۔ مذکورہ ممالک کی طرف سے انسانی حقوق کی مبینہ خلاف ورزیوں کے بارے میں عالمی ادارہ برائے تحفظ حقوق انسانی (ہیومن رائٹس واچ) وقتاً فوقتاً رپورٹیں بھی جاری کرتا رہتا ہے اور اقوام متحدہ کی طرف سے ان واقعات پر تنقید بھی ہوتی ہے، مذمت بھی کی جاتی ہے اور قراردادیں بھی پاس ہوتی ہیں، لیکن ان سب حقائق کے باوجود ان ممالک کو اقوام متحدہ کی رکنیت سے خارج نہیں کیا جاتا اور نہ ہی اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم سے ان کے خلاف عملی طور پر تادیبی کارروائی کی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف طالبان حکومت نے جب افغانستان میں امن وسلامتی کا ماحول قائم کیا اور جنگ زدہ عوام کو تحفظ فراہم کیا جو کہ ان کی سب سے بڑی ضرورت تھی تو اقوام متحدہ نے بعض ایسے مسائل کا بہانہ بنا کر طالبان کی مخالفت جاری رکھی جن کی اجازت نہ افغان معاشرے کی روایات دیتی ہیں اور نہ ہی طالبان کا سرکاری مذہب اسلام ان کی اجازت دیتا تھا۔ حالانکہ اقوام متحدہ کے منشور میں یہ بات شامل ہے کہ اس کے ذیلی ادارے جس ملک میں بھی انسانی حقوق کے تحفظ کیلئے خدمات سرانجام دیں گے وہ اس ملک کی روایت وثقافت کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے پروگرام مرتب کریں گے اور ایسی کسی سرگرمی کا آغاز نہیں کریں گے جو علاقائی ثقافت وتہذیب سے متصادم ہو۔

۲۔ اقوام متحدہ کا منشور اپنے رکن ممالک سے جن اقدامات کا تقاضا کرتا ہے ان میں سب سے نمایاں اور اہم شخصی حقوق کا تحفظ ہے اور انسانی حقوق میں سب سے اہم فرد کو امن اور سلامتی فراہم کرنا ہے۔ افغان عوام کو امن وسلامتی اور خوشحالی عطا کرنے کے حوالے سے طالبان نے جو کچھ کیا وہ آپ اسی

کتاب کے باب ''میں نے کابل بستے دیکھا'' میں پڑھ چکے ہیں، طالبان کی ان مساعی سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فرد کے حقوق بحال کر رہے تھے اور ان کے تحفظ کیلئے حتی الوسع کوشش کر رہے تھے۔ لیکن طالبان کے ان تمام تر اقدامات سے صرف نظر کر کے اقوام متحدہ کا ارادہ اس بات پر اڑا رہا کہ طالبان عورتوں کے حقوق بحال کریں۔ عالمی ادارے کا یہ مطالبہ بھی بالکل بے جا تھا، اس لیے کہ طالبان نے عورتوں کو جو تحفظ فراہم کیا، حقیقت میں ویسا تحفظ انہیں امریکہ اور یورپ میں بھی حاصل نہیں، اور اس صورتحال کی گواہی کئی غیر جانبدار ذرائع بھی دے چکے تھے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود اقوام متحدہ اپنی رٹ پر اڑا رہا۔ اس کا اصرار تھا کہ طالبان خواتین کی حقوق کی بحالی کیلئے وہ طریق کار اختیار کریں جو اس کا بتایا ہوا ہے، جبکہ طالبان کا کہنا تھا کہ وہ عورتوں کے حقوق کے قائل ہیں اور ان کی بحالی کیلئے بھرپور اقدام بھی کر رہے ہیں، تاہم اس مقصد کے حصول کیلئے طریق کار وہی اختیار کریں گے، جس کی اجازت ان کا مذہب اور ان کا معاشرہ دیتا ہے۔ طرز کار کے اس اختلاف کو بنیاد بنا کر اقوام متحدہ نے طالبان کے خلاف وہ طوفان بدتمیزی برپا کیا کہ الامان، الحفیظ......

اقوام متحدہ اور طالبان کے مابین چپقلش ابتدائی طور پر اس وقت سامنے آئی جب طالبان نے ستمبر ۱۹۹۵ء میں ہرات فتح کیا۔ ہرات شہر میں داخل ہونے کے بعد طالبان نے اعلان کیا کہ لڑکیوں کے تعلیمی ادارے اس وقت تک بند رہیں گے جب تک ان کیلئے علیحدہ تعلیمی نظام قائم نہیں کر لیا جاتا، اسی طرح خواتین کی ملازمت پر بھی پابندی عائد کر دی گئی، لیکن اس سلسلہ میں صحت کے شعبے کی ضرورت کا خیال رکھا گیا اور خواتین کو اس شعبے میں اسلامی احکام کی پابند رہتے ہوئے کام کرنے کی اجازت دیدی گئی۔

یہ انتہائی مناسب اقدام تھے جو طالبان نے اپنے مذہب اور معاشرے کو مدنظر رکھتے ہوئے اٹھائے، لیکن اقوام متحدہ کو یہ سب ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ چنانچہ اس کا مطالبہ تھا کہ طالبان لڑکیوں کو اسکول جانے کی اجازت دیں اور عورتوں کو ہر شعبے میں ملازمت کی اجازت دیں۔ اس مطالبے کے جواب میں جب طالبان نے کہا کہ انہوں نے شہر میں تشویش و خدشے کی فضاء ختم کر کے وہاں امن و امان قائم کیا ہے اور ہر شہری کو تحفظ و سلامتی جیسی اہم ضرورت فراہم کی ہے، لہذا اقوام متحدہ کو چاہئے کہ صرف ملازمت کرنے والی خواتین کیلئے رونے پیٹنے کے بجائے خوشحالی کے دیگر اقدامات میں طالبان حکومت کا ساتھ دے، خاص طور پر اس لیے بھی کہ ملازمت کرنے والی خواتین کی تعداد صرف دو فیصد ہے، طالبان کے اس مؤقف کے جواب میں اقوام متحدہ کی ضد تھی کہ افغانستان میں کام کرنے والے بین الاقوامی اداروں

کو اپنی خدمات سرانجام دینے میں خواتین کی معاونت کی ضرورت ہوتی ہے، لہذا طالبان افغان خواتین کو اقوام متحدہ کے تحت مختلف شعبوں میں ملازمتوں کی اجازت دیں۔ طالبان حکام نے اس مشکل کا حل یہ نکالا کہ غیر ملکی خواتین کو اجازت دیدی گئی کہ وہ افغانستان میں آ کر اقوام متحدہ کے تحت کام کریں۔ تاہم یہ خواتین بھی سروں پر چادر اوڑھنے کی پابند ہوں گی۔

غرضیکہ اقوام متحدہ طالبان نے مخاصمت مول لینے کیلئے جیسے جیسے اپنے مطالبات میں اضافہ کرتا ویسے ویسے طالبان اس کے مطالبات کا معقول حل پیش کرتے رہتے، لیکن اس صورتحال کے باوجود اقوام متحدہ نے طالبان کو اور نہ ہی ان کے اقدامات کو خوشدلی سے قبول کیا۔ یہی وجہ تھی کہ جیسے جیسے طالبان کی فتوحات بڑھتی گئیں اقوام متحدہ کی طالبان مخالفت میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔

۱۹ اپریل ۱۹۹۶ء کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کا افغانستان کی صورتحال پر اہم اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں افغانستان میں دیگر ممالک کی جانب سے ہتھیاروں کی آمد پر غور ہوا۔ اقوام متحدہ کے افغانستان کیلئے نمائندہ خاص محمود مسطیری نے اس اجلاس سے چند دن پہلے ہی، پاکستان پر طالبان کی مدد کا الزام لگا کر طالبان مخالفین کی واضح ترجمانی کی تھی۔ اور پھر ۲۳ مئی ۱۹۹۶ء کو اس نمائندے نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دیدیا۔ اس استعفیٰ کا مقصد بھی طالبان پر دباؤ ڈالنا تھا۔

ستمبر ۱۹۹۶ء میں طالبان اور اقوام متحدہ کے درمیان ایک مرتبہ پھر اس وقت شدید جھڑپ ہوئی جب ۲۷ ستمبر کو کابل میں داخلے کے بعد طالبان نے افغانستان کے سابق کمیونسٹ صدر جنرل نجیب کو اقوام متحدہ کے دفتر سے نکال کر پھانسی چڑھا دیا۔ جنرل نجیب ۱۹۸۶ء سے ۱۹۹۲ء تک افغانستان کا حکمران رہا اور اس دوران اس نے روسی افواج کے ساتھ مل کر اور ان کے جانے کے بعد ان کی طرف سے ملنے والی امداد کے بل بوتے پر افغان مجاہدین کے ساتھ جنگ جاری رکھی، بالآخر جب وہ اس جنگ سے تھک ہار گیا تو اس نے کابل کے اقتدار کو چھوڑ کر شہر سے بھاگنا چاہا، لیکن جب وہ اس کوشش میں ناکام ہو گیا تو اقوام متحدہ نے اسے کابل میں قائم اپنے دفتر میں پناہ دیدی۔ یہی پناہ اس کی جان ۱۹۹۶ء تک بچاتی رہی۔ اس دوران ایک مرتبہ جب اقوام متحدہ کے نمائندوں نے جنرل نجیب کو کابل سے نکالنا چاہا تو صدر ربانی نے اس سے انکار کر دیا تھا اور اقوام متحدہ کو اس اقدام کی اجازت نہیں دی تھی۔ ۱۹۹۶ء میں طالبان کے کابل میں داخلے سے قبل جنرل نجیب نے اسلام آباد میں واقع اقوام متحدہ کے دفتر سے رابطہ کر کے درخواست کی تھی کہ اسے اور اس کے بھائی اور دو ساتھیوں کو کابل سے نکالنے کا بندوبست کر دیا

جائے لیکن ان حالات میں اقوام متحدہ بے دست و پا ہو چکی تھی۔ ۲۶ ستمبر کی شام طالبان کے کابل کے دروازوں پر پہنچنے کے بعد جب احمد شاہ مسعود کابل سے فرار ہو رہا تھا تو اس نے بھی اپنا ایک سینئر جنرل نجیب کے پاس یہ کہنے کیلئے بھیجا کہ اگر وہ اس کی فوجوں کے ساتھ نکل جائے تو اسے بخیریت شمال تک پہنچا دیا جائے گا، لیکن نجیب کو مسعود پر بھی اعتبار نہیں تھا، لہذا اس نے یہ پیشکش ماننے سے بھی انکار کر دیا اور جب اگلی رات طالبان شہر میں داخل ہوئے تو انہوں نے قوم کے اس مجرم کو پکڑ کر سرعام تختۂ دار پر لٹکا دیا۔ اقوام متحدہ اس واقعہ پر سٹپٹا کر رہ گئی، لیکن طالبان کا کہنا تھا کہ:

۱۔ جنرل نجیب افغان قوم کا مجرم تھا، اس کی سزا یہی ہونی چاہئے تھی۔

۲۔ اقوام متحدہ طالبان کو تسلیم نہیں کرتی تو پھر طالبان پر بھی اس کے دفتر اور پناہ کا احترام لازم نہ تھا۔

طالبان جنرل نجیب کے قتل میں اس لیے بھی حق بجانب تھے کہ جب جنرل نجیب کی بار بار درخواست پر طالبان کے کابل میں داخلے سے قبل اقوام متحدہ کا کوئی فرد اس کو بچانے کیلئے نہیں آیا تھا، تو اب اقوام متحدہ کی فراہم کردہ پناہ از خود ختم ہوگئی تھی، لہذا یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں تھا کہ طالبان نے جنرل نجیب کو اقوام متحدہ کی پناہ گاہ سے نکال کر قتل کیا تھا۔

بہر حال کابل پر طالبان کے قبضے کے بعد طالبان اور اقوام متحدہ میں قربتوں کی بجائے فاصلے مزید بڑھنے لگے۔ ان بڑھتے ہوئے اختلافات کا سب سے واضح سبب یہ تھا کہ جنگ سے مفلوک الحال اور سالہا سال سے لاقانونیت کے شکار اس شہر میں اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے اور دیگر بین الاقوامی ادارے اپنی مرضی کا ماحول قائم کر کے اور اپنے وضع کردہ اصول وضوابط کے تحت رہنا چاہتے تھے، انہوں نے ماضی کی طرح اب بھی یہی سوچا تھا کہ اس ملک میں کوئی حکمران نہیں ہے، لہذا وہی اس کے حکمران ہیں، اس لیے کہ مخلوق کو روٹی پانی وہی فراہم کر رہے ہیں۔ اس صورتحال کو سابقہ حکومت نے تو برداشت کیا کیونکہ ایک تو وہ خود ان امدادی رقوم سے بھرپور مستفید ہوتے تھے جو فلاحی امور کی انجام دہی کیلئے بین الاقوامی اداروں کی وساطت سے کابل پہنچتی تھیں اور پھر دوسری بات یہ بھی تھی کہ اگر وہ اقوام متحدہ اور ان اداروں کو شہر میں کام کرنے سے روکتے تو خود ان کے پاس اپنے عوام کا پیٹ بھرنے کیلئے کچھ نہیں تھا، اس لیے کہ انہیں تو باہمی جنگ وجدال سے ہی کبھی فرصت نہ مل پائی تھی۔

ان حکمرانوں کے برخلاف جب طالبان نے کابل میں قدم رکھے تو شہر کو دفاعی، معاشی اور اقتصادی لحاظ سے نہ صرف مکمل طور پر اپنے کنٹرول میں لے لیا بلکہ ایسی ایسی اصلاحات بھی کیں جن سے

عوامی فلاح و بہبود کی راہیں ہموار ہوئیں اور معیشت و اقتصاد بحال ہوئے۔ اس صورتحال کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ اقوام متحدہ اور دیگر بین الاقوامی ادارے من مانے طرز سے کام کرنے کے بجائے ایک منظم اور قانونی ماحول میں رہ کر کام کرنے کے پابند ہو گئے، عوام میں قائم ان اداروں کی اجارہ داری خطرے میں پڑ گئی اور وہ اپنے کئی ایسے منصوبوں پر اوس پڑتی دیکھنے لگے جو انہوں نے کابل کو ماسکو اور پیرس کے روپ میں دیکھنے کیلئے بنائے تھے۔

ایسا نہیں تھا کہ طالبان نے آتے ہی ان اداروں کو بستر گول کرنے کیلئے کہہ دیا، ان کے دفاتر بند کر دیئے اور ان کے پروگرام منسوخ کر دیئے، بلکہ ہوا یوں کہ جب ان اداروں کو ایک باقاعدہ حکومت کے قائم کردہ نظام اور قانون کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے کام کرنے کیلئے کہا گیا تو یہ بات انہیں عار محسوس ہونے لگی کہ ان کے افسر اور ماہرین طالبان کے "دقیانوس" راہنماؤں کے ساتھ بیٹھ کر معاملات طے کریں اور اپنے پروگرام جاری رکھنے کیلئے ان سے اجازت طلب کریں، حالانکہ اگر وہ ایسا کرتے تو یہ ان کے مفاد میں تھا۔ اس لیے کہ طالبان بھی عوام کی فلاح اور خوشحالی کیلئے سرگرم تھے اور بین الاقوامی ادارے بھی خود اپنے بقول کچھ ایسا ہی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن افسوس کہ غیر ملکی اداروں اور اقوام متحدہ کے غیر معقول رویئے کی وجہ سے ایسا نہیں ہو سکا۔ جس کے نتیجے میں طالبان انتظامیہ اور اقوام متحدہ کے مابین اختلاف بڑھتا گیا اور پھر کچھ دنوں بعد کابل اور دیگر کئی اہم شہروں میں اقوام متحدہ کے ذیلی اداروں کا قیام آنکھ مچولی کی صورت اختیار کر گیا۔

دونوں فریقوں کے مابین اس وقت تعلقات مزید کشیدہ ہونے لگے جب ایسی اطلاعات ملیں کہ بین الاقوامی اداروں کے غیر ملکی اہلکار افغانستان کے دیہاتوں میں عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت کر رہے ہیں اور سادہ لوح افغان قوم میں ارتدادی مہم چلا رہے ہیں۔ اس صورتحال کا انکشاف اس وقت ہوا جب طالبان کی خفیہ ایجنسی نے کئی مقامات پر چھاپے مار کر بین الاقوامی اداروں کے دفاتر اور مراکز سے عیسائیت کی تبلیغ پر مبنی لٹریچر اور دیگر مواد برآمد کر لیا۔ ان حقائق کے سامنے آنے کے بعد عالمی اداروں کے پاس طالبان نے ان حالات سے سختی سے نمٹنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ایک طرف تو امیر المؤمنین ملا محمد عمر مجاہد کی طرف سے ایک اعلامیہ جاری ہوا جس میں براہ راست افغان عوام کو مخاطب بنایا گیا تھا۔ اس اعلامیہ میں کہا گیا کہ افغانستان میں جو شخص عیسائیت کی تبلیغ کرتے ہوئے پایا گیا اسے گرفتار کر لیا جائے گا اور جس شخص کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس نے اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا دین قبول کر لیا ہے اسلامی

شریعت کے حکم کے مطابق اسے موت کی سزا دی جائے گی۔

دوسری طرف طالبان نے انتہائی ہوشیاری اور باریک بینی سے بین الاقوامی اداروں کے اہلکاروں کی نگرانی شروع کردی۔ اس سلسلہ میں ایک اہم قدم یہ اٹھایا گیا کہ ان اداروں کوحکم دیا گیا کہ وہ اپنی پوزیشن واضح رکھنے کیلئے افغان عوام سے الگ رہ کر اپنے انتظامی امور نمٹائیں اور عوام سے رابطہ اور دیہاتوں وغیرہ کا سفر صرف اسی وقت کریں جب انہیں اس کی ضرورت ہو۔ طالبان کے اس حکم پر عالمی ادارے بہت جز بز ہوئے، اور اب ان سب نے مل کر جن کی تعداد تیس تک تھی، یہ فیصلہ کیا کہ اگر طالبان اپنا یہ حکم واپس نہیں لیں گے تو وہ اپنی سرگرمیاں معطل کر کے افغانستان سے ہی چلے جائیں گے۔ اس موقع پر اقوام متحدہ کے نمائندے الاخضر الابراہیمی نے بھی طالبان پر خاصی برہمی کا اظہار کیا لیکن ان سب باتوں کے باوجود طالبان اپنے مطالبے پر ڈٹے رہے، انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ ان اداروں کی طرف سے افغانستان کے مسلمانوں میں عیسائیت اور لادینیت پھیلانے کے واضح ثبوت ملنے کے بعد اب اس مسئلے پر قطعاً بات چیت نہیں ہوسکتی۔ طالبان کے اس اصرار کے سامنے جب این جی اوز نے سر تسلیم خم نہ کیا تو طالبان انتظامیہ نے ۲۰ جولائی ۱۹۹۸ء کو کابل میں واقع ان اداروں کے تمام دفاتر زبردستی بند کر دیئے۔ جس کے بعد ان اداروں کے اہلکار بھی افغانستان سے روانہ ہونا شروع ہو گئے۔ طالبان کا یہ اقدام ایک صبر آزما اقدام تھا، لیکن اپنے دین وملت کی حفاظت کیلئے وہ سب کچھ کر گزرنے کو تیار تھے، انہیں معلوم تھا کہ این جی اوز کے افغانستان سے نکلنے کے بعد انہیں زبردست اقتصادی مشکلات کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے، لیکن وہ ذہنی طور پر اپنے آپ کو اس صورتحال سے نمٹنے کیلئے تیار پاتے تھے، این جی اوز کے اس انخلاء پر تبصرہ کرتے ہوئے طالبان کے وزیر منصوبہ بندی قاری دین محمد کا کہنا تھا کہ:

''اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے، وہ ہر کسی کو روزی دیتا ہے، این جی اوز اگر گئی ہیں تو یہ ان کا اپنا فیصلہ ہے، ہم نے انہیں جانے کیلئے نہیں کہا تھا۔''

بین الاقوامی رفاہی اداروں کے کابل سے اس انخلاء سے قبل اقوام متحدہ کی طرف سے طالبان کی مخالفت میں بعض ایسے اقدامات سامنے آچکے تھے، جنہوں نے یقینی طور پر طالبان کو عالمی ادارے کے کردار کے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلاء کر دیا۔

۱۸/ اکتوبر ۱۹۹۶ء کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کا ایک اجلاس ہوا، اس اجلاس میں افغانستان میں جنگ بندی کے حوالے سے بحث ہوئی جبکہ شرکائے اجلاس نے طالبان کی خواتین کے بارے میں

پالیسیوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے طالبان کو برا بھلا کہا۔

مئی ۱۹۹۷ء میں طالبان کو مزار شریف کا حادثہ پیش آیا جس میں طالبان مخالفین نے بغاوت وغداری کے ذریعے دس ہزار کے لگ بھگ طالبان مجاہدین کو قیدی بنانے کے بعد اجتماعی قتل عام کر کے شہید کر دیا۔ شمالی اتحاد کی طرف سے سفاکیت کے اس مظاہرے پر طالبان نے اقوام متحدہ سے مطالبہ کیا کہ وہ اس واقعہ کی مذمت کرے، لیکن اقوام متحدہ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔

دسمبر ۱۹۹۷ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے طالبان کی بجائے سابق افغان صدر برہان الدین ربانی کی جلاوطن حکومت کو اپنی نمائندگی دینے کا اعلان کیا جو کہ سراسر زیادتی اور ناانصافی کے زمرے میں آتا تھا۔ ربانی کو جون ۱۹۹۲ء میں صرف ۴ ماہ کیلئے افغانستان کا صدر بنایا گیا تھا، جس کے بعد وہ چار مرتبہ اپنے ہی خود ساختہ پلیٹ فارموں سے اپنی مدت صدارت میں توسیع کراتے رہے، حتیٰ کہ طالبان نے آ کر انہیں کابل سے نکال دیا۔ وہ افغانستان کے ناکام ترین حکمران ثابت ہوئے۔ ان کے پورے صدارتی دور میں کابل بدامنی وبدحالی کا شکار رہا، جبکہ ملک کے دوسرے حصوں میں طوائف الملوکی رائج ہوئی۔ وہ افغان عوام کو کچھ دے تو نہ سکے البتہ اپنے عوام سے اور ان کے نام پر انہوں نے بہت کچھ جمع کیا۔ افغان مؤرخ عبدالحمید مبارز نے لکھا ہے کہ طالبان کی آمد پر جب ربانی کابل سے فرار ہو رہے تھے تو ڈالروں سے بھری ہوئی تین گاڑیاں ان کے ساتھ تھیں۔ کابل سے فرار کے بعد ربانی کی پوزیشن افغانستان میں اس قدر بھی نہ تھی کہ وہ احمد شاہ مسعود یا دوستم کے پاس رہ سکتے۔ چنانچہ وہ ملک سے باہر چلے گئے اور وہاں جا کر ایک جلاوطن حکومت کا ڈھانچہ قائم کر لیا۔ دوشنبے اور تہران کے درمیان سگِ بے در کی طرح چکر لگا لگا کر وقت گزارنے والے اس شخص کو اقوام متحدہ میں افغانستان کے صدر کے طور پر نمائندہ مقرر کرنا نہ صرف طالبان کے ساتھ زیادتی تھی، بلکہ پوری افغان قوم کے ساتھ بھی اقوام متحدہ کا ایک بھیانک مذاق تھا۔ اس وقت افغانستان کے اسّی فیصد علاقے پر قابض، کامیاب حکومت قائم کرنے اور امن وسلامتی کو عام کرنے والے طالبان کو نظر انداز کر کے ربانی جیسے بے بس وخود ساختہ حکمران کو اس طرح نوازنے سے اقوام متحدہ کا اصل چہرہ کھل کر سامنے آ گیا۔

۲۳ را کتوبر ۱۹۹۸ء کو اقوام متحدہ اور طالبان کے مابین ایک سمجھوتہ ہوا، جس کی رو سے اقوام متحدہ کا غیر ملکیوں پر مشتمل عملہ امدادی کام کیلئے ایک مرتبہ پھر افغانستان واپس جا سکتا تھا۔ اس سمجھوتے سے طالبان کی اہمیت اور حیثیت مزید مستحکم ہو گئی۔

۱۹ دسمبر ۱۹۹۸ء کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے طالبان کو خبردار کیا کہ اگر انہوں نے جنگ بندی کر کے مذاکرات کا آغاز نہ کیا تو ان کے خلاف تادیبی پابندیاں نافذ کر دی جائیں گی۔ سلامتی کونسل میں متفقہ طور پر منظور کی جانے والی قرارداد میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ طالبان مبینہ طور پر دہشت گردوں کو پناہ دینا بند کر دیں اور عورتوں اور لڑکیوں کے خلاف امتیازی سلوک بند کر کے بنیادی انسانی حقوق کو یقینی بنایا جائے۔ اس قرارداد میں سخت زبان استعمال کی گئی تھی۔ تاہم اس میں ٹھوس اور حتمی پابندیوں کا ذکر نہیں کیا گیا تھا۔ روس چاہتا تھا کہ قرارداد میں مخصوص پابندیوں کا ذکر کیا جائے۔ تاہم دیگر اراکین اس پر متفق نہ ہوئے۔ ان کے خیال میں ایک جنگ زدہ ملک پر ان پابندیوں کے کیا اثرات مرتب ہو سکتے تھے۔

سلامتی کونسل نے متفقہ طور پر قرارداد کے ذریعے افغانستان سے مطالبہ کیا کہ وہ دہشت گردوں کو پناہ دینا چھوڑ دے اور عورتوں کے خلاف امتیاز اور منشیات کی پیداوار کو بند کر دے۔

قرارداد میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ اقوام متحدہ کا ایک خاص دفتر افغانستان میں قائم کیا جائے جو کم از کم انسانی حقوق کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ ان کی نگرانی بھی کرے۔

امریکی عہدیداروں کے مطابق یہ قرارداد افغانستان میں دہشت گردوں کو پناہ دینے کے خلاف ایک سخت مؤقف تھا۔ ان کا اشارہ واضح طور پر مشتبہ دہشت گرد اسامہ بن لادن کی طرف تھا جو افغانستان میں مقیم تھا۔ قرارداد میں کہا گیا تھا کہ طالبان دہشت گردوں کو تربیت دے رہے ہیں۔ یہ ایک ایسی قرارداد تھی جس میں افغانستان میں جنگ بند کرنے کا اتنا سخت مطالبہ نہیں کیا گیا تھا۔

اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں منظور ہونے والی اس قرارداد کے جواب میں امیر المؤمنین ملا محمد عمر مجاہد نے ایک بیان جاری کیا، جس میں پاکستان کی طرف سے افغانستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی تردید کی گئی اور کہا گیا کہ طالبان بھی تمام قبائل اور علاقوں کی نمائندگی پر مشتمل وسیع البنیاد حکومت بنانا چاہتے ہیں، لیکن قومی مجرموں کو اس حکومت میں کسی صورت شامل نہیں کیا جا سکتا۔ اس بیان میں یہ بھی کہا گیا کہ اگر اقوام متحدہ طالبان حکومت کو تسلیم کرلے اور افغان کاشتکاروں سے مالی تعاون کرے تو افغانستان میں افیون کی کاشت پر پابندی لگائی جا سکتی ہے۔

اسی ماہ طالبان نے اقوام متحدہ پر کڑی تنقید کی۔ انہوں نے عالمی ادارے پر بجا طور پر الزام عائد کیا کہ وہ افغانستان کے بارے میں جانبدارانہ رویہ اپنا رہا ہے، طالبان نے اقوام متحدہ سے مطالبہ کیا کہ وہ ان کی حکومت کو تسلیم کرے۔ جس کا ملک کے اسی فیصد علاقے پر قبضہ اور کنٹرول ہے۔

طالبان کی طرف سے یہ حقیقت پسندانہ الزام اقوام متحدہ کو سخت ناگوار گزرا، چنانچہ اگلے ہی ماہ اکتوبر ۱۹۹۹ء کی ۱۵ تاریخ کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے خصوصی اجلاس میں اعلان کر دیا گیا کہ اگر طالبان نے ۱۴ نومبر ۱۹۹۹ء تک اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے نہیں کیا تو افغانستان آنے جانے والی کمرشل پروازوں کی ممانعت کر دی جائے گی اور دنیا بھر کے بینکوں میں موجود طالبان کے اکاؤنٹ منجمد کر دیئے جائیں گے۔ ۱۴ نومبر کی تاریخ گزرتے ہی اس پابندی کا اطلاق ہو گیا اور یوں طالبان کے خلاف اقوام متحدہ کے براہ راست اقدامات کا افسوسناک سلسلہ شروع ہوا۔

حیرت انگیز امر یہ تھا کہ اقوام متحدہ کی ان پابندیوں سے قبل طالبان نے امریکہ سے کہا تھا کہ اگر وہ اسامہ بن لادن کیخلاف ثبوت ۲۰ نومبر ۱۹۹۹ء تک فراہم کر دے تو طالبان اسامہ کو امریکہ کے حوالے کریں گے۔ لیکن طالبان کی طرف سے اس پیشکش کو نظر کرتے ہوئے انتہائی ہٹ دھرمی کے ساتھ ان کیخلاف پابندیاں عائد کر دی گئیں۔

۱۹ دسمبر ۲۰۰۰ء کو اقوام متحدہ نے طالبان پر مزید پابندیاں لگاتے ہوئے افغانستان میں تمام تربیتی کیمپوں کو بند کر کے ان کا معائنہ کرانے کا حکم دیا۔ نیز اسامہ بن لادن کے اثاثے منجمد کرنے اور عالمی قوانین کی پابندی کرنے پر زور دیا گیا۔ قراداد کے ذریعے افغانستان پر لگائی جانے والی پابندیوں کی مد میں مندرجہ ٔیل احکام جاری کیے گئے:

۱۔ طالبان حکومت کو ہر طرح کے فوجی ساز و سامان کی فراہمی بند کر دی جائے۔

۲۔ طالبان حکومت کو اقوام متحدہ کی سفارش کردہ اور دیگر تکنیکی امداد کی فراہمی پر بھی پابندی کو یقینی بنایا جائے۔

۳۔ رکن ممالک افغانستان سے سیکیورٹی معاملات کے متعلق مشورہ دینے والے اپنے افسروں، ایجنٹوں اور مشیروں کو واپس بلالیں تاہم اس کا اطلاق اس غیر فوجی ساز و سامان یا تربیت پر نہیں ہوگا جس کا مقصد انسانیت کی بھلائی اور حفاظت ہوگا۔

۴۔ تمام ممالک افغانستان کے ساتھ اپنے سفارتی تعلقات کو کم سے کم درجے پر لے آئیں گے اور عملے کی تعداد اور ان کی نقل و حرکت محدود کر دی جائے گی۔

۵۔ تمام ممالک اپنی سرزمین پر موجود طالبان کے ہر قسم کے دفاتر مکمل اور فوری طور پر بند کر دیں گے جن میں افغان ایئر لائنز آریانا کے دفاتر بھی شامل ہوں گے۔

۶۔ اسامہ بن لادن اور ان سے متعلق افراد اور ان کے فنڈز بلا تاخیر منجمد کر دیں گے۔ اس سلسلے میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ رکن ممالک اور علاقائی تنظیموں کی جانب سے فراہم کردہ اطلاعات کی بنیاد پر ایسے افراد اور اداروں کی ایک تازہ فہرست تیار کی جائے گی جن کا تعلق اسامہ بن لادن کے ساتھیوں سے ہے۔

۷۔ طالبان منشیات کی تمام سرگرمیاں بند کر دیں اور افیون کی غیر قانونی کاشت کے خاتمے کو یقینی بنائیں جس کی رقم دہشت گرد سرگرمیوں میں استعمال کی جاتی ہے۔

۸۔ تمام ممالک پر زور دیا گیا کہ وہ کسی بھی طیارے کو طالبان کے زیر کنٹرول علاقے کیلئے پرواز کرنے، طالبان کے طیارے کو اپنی علاقائی حدود پر سے گزرنے یا وہاں سے آنے والے طیارے کو اپنے ملک میں اترنے کی اجازت نہیں دیں گے۔

۹۔ پابندیوں پر عملدرآمد کو یقینی بنانے والی کمیٹی افغانستان کو انسانی ہمدردی کی بنیاد پر امداد فراہم کرنے والی تنظیموں اور ایجنسیوں کی فہرست تیار کرے گی اور اس پر باقاعدگی سے نظر ثانی کرتی رہے گی اور ان تنظیموں یا ایجنسیوں کے نام اس فہرست سے خارج کر دے گی جن کے بارے میں وہ فیصلہ کرے گی کہ وہ انسانی مقاصد کی بجائے کسی اور مقصد کیلئے پروازیں چلا رہی ہیں یا چلا سکتی ہیں۔

۱۰۔ طالبان سے یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ وہ اقوام متحدہ اور اس سے ملحق انسانی امدادی تنظیموں کے ارکان کی حفاظت، سلامتی اور آزادانہ نقل و حرکت کی ضمانت دیں۔

۱۱۔ تمام ممالک افغان حکومت کے نائب وزیر اور اس سے اوپر کے عہدیداروں اور طالبان کے دوسرے سینئر مشیروں اور اہم شخصیات کو اپنے علاقے میں داخل ہونے یا گزرنے سے روکنے سے اقدامات کریں۔

۱۲۔ سیکریٹری جنرل کوفی عنان سے درخواست کی گئی کہ کمیٹی کے مشورے سے وہ ایک ماتحت کمیٹی تشکیل دیں جس کی ذریعے افغانستان کو ہتھیاروں کی فراہمی پر پابندی اور دہشت گردی کے تربیتی کیمپوں کو بند کرنے کی نگرانی کی جا سکے۔ مذکورہ بالا کمیٹی علاقائی اور بین الاقوامی تنظیموں کی فراہم کردہ اطلاعات کی بنیاد پر طالبان کے زیر کنٹرول افغانستان میں داخل ہونے اور اترنے والے طیاروں، اسامہ بن لادن سے متعلق افراد، تنظیموں اور افغانستان میں انسانی ہمدردی کی بنیاد پر کام کرنے والی ایجنسیوں کی فہرست تیار کرے گی اور اسے اپ ڈیٹ کرتی رہے گی۔

۱۳۔ تمام رکن ممالک اور بین الاقوامی ادارے اقوام متحدہ کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں کی

شقوں پر عمل کریں، چاہے ان پابندیوں کے نفاذ سے قبل ان ممالک یا اداروں اور افغانستان کے درمیان کوئی بین الاقوامی معاہدہ یا مفاہمت ہی موجود کیوں نہ ہو۔

۱۴۔ تمام ممالک ایسے افراد اور اداروں پر جو مذکورہ اقدامات کی خلاف ورزی کے مرتکب پائے جائیں، مناسب جرمانے عائد کریں۔

۱۵۔ تمام ممالک قراداد کے نفاذ کے تیس یوم کے اندر کمیٹی کو آگاہ کریں کہ انہوں نے قرارداد کے مؤثر نفاذ کی خاطر کیا اقدامات کیے ہیں۔

۱۶۔ ان پابندیوں کا نفاذ ایک سال کیلئے ہوگا۔ اس کے بعد سیکیورٹی کونسل فیصلہ کرے گی کہ آیا طالبان نے اقوام متحدہ کے مطالبات پورے کیے ہیں یا نہیں اور یہ کہ مزید اتنی ہی مدت کیلئے پابندیوں میں اپنی شرائط کے ساتھ توسیع کی جائے یا نہیں۔

۱۷۔ سیکیورٹی کونسل اس عزم کا اظہار کرتی ہے کہ مطالبات پر عمل درآمد نہ ہونے کی صورت میں مطلوبہ اہداف حاصل کرنے کیلئے مزید پابندیوں کے نفاذ پر بھی غور کرے گی۔

اقوام متحدہ کی طرف سے ان نئی پابندیوں کی ان دھمکیوں کے جواب میں امیر المؤمنین ملا محمد عمر نے ایک بیان جاری کیا، جس میں افغان قوم کو اس مشکل وقت میں صبر وحوصلہ سے کام لینے کی تلقین کی گئی تھی۔ اس بیان میں کہا گیا کہ:

> ''اقوام متحدہ کی تازہ پابندیاں ناانصافی پر مبنی ہیں۔ اصل بات اسامہ اور پوست کی کاشت نہیں بلکہ اسلام دشمن قوتیں افغانستان میں اسلامی حکومت کو مضبوط ہوتا نہیں دیکھ سکتیں اور یہ ان کے لئے قابل قبول نہیں ہے۔ ماضی میں جب اسامہ کی افغانستان چھوڑ دینے کی خبریں آئیں تو امریکہ اور کفر کی دیگر طاقتوں نے کہا کہ مسائل صرف اسامہ کے جانے سے حل نہیں ہوتے بلکہ ہمارے مزید خدشات موجود ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسامہ محض ایک بہانہ ہے۔ افغان عوام اللہ پر توکل رکھیں، رزق دینے والی اللہ کی ذات ہے (بے شک)۔ اللہ کی مدد سے افغان مشکلات کا مقابلہ کریں۔ کوئی بھی افغانستان کی اسلامی حکومت کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔''

۲۰۰۰ء میں اقوام متحدہ نے نئے ہزاریئے کی مناسبت سے میلینیئم اجلاس منعقد کیا۔ اس اجلاس

میں دنیا بھر کے ممالک کے سربراہوں کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ لیکن افغانستان کے نوے فیصد علاقے کے حکمران طالبان کی بجائے پروفیسر ربانی کو افغانستان کے سربراہ کے طور پر بلایا گیا۔ اقوام متحدہ کا یہ اقدام نہ صرف طالبان کے ساتھ زیادتی تھی بلکہ پوری افغان قوم کے ساتھ ایک بھونڈا مذاق تھا۔ اقوام متحدہ کے اس طرز عمل پر امارت اسلامی کے نمائندے کی طرف سے جنرل سیکریٹری کوفی عنان کو ایک احتجاجی مراسلہ بھیجا گیا۔ اس مراسلے کے مندرجات یہ تھے:

''محترم جناب کوفی عنان

جنرل سیکریٹری اقوام متحدہ، نیویارک

اجازت دیجئے کہ میں اپنی نیک تمنائیں اور دلی احترام آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ گزارش یہ ہے کہ ہمارا اسلامی ملک افغانستان گذشتہ کافی عرصہ سے مسلسل بیرونی تجاوزات کا شکار ہو کر خونریزی اور لایعنی جنگ میں گھرا ہوا ہے اور اس طویل جنگ نے افغانستان میں سوائے موت اور ویرانی کے کوئی چیز باقی نہیں چھوڑی۔ ملک اقتصادی، ثقافتی اور معاشرتی لحاظ سے تباہ حال ہو چکا ہے اور افغان عوام طرح طرح کی مشکلات کا شکار ہو چکے ہیں۔

اپنے ملک کو اس اندوہناک صورتحال سے نکالنے اور اسے مزید خطرات سے بچانے کیلئے اس سرزمین میں بسنے والے اہل ایمان یعنی تحریک اسلامی طالبان نے افغان عوام کی اکثریت کی خواہش کے عین مطابق اسلامی شریعت کے نفاذ، آزادی کے تحفظ، امن وسلامتی کے قیام، خطرناک اسلحہ کو جمع کرنے اور باہمی لڑائی جھگڑوں کو ختم کرنے کیلئے اپنی کوششوں کا آغاز کیا اور اللہ کی مدد ونصرت اور عوام کے تعاون سے مختصر سی مدت میں کامیابیوں سے ہمکنار ہوئے اور تقریباً تمام ملک حتیٰ کہ دارالحکومت کابل، سرحدات اور بندرگاہیں سب کچھ اب ان کے کنٹرول میں ہیں۔

اسلامی اور قومی حکومت قائم ہو چکی ہے، امن وآشتی پورے ملک میں بحال ہو گئی ہے، شر وفساد کا قلع قمع ہو چکا ہے، اور اب افغان عوام سکون واطمینان اور آسودگی کے ساتھ اپنے روزمرہ کے معمولات زندگی کی ادائیگی

میں مصروف ہیں۔

محترم جناب کوفی عنان!

اقوام متحدہ اچھی طرح جانتی ہے اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ ربانی افغانستان کے معزول شدہ صدر ہیں، اور اپنے زیر تسلط علاقے میں بھی جو کہ افغانستان کا پانچ فیصد حصہ بھی نہیں بنتا، وہ کسی قسم کی کوئی قدرت نافذہ اور حاکمانہ صلاحیت نہیں رکھتے چنانچہ اس علاقے میں بدامنی، چوری ڈاکے اور بے سروسامانی کا راج ہے، انتہاء یہ ہے کہ خود ربانی کی جائے اقامت اور محلِ صدارت ہی کے بارے میں پتہ نہیں کہ وہ کہاں واقع ہیں؟ لیکن ان تمام حقائق کے باوجود اقوام متحدہ نے انہیں افغانستان کے صدر کی حیثیت سے اپنے ۲۰۰۰ء کے اس خصوصی اجلاس میں شرکت کی دعوت دی ہے جو حال ہی میں نیویارک میں منعقد ہو رہا ہے۔ کیا ربانی اس اجلاس میں طے پانے والے امور اور معاہدوں کو عملی جامع پہنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟ ایسی صورتحال میں انہیں اس اجلاس میں مدعو کرنا وقت ضائع کرنے کے سوا کچھ نہیں۔

اگر اقوام متحدہ واقعی پوری دنیا میں امن و صلح قائم کر کے باہمی تنازعات کا خاتمہ چاہتی ہے تو لازم ہے کہ وہ حقائق سے چشم پوشی نہ کرے اور حق دار کو اس کا حق پہنچائے۔

امارت اسلامیہ افغانستان ایک مرتبہ پھر اقوام متحدہ سے مطالبہ کرتی ہے کہ اقوام متحدہ میں افغانستان کی نشست امارت اسلامیہ افغانستان کو دی جائے اور یہ کہ اقوام متحدہ افغان عوام کے دشمنوں کی حمایت سے دستبردار ہو جائے۔''

فروری ۲۰۰۱ء میں طالبان نے بامیان کے بتوں کی تباہی کا اعلان کیا تو اقوام متحدہ کے ذمہ دار ایک مرتبہ پھر چکرا کر رہ گئے۔ مارچ ۲۰۰۱ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں طالبان پر زور دیا گیا تھا کہ وہ بتوں کو نہ توڑیں۔

اسی دوران اقوام متحدہ کے جنرل سیکریٹری کوفی عنان اسلام آباد آئے اور انہوں نے طالبان کے نمائندے سے اس بارے میں مذاکرات کیے، لیکن اقوام متحدہ کی ایک نہ چلی اور بامیان کے بت تباہ

کر دیئے گئے۔ طالبان کا مؤقف یہ تھا کہ اقوام متحدہ نے گزشتہ ایک سال سے افغانستان پر اقتصادی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں جن کی وجہ سے لاکھوں افغان مشکلات کا شکار ہیں، جن لوگوں کو ان انسانوں کے تڑپ تڑپ کر مرنے کی فکر نہیں وہ محض مٹی کے بنے ہوئے بوسیدہ مجسموں کا اتنا درد کیوں محسوس کر رہے ہیں۔ اقوام متحدہ کے پاس طالبان کے اس سوال کا کوئی معقول جواب نہیں تھا۔

جولائی ۲۰۰۱ء میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے امریکہ اور روس کے کہنے پر یو این مانیٹرنگ کی منظوری دی جس کا شرمناک مقصد یہ تھا کہ افغانستان کیخلاف لگائی جانے والی اقوام متحدہ کی پابندیوں کی عملی صورتحال کا جائزہ لیا جائے اور افغانستان کی سرحدوں پر بیٹھ کر نگرانی کی جائے کہ کوئی ملک ان پابندیوں کی خلاف ورزی تو نہیں کر رہا۔ یہ نگرانی اقوام متحدہ کے انسپکٹروں نے کرنی تھی اور یہ بالکل ویسا ہی ڈرامہ تھا جیسا بعد میں عراق کے ''مہلک ہتھیار'' تلاش کرنے کیلئے رچایا گیا اور اس کے بہانے عراق میں امریکی اور برطانوی جاسوس داخل کر دیئے گئے، لیکن طالبان صدام کی طرح نہیں تھے، انہوں نے اقوام متحدہ کے ان مجوزہ مانیٹرنگ گروپوں کو ''افغان دشمن'' قرار دیا اور کہا کہ اگر کسی جانب سے اقوام متحدہ کے کسی انسپکٹر نے افغانستان میں داخل ہونے کی جسارت کی تو اسے عبرتناک سزا دی جائے گی۔ پاکستان کے عوام نے بھی اقوام متحدہ کے اس اقدام کی مخالفت کی اور اسی مخالفت کے نتیجے میں چالیس مذہبی اور سیاسی جماعتوں نے اسلام آباد میں ایک بہت بڑا اجلاس منعقد کر کے اقوام متحدہ کا یہ فیصلہ مسترد کر دیا اور ۸/ اگست ۲۰۰۱ء کو انہی جماعتوں نے ''دفاع پاکستان و افغانستان کونسل'' کے قیام کا اعلان کیا۔

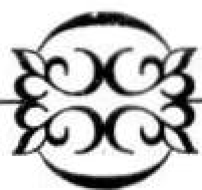
گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکی ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی دونوں عمارتیں اور پینٹا گون کی عمارت فدائی حملہ آوروں نے تباہ کیں تو امریکہ نے ان حملوں کا ذمہ دار اسامہ بن لادن کو ٹھہرایا اور اسامہ کی پشت پناہی کے جرم میں طالبان کو بھی زیر عتاب کر لیا۔ اس موقع پر اقوام متحدہ نے ایک مرتبہ پھر کھل کر طالبان کیخلاف امریکہ کی ہاں میں ہاں ملائی اور ان حملوں کے اگلے ہی دن اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا اجلاس منعقد کیا گیا، اس اجلاس میں پوری دنیا سے دہشتگردی کے خلاف تعاون کی اپیل کی گئی۔ جنرل اسمبلی کی اس قرارداد کا واضح اشارہ طالبان اور اسامہ کی طرف تھا۔

۲۹ دسمبر ۲۰۰۱ء کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے ایک متفقہ قرارداد کے ذریعہ دہشتگردوں اور ان کے سیاسی اور فوجی معاونین کے خلاف طاقت استعمال کرنے کی اجازت دیدی۔ یہ اجازت گزشتہ سات سال سے جاری اقوام متحدہ کی ان ناکام سازشوں کا لب لباب تھا جو یہ عالمی ادارہ طالبان کی اسلامی

حکومت کیخلاف کررہا تھا۔ طالبان کے خلاف طاقت کے استعمال کی یہ قرارداد منظور کرکے سلامتی کونسل نے یہ ثابت کردیا تھا کہ وہ ہر حال میں طالبان کا خاتمہ چاہتی ہے۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ دہشتگردی کیخلاف طاقت کے استعمال کی یہ قرارداد منظور ہونے کے بعد جنرل اسمبلی کے اراکین اس بحث میں الجھ پڑے کہ دہشتگردی کی تعریف کیا ہوگی؟ ظاہر سی بات ہے جس دہشتگردی کا الزام طالبان پر عائد کیا جارہا تھا ایسی دہشتگردیاں بلکہ اس سے کئی گنا بڑی کارروائیاں امریکہ اور روس جیسے بڑے ممالک خود بھی کرتے چلے آئے تھے، لیکن ان کو اس قرارداد کی زد میں آنے سے بچانا بھی ضروری تھا۔ اسی مشکل کا حل تلاش کرنے کیلئے جنرل اسمبلی کا یہ اجلاس مزید پانچ دن جاری رہنے کے بعد ۴/ اکتوبر کو ختم ہوا، تاریخ میں پہلی مرتبہ جنرل اسمبلی کے اجلاس میں ۱۵۶ مقررین نے اس ایک نکاتی ایجنڈے پر تقریریں کیں، لیکن ان کے اپنے لبادوں پر لگے ہوئے دہشت گردی کے سیاہ دھبوں نے انہیں کسی نتیجہ تک پہنچنے سے روک دیا، اور یوں یہ اجلاس دہشتگردی کی تعریف متعین کیے بغیر ہی ختم ہوگیا۔ تاہم دہشتگردی کیخلاف طاقت کے استعمال کی سلامتی کونسل کی طرف سے اجازت نے امریکہ اور اس کے حواریوں کو افغانستان جیسے بے بس ملک پر حملہ آور ہونے کا جواز فراہم کردیا۔

۷ اور ۸ اکتوبر ۲۰۰۱ کی رات افغانستان پر صلیبی حملے شروع ہوئے تو اقوام متحدہ کے جنرل سیکریٹری کوفی عنان بھی حرکت میں آ گئے، انہوں نے ان حملوں کو جائز اور بجا قرار دیتے ہوئے افغانستان کی آئندہ حکومت کے انتخاب وقیام کیلئے جدوجہد شروع کردی، اور پھر وہ اپنی ان کوششوں میں کامیاب بھی ہوگئے، لیکن کیا آنے والے دنوں میں اقوام متحدہ افغانستان کو وہ خوشحالی اور خوشیاں دینے میں کامیاب ہوگئی جس کے وعدے وہ طالبان حکومت کے خاتمے کے وقت کرتی رہی؟

ہمارے قارئین اس سوال کا جواب ''طالبان کے بعد'' کے عنوان کے تحت اسی کتاب میں ملاحظہ کریں گے۔



۱۰

طالبان کیسے آئے؟

۱۹۹۵ء میں طالبان جب ہرات کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے تو ان کا مقابلہ کرنے والی افواج میں جنرل عظیمی بھی شامل تھے۔ جنرل عظیمی ہرات کے حکمران اسماعیل خان کے قریبی اتحادیوں میں سے تھے اور ان تین کمیونسٹ جرنیلوں میں سے ایک تھے جنہوں نے ۱۹۹۲ء میں جنرل نجیب کے کابل اقتدار کو چھوڑنے کے بعد شہر کا کنٹرول سنبھال لیا تھا۔ طالبان کے ہرات پر قبضے کے بعد انہوں نے فارسی میں ایک کتاب لکھی جس کا نام ''طالبان چگونہ آمدند؟'' (طالبان کیسے آئے؟) ہے۔ اس کتاب کا ایک باب طالبان کی جنگی حکمت عملی اور سرفروشی پر بہترین شاہد ہے۔ اسی لیے میں اس باب کا ترجمہ کر کے اسے اپنی اس کتاب کا حصہ بنا رہا ہوں۔

ملاحظہ فرمایئے جنرل عظیمی کی کتاب ''طالبان چگونہ آمدند'' کا ایک اہم باب:

''یہ ان دنوں کی بات ہے جب طالبان کابل کے دہانے پر پہنچ چکے تھے۔ دارالحکومت کے اردگرد ہر جانب افراتفری پھیلی ہوئی تھی اور طالبان کا ایک بڑا حریف غفار اخوند ہیرمند سے فرار ہو کر غور بند پہنچ چکا تھا۔ انہی دنوں جنوب مغربی علاقے سے پچیس ہزار مسلح افراد پر مشتمل ایک لشکر جرار جس کی قیادت جنرل علاؤالدین اور جنرل ہلالی کے سپرد تھی ہیرمند کو طالبان کے متوقع حملوں سے بچانے کیلئے روانہ ہوا۔

یہ پہلا منظم ترین لشکر تھا جو جنوب مغربی علاقے سے روانہ ہوا تھا۔ اگرچہ اس سے قبل بھی صوبہ فاریاب اور دوسرے علاقوں میں ہمارے لشکر گئے تھے لیکن کیفیت اور تعداد کے لحاظ سے وہ ہرگز اس لشکر

کے مقابلے کے نہ تھے۔ بہر حال یہ لشکر دریائے دل آرام سے بیس کلومیٹر جنوب کی سمت میں تبہ ہائی سنگلان نامی مقام پر پہنچا ہی تھا کہ اچانک اس کی طالبان سے مڈ بھیڑ ہوگئی۔

ممکن بلکہ بہت ممکن ہے کہ جنگی تیاریوں، سفری سہولتوں، ساز وسامان اور کثرت افراد کی وجہ سے یہ لشکر ہر دیکھنے والے پر ہیبت طاری کر رہا تھا اور دل میں رعب بٹھا رہا تھا کیونکہ روس کے جانے کے بعد اس علاقے میں عظیم الشان لشکر کی مثال نہیں ملتی، لہٰذا شاید اسی بناء پر ہماری افواج کا غرور وتکبر حد سے بڑھ رہا تھا اور لشکر کے اکثر کمانڈر اور ذمہ دار بے پروائی کا شکار ہو چکے تھے اور اس لحاظ سے لشکر کی حالت اتنی شکستہ تھی کہ صاف طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی چھوٹا سا لشکر بھی اس پر حملہ آور ہو کر شکست سے دوچار کر سکتا ہے اور اسے درہم برہم کر سکتا ہے۔

دیگر کئی کمزوریوں کی طرح اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دشمن خود ہماری صفوں میں موجود تھا اور وہ اس طرح کہ ہماری افواج میں ایک بہت بڑی تعداد پشتونوں کی تھی جن کی اکثریت قندھار ہیرمند اور فراہ کے باشندوں پر مشتمل تھی۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں قومیت ایک ایسا مسئلہ ہے جسے مافوق العادۃ کا درجہ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ان میں سے بہت سے افراد ایسے تھے جو کم از کم اپنے دلوں میں طالبان کے لئے نرم گوشہ رکھتے تھے اور یہ بھی بعید نہیں کہ ان میں کچھ لوگ طالبان کے لئے جاسوسی بھی کرتے ہوں جب کہ دوسری طرف فوج کا باقی حصہ اس علاقے کی زبان ورواج اور طور طریقوں سے بھی نابلد تھا۔ ان تمام وجوہات کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا لشکر انتہائی ناقص اور کمزور تھا لیکن اس کے باوجود فوج کے کمانڈر بری طرح غرور وتکبر کے نشے سے سرشار اور فتح کے گھمنڈ میں مبتلا تھے۔ چنانچہ ان کے ذہنوں میں یہی تھا کہ طالبان اس قدر مسلح اور بڑی تعداد پر مشتمل لشکر کا قطعاً سامنا نہ کر سکیں گے (چہ جائے کہ اس پر حملہ آور ہوں) یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے پڑاؤ کے مقام پر کسی قسم کے کوئی حفاظتی اقدامات نہ کیے حتیٰ کہ اپنے آس پاس بارودی سرنگیں بھی نہ بچھائیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ ایک بڑا مسئلہ یہ بھی تھا کہ ہراتی فوج کے بیشتر کمانڈر طالبان کے طریقہ جنگ سے بالکل ناواقف تھے اور اس سے بڑھ کر مزیدار بات یہ تھی کہ ہمارے اس لشکر کے پاس طالبان کی افواج کے بارے میں بھی کسی قسم کی کوئی اطلاع نہ تھی چنانچہ ہمیں کچھ معلوم نہ تھا کہ طالبان کے پاس کتنے افراد ہیں؟ اور کتنا اسلحہ؟

انہی حالات میں جب ایک تاریک رات میں اندھیرا ہر طرف چھایا ہوا تھا اور ہمارا لشکر خوابوں کے مزے لوٹ رہا تھا، طالبان اچانک اس پر حملہ آور ہوگئے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہمارا خط اول

(فرنٹ لائن) توڑتے ہوئے ہماری صفوں کے بالکل مابین گھس آئے۔ انہوں نے اپنی جنگی حکمت عملی کے تحت رات کی تاریکی سے خوب فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ جونہی ان کا سامنا ہمارے کسی فوجی سے ہوتا تو فورا کہنے لگتے کہ "ہم غفار اخوندزادہ کے ساتھی ہیں" یا اسی طرح کسی اور کمانڈر کا حوالہ دیتے جو ہمارا حلیف ہوتا۔ انہوں نے اپنی شناخت چھپانے کیلئے اپنے لمبے لمبے کرتوں کے دامنوں کو بھی گرہ لگا لی تھی۔ یوں طالبان نے صرف چند لمحوں میں ہم کو ایسا حواس باختہ کیا اور ہماری طاقت اس طرح توڑی کہ ہمارے لیے توپخانے، ٹینک یا دیگر بھاری اسلحہ کا استعمال ناممکن ہو کر رہ گیا اور پسپائی اختیار کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ رہا۔ صورتحال ایسی تھی کہ ہماری فضائیہ بھی رات کی تاریکی میں کارآمد نہ ثابت ہوئی اور اگر ثابت ہو سکتی تھی جب بھی ہم اسے استعمال کرنے کے قابل نہ رہے تھے۔ خلاصہ یہ کہ وہ مشکل ترین رات ہمارے لیے ایک طویل رات بن گئی جس کی صبح کے آثار دور دور تک ناپید تھے۔

اس رات کی بازی سراسر طالبان کے حق میں رہی تھی اور وہ رات کی تاریکی میں بڑھتے بڑھتے ہمارے لشکر کے بالکل ابتدائی حصے (خط منتظرہ) تک پہنچ گئے تھے۔ چنانچہ ہمارے لشکر میں سے بہت کم افراد ہی ایسے تھے جن کا ان سے آمنا سامنا نہ ہوا ہو۔ خود جنرل ہلالی نے مجھے بتایا کہ وہ اس معرکے میں دو مرتبہ طالبان کے ہاتھوں گرفتار ہوتے ہوتے بچ گیا۔

طالبان کی پیش قدمی کی حکمت عملی کچھ اس طرح کی تھی کہ انہوں نے آگے بڑھتے ہوئے دائیں بائیں کی ذرہ برابر فکر نہ کی اور تمام تر توجہ آگے بڑھنے پر رکھی۔ یہ طریق کار اگرچہ عسکری لحاظ سے خطرہ مول لینے کے سوا کچھ نہیں ہے لیکن بہرحال اس طرح مقابلے میں شکست خوردہ فوج پر بہت برا اثر پڑتا ہے اور وہ مرعوب ہو کر منتشر ہو جاتی ہے۔

ان تمام امور کے علاوہ طالبان نے ایک کامیابی یہ حاصل کی تھی کہ انہوں نے ہمارا ایک نہایت اہم فوجی راز یعنی نامِ شب معلوم کر لیا تھا اور پھر انہوں نے اس سے بھرپور طریقے سے فائدہ اٹھایا۔ جنگ کے اختتام پر ہمارے بیشتر ساتھیوں نے بتلایا کہ ان کے سامنے جونہی کوئی طالب آتا تو فوراً نامِ شب پکارتا اور کہتا کہ میں غفار اخوندزادہ کا ساتھی ہوں۔ اس صورتحال میں دوست و دشمن میں تمیز کرنا انتہائی مشکل ہو چکا تھا، کیونکہ زبان لباس اور علاقہ بھی کچھ مشترک تھا۔ بہرحال یہ رات ہمارے لیے بہت خوفناک ثابت ہوئی جس میں ہمارے ایک ہزار سے زائد فوجی طالبان کے ہاتھوں گرفتار ہوئے اور ہمارے اسلحہ کا ایک بڑا ذخیرہ ان کے قبضہ میں چلا گیا۔ یوں ہمیں سخت ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا جب کہ

طالبان کو عظیم الشان فتح ملی جس نے ان کے عزم و حوصلے اور مورال کو مزید بلند کر دیا اور ان کی جرأت اس قدر بڑھ گئی کہ دن کی روشنی میں انہوں نے ہمارے کئی فوجیوں کو گرفتار کر لیا جو ایک گاڑی پر جنگی حدود کے قریب سفر کر رہے تھے۔

طالبان کے ساتھ جنگ کے ان نتائج نے ہمیں سخت افسردہ کر دیا۔ خاص طور پر جنرل علاءالدین خان صورتحال سے سخت شکستہ دل تھا اور وہ پوری کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح ہرات کی افواج کی طاقت دوبارہ بحال ہو سکے۔ مگر اتفاق کی بات کہ اسی دن عصر کے وقت جنرل علاءالدین کو سینے میں گولی لگی اور وہ ایسا زخمی ہو گیا کہ کسی کو اس کے بچنے کی امید نہ رہی۔

جنرل علاءالدین کے بعد جنرل ہلالی نے فوج کی قیادت سنبھال لی اور ایک بہترین عسکری قائد ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے اس نے عقب نشینی اختیار کی اور پرانی فوجوں کو بیس کلومیٹر پیچھے لے گیا اور دریائے دل آرام کے کنارے پھیلا کر متعین کر دیا۔ لیکن اس اقدام کے باوجود چونکہ فوج شکست کی وجہ سے بدحال ہو رہی تھی لہٰذا ایسی فوج کو سنبھالنا کسی طرح بھی آسان کام نہ تھا۔ ایک طرف محاذ جنگ کی یہ صورتحال تھی اور دوسری جانب اسماعیل خان کے دفتر میں ہرات کی افواج کے کمانڈروں کا ایک ہنگامی اجلاس ہو رہا تھا۔ جس میں لڑائی کے احوال اور فوجوں کی نفسیات سے متعلق اہم صلاح مشورے ہو رہے تھے۔ اس اجلاس میں اسماعیل خان اور اس کے نائب عبدالخالق، جنرل افضلی، ڈاکٹر طاہر، جنرل مجید، غلام یحییٰ اکبری، بصیر غوریاتی، جنرل قتالی اور میں شامل تھے۔

اس اجلاس کے اختتام پر اسماعیل خان نے ٹیلیفون پر صدر برہان الدین ربانی سے کابل بات کی اور ان سے درخواست کی کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے پانچ ہزار مسلح افراد پر مشتمل ایک فوج ہماری مدد کیلئے روانہ کریں، ورنہ عین ممکن ہے شنیڈ ڈ کا ائیر پورٹ بہت جلد ہمارے قبضے سے نکل جائے۔“



۔۔۔۔۔۔۱۱۔۔۔۔۔۔

طالبان کے بعد

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ کسی بھی نعمت کی صحیح قدر و قیمت اس کے چھن جانے کے بعد محسوس ہوتی ہے۔ طالبان جب برسر اقتدار تھے تو مغربی حلقے اور ان کے تمام پیروکار شب و روز انہیں طعن و تشنیع اور دشنام طرازی کا نشانہ بناتے تھے۔ انہیں طالبان کا طرز حکومت، ان کا مسلک و مشرب، ان کی پالیسیاں اور طریق کار بہت برا محسوس ہوتا تھا اور وہ مسلسل ان پر تنقید کرتے رہتے تھے، اور پھر ایسا ہوا کہ طالبان کی حکومت واقعی ختم ہوگئی۔ عین ان لوگوں کی مرضی اور خواہشات کے مطابق اب دنیا بھر کے عوام انتظار کررہے تھے کہ دیکھئے کب افغانستان میں امن قائم ہوتا ہے، خوشحالی آتی ہے، آزادیٔ فرد ملتی ہے، حقوق نسواں بحال ہوتے ہیں، دہشت کی فضاء کا خاتمہ ہوتا ہے، طوائف الملوکی دم توڑتی ہے اور افغان عوام عالمی برادری کے ''تعاون'' سے امریکہ اور اقوام متحدہ کی زیر سرپرستی ترقی کا نیا سفر شروع کرتے ہیں؟

یہ تمنائیں، امیدیں اور سوالات بلا جواز اور بے بنیاد نہیں تھے، اس لیے کہ ان سب باتوں کا وعدہ طالبان حکومت کا خاتمہ کرنے والوں نے بڑے زور و شور کے ساتھ کیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ آج یہ وعدہ کرنے والے خود حیران و سرگرداں ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ امن و سلامتی کی ان فاختاؤں کو جو ملا محمد عمر کے قندھار سے نکلتے دم فضاؤں میں گم ہوگئیں، کیونکہ دوبارہ بلایا جایا اور کیسے بلایا جائے؟

برطانیہ میں قائم عالمی نشریاتی ادارہ بی بی سی کسی بھی دور میں طالبان کا حامی نہیں رہا، اس نے ہمیشہ طالبان پر تنقید کی اور انہیں اپنی مخالفت کا ہدف بنایا۔ افغانستان پر امریکی حملوں کے بعد دو سال مکمل

ہونے پر ۷/ اکتوبر ۲۰۰۳ء کو اس ادارے نے طالبان کے بعد کے افغانستان پر ''اور جنگ جیتو گے؟'' کے عنوان سے ایک خصوصی تجزیہ پیش کیا، ہم وہ تجزیہ یہاں درج کر رہے ہیں:

''آج کے امریکی اخبارات میں ایک خبر ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ ہر برس سال سسر، نرسوں سیکرٹریوں اور پالتو جانوروں تک کے خصوصی دن منانے والا ملک اور اس پر ہفتوں پہلے سے واویلا کرنے والا میڈیا یہ بھول گیا کہ سات اکتوبر افغانستان پر امریکی حملے کا دن ہے۔ دو برس پہلے اسی دن دنیا کے غریب اور پسماندہ ترین ملک کی بے دست و پا طالبان فوج اور بندوقوں، کلہاڑیوں اور تلواروں سے مسلح ان کے پاکستانی حامیوں کی سرکوبی کیلئے امریکہ نے بی باون طیارے بھیجے جو از منہ قدیم کے ان جنگجوؤں کی پہنچ سے بہت دور رہتے ہوئے ان پر اتنے وزنی اور خطرناک بم گراتے رہے جنہوں نے پہاڑوں کا بھی سرمہ بنا دیا، اور ایسے خوبصورت رنگوں والے کلسٹر بم جو اس وقت نہ پھٹے تو اب دو سال بعد تک پہاڑوں اور میدانوں میں بچوں کو لالچ دلا کر ان کی جانیں لے رہے ہیں۔ امریکی عوام امن پسند لوگ ہیں، جنگ شروع کرنے کے بارے میں ان کے کوئی طے شدہ نظریات نہیں ہیں لیکن جب لڑائی شروع ہو جائے تو وہ دو چیزوں کا مطالبہ کرتے ہیں: ایک یہ کہ جنگ جلد از جلد ختم ہو جائے اور دوسرا اس میں جیت ان کی ہو۔ لہذا اس بات سے بے خبر، یا اس کے باوجود کہ یہ ہاتھی کا چیونٹی سے مقابلہ تھا، امریکیوں نے اس فٹافٹ جیت کو اپنی فتوحات کے سلسلے میں ایک اور اضافہ اور اس بات کا ثبوت جانا کہ خداوند خدا ان سے خوش ہے۔ تو اس فتح کا جشن ہر سال کیوں نہیں منایا جاتا؟ یا کم از کم اس دن اپنے کارناموں کی یاد کیوں نہیں تازہ کی جاتی؟ اپنے شہیدوں کی بہادری کا ذکر کیوں نہیں کیا جاتا؟ شاید اس لیے کہ بیشتر امریکی شہید (اور تقریباً سبھی کینیڈین شہید) امریکی فوجیوں ہی کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ شاید اس لیے بھی کہ جنگ کی بات کرنے سے اس کے ایک بڑے مقصد کا ذکر بھی آ سکتا ہے جو صدر بش کے الفاظ میں اسامہ بن لادن اور ملا عمر کی گرفتاری تھا اور اس میں ناکامی کے ذکر سے

امریکہ میں کسی کو خوشی نہیں ہوگی اور رہے وہ فوجی جنہوں نے براہ راست ٹنوں وزنی بم پھینکے تو انہیں اس بات کا پورا یقین تھا کہ نیچے سے کوئی توپ انہیں نشانہ بنانے کیلئے موجود ہے نہ ہی ہوا میں کوئی طیارہ۔ تو کہاں کی بہادری، کون سے کارنامے! اس جنگ کے واقعات تو امریکی پائلٹ اپنے بچوں کو سنانے سے بھی شرمائیں گے۔ رہے امریکی عوام تو انہیں یہ سب جاننے کی خواہش بھی نہیں۔ انہوں نے اپنی فتح پر خوشی منائی اور مزید خوشیوں کی تلاش میں آگے نکل گئے، لیکن افغانستان وہیں کھڑا ہے۔ وہی بھوک، وہی افلاس، وہی بدحالی، وہی بدامنی، ناانصافی اور ظلم جس نے سن چورانوے کے آس پاس طالبان تحریک کو جنم دیا تھا۔ انسانی ہمدردی کا کام کرنے والی تنظیموں نے ایک سے زیادہ رپورٹوں میں دعویٰ کیا ہے کہ آج امریکہ کے زیر تسلط افغانستان میں عورتوں، لڑکیوں اور لڑکوں کی عصمت دری طالبان کے دور کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے، پوست کی کاشت ایک بار پھر بڑھ گئی ہے۔ ایک بار پھر وہاں کی عوام نہ چاہتے ہوئے ایسی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں جہاں نہ ان کے سر پر چھت ہے نہ کھانے کو روٹی، جہاں دکانوں میں مجبوری بکتی ہے اور کھیتوں میں بارودی سرنگیں اُگتی ہیں۔ طالبان نے اپنے دور حکومت میں حقوق انسانی کو اکثر پامال کیا تھا، وہ عورتوں کی تعلیم ہو، گناہگار کو سزا دینے کا معاملہ یا بدھا کے مجسمے کا تضیہ۔ وہ آج کی دنیا کو صدیوں پرانے طریقے سے چلانا چاہتے تھے، اس لیے ان کی ناکامی پر پوری دنیا نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب اس دنیا کو یہ بھی جاننا پڑے گا کہ ان جنگلیوں نے لوگوں کی جان و مال اور عزت کی رکھوالی بھی کی تھی۔ اور یہ بھی کہ امریکی ڈالر سے خریدے گئے افغان جنگجو سردار کل بھی قاتل اور لٹیرے تھے اور آج وزیر دفاع اور صوبائی گورنر بن کر بھی وہی ہیں۔ فرق ہے تو صرف اتنا کہ امریکی سیکشن افسروں کی اشیرباد سے بننے والے یہ اہلکار آج گلی سے کسی بھی عورت مرد یا بچے کو تاوان اور ہوس کیلئے اٹھالے جاسکتے ہیں، یہ جانتے ہوئے کہ ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوگی۔ افغان عورتوں کی تنظیم

''روا'' جس نے طالبان کے دور میں عورتوں کو دبائے جانے کی ہر کوشش کا بہادری سے مقابلہ کیا تھا، اب خوفزدہ ہے۔ تنظیم کی ایک اہلکار کا کہنا ہے کہ طالبان تو صرف خواتین کو گھر سے باہر نکلنے پر سختی کرتے تھے لیکن اب تو عورتوں کو اپنی جان اور عصمت گھر کی چاردیواری میں بھی خطرے میں نظر آتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ جنگجو سرداروں نے غنڈے پال رکھے ہیں جو کسی کو بھی اٹھا لے جاتے ہیں اور جب تک تاوان ادا نہیں ہوتا اس سے جبری مشقت لیتے ہیں۔ ''فاتح'' فوج آج بھی افغانستان میں ہے۔ ساڑھے گیارہ ہزار فوجی اور ہزاروں ٹن اسلحہ، لیکن یہ فوجی اپنا دفاع کریں یا ان کمزوروں کا؟ جدید ترین ہتھیاروں اور حفاظتی آلات سے لیس یہ فوجی دارالحکومت کابل کے اندر ہی دبک کر رہنے میں عافیت جانتے ہیں۔ کابل میں نئی عمارتیں بن رہی ہیں، شراب خانے کھل چکے ہیں، انواع واقسام کے کھانے باآسانی دستیاب ہیں اور فوجیوں کی بیویوں کیلئے شاپنگ کے ہزاروں مواقع بھی ہیں۔ لیکن کابل سے باہر کی دنیا آج بھی ان سورماؤں کیلئے خوف سے بھرپور ہے۔ اور یہ خوف کچھ ایسا بلاجواز بھی نہیں۔ اگر تاریخ کا کام صرف خود کو دہرانا ہی ہے تو افغانستان کے دور دراز علاقوں میں ظلم وزیادتی اور بڑھے گی اور اتنی زیادہ ہو جائے گی کہ ایک اور ملا عمر جنم لے گا، جو طالبان جیسی ایک اور ملیشیا بنائے گا اور ایک اور جہاد شروع ہوگا، ظالم سرداروں کے خلاف اور پھر ان کے امریکی سرپرستوں کے خلاف۔ کیا امریکہ وہ جنگ بھی جیتنا چاہے گا؟''

۲۲ فروری ۲۰۰۵ء کو اقوام متحدہ نے افغانستان کی تازہ صورتحال کے حوالے سے ایک رپورٹ جاری کی۔ اس رپورٹ میں کہا گیا کہ:

''طالبان حکومت کو گرائے جانے کے تین سال بعد بھی افغانستان ایک غریب ملک ہے جو عالمی امن کیلئے خطرہ بن سکتا ہے۔ تین سال بعد بھی ملک میں بے روزگاری، صحت اور تعلیم کے مسائل موجود ہیں۔ اگر ان حالات میں بہتری پیدا نہ ہوئی تو افغانستان ایک بار پھر بدامنی کا شکار ہو سکتا ہے۔ دنیا میں

افغانستان سے زیادہ غریب صرف تین افریقی ملک ہیں۔ افغانستان انسانی ترقی کے چارٹ پر دنیا کے ایک سو اٹھہتر ملکوں میں سے ایک سو تہترویں نمبر پر ہے۔ رپورٹ کے مطابق افغانستان میں ہر پانچواں بچہ پانچ سال کی عمر سے پہلے ہی فوت ہو جاتا ہے اور عام زندہ رہنے کی اوسط شرح چوالیس سال ہے۔ افغانستان میں بدامنی اور غربت سے سب سے زیادہ متاثر عورتیں ہوئی ہیں اور ہر آدھے گھنٹے میں ایک افغانی عورت زچگی کی پیچیدگیوں کا نشانہ بن جاتی ہے۔ افغانستان میں دنیا کا بدترین تعلیمی نظام ہے اور ملک میں بالغ شرح تعلیم صرف اٹھائیس اعشاریہ سات فیصد ہے۔ منشیات کا کاروبار آج بھی افغانستان کی معیشت کا اہم ستون ہے اور وہ آج دنیا کو منشیات مہیا کرنے والے ملکوں کی فہرست میں سب سے اوپر ہے۔ طالبان کو حکومت سے نکالے جانے کے باوجود جسمانی تشدد آج بھی جاری ہے۔ اگر افغانستان کے حالات نہ بدلے تو وہ پھر ایک غیر محفوظ سلطنت بن جائے گی جہاں نہ صرف اس کے اپنے شہری غیر محفوظ ہوں گے بلکہ وہ دنیا کے لئے بھی خطرہ بن جائے گا۔''

افغانستان پر امریکی قبضے کے بائیس ماہ بعد ایک یورپی صحافی لنڈ ایس ہرڈ نے افغانستان کا دورہ کیا اور وہاں کی صورتحال پر ایک زبردست تجزیہ پیش کیا، جس سے طالبان کے بعد افغانستان کی حقیقی تصویر سامنے آتی ہے۔ ہم لنڈ ایس ہرڈ کا یہ تجزیہ قارئین کے سامنے پیش کر رہے ہیں:

''امریکہ نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کی آڑ میں افغانستان پر جنگ مسلط کی تو ہزاروں افراد جنگ کی بھینٹ چڑھ گئے۔ امریکی و برطانوی میڈیا نے اس جنگ کو انسانیت کی بقاء کی جنگ قرار دینے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور اس کے لیے ہر قسم کا حربہ استعمال کیا گیا، خصوصا افغانی خواتین کے استحصال کے ایشو کو خاص طور پر ہوا دی گئی تا کہ عوام کے جذبات کو زیادہ سے زیادہ اپنے حق میں کیا جا سکے۔ طالبان دور کے بارے میں یوں تاثر دیا گیا جیسے وہاں پر خواتین کو زنجیریں پہنا کر گھروں میں بند کر دیا گیا تھا۔ جنگ کے خاتمے پر افغانستان کی تعمیر نو اور افغانی خواتین کے حقوق کی بحالی کے بارے میں بڑی

تقریریں کی گئیں۔اس سلسلے میں پوری دنیا کو پھر میڈیا کے ذریعے گمراہ کیا گیا۔ یوں تاثر دیا گیا گویا کہ افغانستان میں مثالی امن قائم ہوگیا ہے، خواتین کو تمام حقوق حاصل ہوگئے ہیں اور افغان عوام خوش ہیں۔ ۱۷/ نومبر ۲۰۰۱ء کو امریکی صدر بش کی اہلیہ لارا بش نے ریڈیو پر تقریر کی جس میں اس نے کہا کہ افغانستان پر امریکی قبضے سے افغانی خواتین کی ترقی کا نیا دور شروع ہوا ہے انہیں ہر قسم کی مکمل آزادی حاصل ہے۔ تعلیم حاصل کرسکتی ہیں، میوزک سن سکتی ہیں۔ لارا بش نے اس جنگ کو خواتین کے حقوق کی بحالی کی جنگ قرار دیا۔اس سے صرف دو دن کے بعد چیری بلیئر نے بھی اسی قسم کا بیان داغ دیا اور ایک تقریب میں اس بات کا اعلان کیا کہ افغانستان پر امریکی قبضے سے افغانی خواتین کو مکمل حقوق حاصل ہوگئے ہیں۔ ہیومن رائٹس کے بیرسٹر لارڈلی نے بیان جاری کیا کہ طالبان دور میں خواتین نیل پالش تک نہیں لگا سکتی تھیں کیونکہ طالبان ناخن اکھاڑ دیتے تھے مگر اب ایسی کوئی پابندی نہیں ہے، اب خواتین آزادی سے میک اپ کرسکتی ہیں۔ اسی طرح ٹونی بلیئر نے ایک جذباتی بیان دیا کہ افغانستان کے خلاف جنگ کا مقصد دہشت گردی کا خاتمہ اور خواتین کو طالبان کے پنجے سے نجات دلانا تھا، افغانستان کی خواتین ہماری ماؤں، بہنوں کی طرح ہیں، انہیں ان کا حق ملنا چاہئے، انہیں پڑھنے لکھنے اور گھروں سے باہر نکلنے کا حق ملنا چاہئے، خاص طور پر اگر کوئی خاتون اپنے حق پر ڈاکہ ڈالنے کے خلاف آواز اٹھانا چاہتی ہے تو اسے اس کا موقع ضرور ملنا چاہئے۔ یہ سب بیانات اس وقت کے ہیں جب افغانستان کی جنگ ابھی ختم ہوئی تھی۔ اس قسم کے بیانات کا مقصد صرف اور صرف افغانستان میں ہونے والی ہلاکتوں پر عالمی برادری کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے سوا کچھ ثابت نہ ہوا۔ جنگ کو ختم ہوئے ۲۲ ماہ گزر چکے ہیں مگر اب اس قسم کی باتیں کرنے والی لارا اور چیری یہ سمجھ رہی ہیں کہ افغان خواتین کے بارے میں بیانات جاری کرنے سے ان کے مسائل حل ہوگئے ہیں اور افغانستان میں امریکی حکومت کے زیر کنٹرول افغان خواتین کو تمام حقوق حاصل

ہو گئے ہیں، مگر صورتحال اس کے برعکس ہے۔ جب ایک امریکی فلم اسٹار اور مصنف نے افغانستان کا دورہ کیا اور دورے کے دوران افغانستان میں خواتین کے حقوق کیلئے کام کرنے والی تنظیم ''روا'' کی ایک اہم ممبر سے ملاقات کی تو اس نے بتایا کہ خواتین کیلئے اب حالات زیادہ خراب ہو گئے ہیں طالبان کے دور میں خواتین پر پابندیاں ضرور تھیں مگر ان کی عزتیں محفوظ تھیں اب ہمیں نام نہاد آزادی ضرور حاصل ہوئی ہے مگر خواتین پر حملے معمول بن گئے ہیں جس کی وجہ سے خواتین گھروں سے کم ہی نکلتی ہیں اور خواتین بدستور برقعہ استعمال کر رہی ہیں کیونکہ اب تو خواتین کو اپنی حفاظت کیلئے برقعہ اوڑھنا اور زیادہ ضروری ہو گیا ہے۔ افغانستان میں طبی سہولتوں کا جائزہ لیا جائے تو انتہائی مایوس کن صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا ہے، خاص طور پر خواتین اور بچوں کا حال بہت ہی خراب ہے لاکھوں افغان خواتین اور بچے ناقص اور کم خوراک ملنے کی وجہ سے مختلف بیماریوں کا شکار ہیں، بچوں میں اموات کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ ہر چار افغان بچوں میں سے ایک بچہ اپنی پانچویں سالگرہ منانے سے قبل ہی دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ افغانستان پر امریکی قبضے کو تقریباً ۲ سال ہو چکے ہیں۔ مگر تمام تر امریکی دعوؤں کے باوجود امن قائم نہیں ہو سکا، ہر وقت جنگ کا خطرہ رہتا ہے اور پھر جس طرح ہر معاشرے میں جرائم پیشہ عناصر متحرک ہو جاتے ہیں افغان سوسائٹی میں بھی ایسی ہی صورتحال ہے بلکہ صورت حال انتہائی تشویشناک ہے کیونکہ کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ ہیومن رائٹس واچ کی ایک رپورٹ کے مطابق خواتین اور لڑکیوں پر حملے دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں اور ان کا گھروں سے نکلنا مشکل ہو گیا ہے۔ ایسی صورت میں خواتین کیسے روز مرہ کی زندگی میں حصہ لے سکتی ہیں اور خواتین کا سیاسی مستقبل تو انتہائی مخدوش ہے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے ذریعے طاقت میں آنے والے جنگجو گروپوں نے انسانی حقوق کی کھلے عام خلاف ورزیاں شروع کر دی ہیں۔ ''تمہیں قتل کرنا ہمارے لئے بہت آسان ہے'' کے عنوان سے چھپنے والی

رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ کیسے پولیس اور فوج کے جوان عام شہریوں کو بلاوجہ پکڑ کر جیل میں بند کر دیتے ہیں اور کئی روز پوچھتے تک نہیں کہ آخر انہیں کیوں قید کیا گیا ہے؟ کوئی ملنے آئے تو اسے ملنے نہیں دیتے۔ حوالات عقوبت خانے بن گئے ہیں۔ طاقتور سردار گھروں میں داخل ہو کر زبردستی سامان اٹھا لیتے ہیں اور اس قسم کی کارروائیوں کے دوران اکثر خواتین کی عزت لوٹ لی جاتی ہے۔ طالبان کے دور حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی فرقہ واریت کو کافی ہوا ملی ہے، خاص طور پر شیعہ سنی فساد خطرناک صورتحال اختیار کرتا جا رہا ہے اور بعض مقامات پر تصادم بھی ہوا جس سے درجنوں افراد ہلاک ہو گئے۔ اصل میں افغانستان میں ابھی تک اسلحہ کے پھیلاؤ کو کنٹرول نہیں کیا جا سکا جس کی وجہ سے معمولی جھگڑا بھی جنگ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ امن و امان کی خراب صورتحال کی وجہ سے لڑکیاں ابھی تک اسکولوں کا رخ نہیں کر سکیں۔ اسکولوں کا رخ کریں بھی کیسے جب کسی کی عزت محفوظ نہیں ہے تو ظاہر ہے ڈر کے مارے گھر سے نکلا نہیں جا سکتا اسکول کھلے ہیں مگر پڑھنے والا کوئی نہیں ہے۔ نیویارک کی ایک فلاحی تنظیم ''ویمن فار افغان ویمن'' نے اعلان کیا کہ امریکہ اور اس کے اتحادی افغان خواتین کے حق میں کئے گئے وعدوں کو پورا کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ تشدد کے واقعات میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور طالبان کا دور حکومت امن کا گہوارہ معلوم ہونے لگا ہے۔ خاص طور پر جنوبی افغانستان میں اس وقت تشدد کے زیادہ واقعات پیش آ رہے ہیں۔ افغان گروپوں کا کہنا ہے کہ امریکی صدر کی طرف سے افغانستان اور عراق کیلئے ملنے والی امداد کا صرف ایک فیصد افغان عوام پر خرچ کیا جائے گا اور باقی کی رقم حکمرانوں کی عیاشیوں کی نذر ہو جائے گی اور افغان صدر حامد کرزئی کو ایک دفعہ پھر واشنگٹن کے سامنے کشکول پھیلانا پڑے گا تاکہ اسے امداد کے نام پر مزید بھیک مل سکے۔ افغانستان کے حکمران تو بڑے بڑے محلوں میں رہتے ہیں جبکہ ان کے عوام کے رہنے کیلئے جھونپڑا بھی میسر نہیں ہے، مگر طالبان نے خود جھونپڑوں اور کچے مکانوں میں رہ

کر اپنی عوام کو امن وامان، عزت، وقار اور سکون عطا کیا تھا۔''



طالبان کے جانے اور امریکہ کے آنے کے بعد افغان خواتین پر جنسی تشدد کے تشویشناک واقعات بھی سامنے آئے ہیں اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ایسے واقعات وہاں متعین امریکی افواج کی کوکھ سے جنم لے رہے ہیں۔ ایسے واقعات پر مشتمل کراچی کے ایک مؤقر اخبار روزنامہ امت نے ایک تحقیقی رپورٹ شائع کی۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ امریکی فوجی افغانستان کے مختلف علاقوں کے رہائشی مقامات، اسکولوں اور اسپتالوں سے خوبرو دوشیزاؤں کو طالبان اور القاعدہ کیلئے جاسوسی کے الزام میں گرفتار کر کے بگرام اور دیگر علاقوں میں قائم امریکی فوجی اڈوں کے قید خانوں میں بند کر دیتے ہیں۔ ان طالبات کی عمریں بارہ سے سترہ سال اور سترہ سے تیس سال کے درمیان ہوتی ہیں۔ گرفتاری کے بعد جنسی تشدد کا نشانہ بنا کر ان کی فلمیں بنائی جاتی ہیں جنہیں امریکی افسران اپنے ملک لے جا کر فحاشی پھیلانے والی کمپنیوں کو سستے داموں فروخت کر دیتے ہیں، بعد ازاں یہ فلمیں دنیا بھر میں سپلائی کی جاتی ہیں۔ انسانی حقوق کے عالمی ادارے ہیومن رائٹس واچ نے ایک سال قبل امریکی افواج کے ان جرائم کی نشاندہی کر کے افغان حکومت سے اس کے خلاف ایکشن لینے کی درخواست کی تاہم افغان حکومت نے خاموشی اختیار کی۔ رپورٹ کے مطابق امریکی افسران نے القاعدہ اور طالبان کے خطرے کا بہانہ بنا کر شمالی افغانستان کے صوبہ قندوز، فاریاب، سمنگان، بغلان، بلخ، شبرغان، جوز جان اور بامیان میں آپریشنل ہیڈ کوارٹرز کے نام سے اڈے بنوائے تاہم آج کل یہ تمام اڈے جنسی اذیت رسانی اور قحبہ گری کے سب سے بڑے مراکز میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ شمالی افغانستان میں القاعدہ کا کوئی وجود ہی نہیں تاہم امریکی فوجی افسران نے اپنی جنسی تسکین کیلئے وہاں بھی کروڑوں ڈالر کے فوجی ہیڈ کوارٹرز تعمیر کرائے۔ ذرائع کے مطابق امریکی فوجی افسران نے ملک کے متعدد علاقوں میں اپنی جنسی ہوس رانی کے لئے معصوم دیہاتی خواتین اور بچوں کی اغوا کاری کا سلسلہ بھی شروع کر دیا ہے۔ امریکی افسران کو جنوبی اور جنوب مغربی افغانستان میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی تاہم مرکزی اور شمالی افغانستان میں انہوں نے متعدد مقامی کمانڈروں کو خواتین اور بچوں کی اغوا کاری کیلئے بھرتی کرایا ہے۔ کنڑ میں اس مقصد کیلئے امریکی فوجیوں نے کمانڈر حضرت علی کے کزن کمانڈر موسیٰ کو بھرتی کیا ہوا ہے جبکہ ہمسایہ صوبہ نغمان میں کمانڈر عصمت اللہ کو اس مقصد کیلئے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ ہیومن رائٹس واچ کے مطابق متعدد

خواتین نے ان کے اہلکاروں کے سامنے بیان دیتے ہوئے اعتراف کیا کہ کمانڈر عصمت کی نفری نے انہیں گرفتار کر کے غیر ملکیوں کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔ کمانڈر موسیٰ اور اس کے بیٹے نے جلال آباد میں امریکیوں کیلئے پر تعیش مکانات بھی تعمیر کرا دیئے ہیں، صوبہ غزنی کے اضلاع شہرستان، مالستان اور جغتو میں بھی امریکی فوجی کیمپ بنائے گئے ہیں جہاں ہزارہ کمانڈر اعتمادی، حسینی، فرہادی وغیرہ امریکی افواج کیلئے ہزارہ خواتین اور بچے اغوا کر کے بہم پہنچاتے ہیں۔

ایک اور رپورٹ کے مطابق صوبہ زابل میں ایک مقامی باشندے نے ایک دن اپنی اہلیہ کو علاج کی غرض سے طبی مرکز پہنچایا۔ مرکز پہنچنے کے فوراً بعد خاتون کو اندر لے جایا گیا اور اسکے شوہر کو گھر بھیج دیا گیا کئی گھنٹے بعد جب خاتون اپنے گھر واپس آئی تو اس نے روتے ہوئے اپنے خاوند کو طبی مرکز میں خود پر بیتے گئے پورے واقعے کی روداد سنائی اور کہا کہ امریکی فوجیوں نے اسے اجتماعی طور پر ہوس کا نشانہ بنایا جبکہ واپسی پر اسے پندرہ سو ڈالر کی رقم بھی دی گئی۔ شوہر نے یہ سن کر پہلے اپنی بیوی کو موقع پر ہلاک کر دیا جبکہ کئی دیگر رشتہ داروں کو جمع کر کے طبی مرکز پر حملہ کر کے دس امریکیوں کو ہلاک کر دیا۔ بعد میں امریکی طیاروں نے بمباری کر کے انہیں بھی شہید کر دیا۔

امریکیوں کی آمد کے بعد یہاں جگہ جگہ قحبہ خانے بھی قائم ہو گئے ہیں، جہاں عورتوں کی جسم فروشی کا گھناؤنا کاروبار ہوتا ہے۔ صرف افغان دارالحکومت میں اس وقت ستر سے زائد لائسنس یافتہ قحبہ خانوں کے مالکان اپنے اڈوں میں موجود بدکردار عورتوں کی ایک فہرست افغان وزارت صحت کے ایڈز کنٹرول ڈیپارٹمنٹ اور اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے WHO کو فراہم کرنے کے پابند ہیں جبکہ اقوام متحدہ کے حکام بدکار عورتوں کا معائنہ کر کے انہیں ایڈز سے پاک قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ کابل کے بیشتر قحبہ خانوں پر WHO کے لوگو کے حامل بورڈ صاف نظر آتے ہیں جن پر لکھا ہوتا ہے کہ اس قحبہ خانے میں مصروف عمل تمام بدکردار عورتیں ایڈز کے وائرس سے پاک ہیں۔ افغانستان کے مختلف شہروں میں لائسنس یافتہ قحبہ خانوں کی تعداد درج ذیل ہے۔ کابل ۷۸، ہرات ۲۶، مزار شریف ۱۰۵، شبرغان ۷، قندوز ۴، بدخشاں ۷، قندھار ۲۴، خوست ۲، گردیز ۱، جلال آباد ۷، غزنی ۳۔

امریکیوں کے ہاتھوں افغان خواتین کی بے حرمتی کا ایک المناک واقعہ شمالی صوبہ تخار سے آنے والے ایک افغان باشندے معراج الدین نے بیان کیا۔ معراج الدین بتاتا ہے:

"صبح کے کوئی آٹھ بجے تھے کہ ہماری گاڑی صوبہ بغلان کے ضلع نہرین

کی حدود میں داخل ہوگئی، ہم شمال مشرقی صوبہ تخار سے کابل جانے کی نیت سے نکلے تھے۔ کابل جانے کا راستہ صوبہ بغلان کے ضلع نہرین سے ہو کر نکلتا ہے۔ نہرین کا علاقہ چونکہ طالبان کے حامی پختونوں کا گڑھ سمجھا جاتا ہے لہٰذا امریکی فوج نے ان کی بغاوت کچلنے کیلئے کابل تخار شاہراہ پر جگہ جگہ اپنے فوجی اڈے قائم کردیئے ہیں۔ ابھی ہم نہرین بازار سے کافی فاصلے پر تھے کہ پانچ خواتین نے سڑک کے بیچ میں پہنچ کر ہماری گاڑی روکنے کی کوشش کی۔ مسافر اور ڈرائیور یہ صورتحال دیکھ کر حیران بھی ہوئے اور پریشان بھی، اچانک پانچوں خواتین کا بیچ سڑک میں آنا حیران کن تو تھا ہی، ڈرائیور نے خوف کے مارے گاڑی بھگانے کی کوشش کی مگر مسافروں کی اپیل پر وہ گاڑی روکنے پر راضی ہوگیا۔ گاڑی رکنے کے بعد ابھی ڈرائیور کچھ بولنے کیلئے منہ کھول ہی رہا تھا کہ ایک ژولیدہ اور بکھرے بالوں والی خاتون نے اٹھ کر بڑی تکلیف کے ساتھ خود کو گاڑی تک پہنچایا۔ خاتون کے زرد چہرے سے نقاہت اور ایک قسم کا کرب ٹپک رہا تھا۔ اس نے بڑی تکلیف سے خود کو سنبھالا دے کر گاڑی میں بیٹھے مسافروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ کیا تم میں کوئی غیرت مند، مرد افغان موجود ہے؟ خاتون کے اس سوال پر تمام مسافر دل ہی دل میں ماجرا سمجھ گئے، مگر خاتون نے وقفہ کئے بغیر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ تمہیں شرم سے ڈوب مرنا چاہیئے کہ تمہاری بہنوں اور ماؤں کی عزتیں یوں سربازار لوٹی جارہی ہیں اور تم کاندھوں پر سر رکھ کر چلتے جارہے ہو، اس نے بتایا کہ پرسوں رات ہم تخار سے کابل جارہے تھے کہ نہرین میں واقع امریکی فوجی اڈے کے سامنے امریکیوں نے ہمارے گاڑی روک لی، انہوں نے ہمارے مردوں کو نیچے اتار کر انہیں بھاری تھیلیاں پہنائیں اور جیل میں ڈال دیا جبکہ ہم پانچوں کو اڈے میں منتقل کرکے مسلسل اجتماعی جنسی تشدد کا نشانہ بنایا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ امریکیوں نے تشدد سے قبل خود بھی شہوت برانگیختہ کرنے والی دوائیوں کا استعمال کیا جبکہ ہمیں بھی زبردستی دوائیاں دی گئیں، ان دوائیوں کے استعمال سے امریکی فوجیوں

سے انسانیت یکسر رخصت ہوگئی اور وہ بالکل درندے اور وحشی جانوروں کی شکل میں سامنے آ گئے۔ تیس سے زائد امریکی فوجیوں نے ہمیں مسلسل دوراتوں تک تشدد کا نشانہ بنایا۔ اپنی ہوس کی تکمیل اور ہماری بے ہوشی کے بعد انہوں نے آج صبح سویرے ہمیں گاڑیوں میں لا کر ادھر سڑک کے کنارے پھینک دیا جبکہ ہمارے مردوں کا اب تک کچھ پتہ نہیں چلا۔ خاتون بولے جارہی تھی اور آنسوؤں کا ایک سیلاب بڑی تیزی سے اس کی آنکھوں سے امڈا چلا آ رہا تھا۔ اس کی یہ غمگین سرگزشت سن کر ہمارے سر شرم سے جھک گئے مگر ہم کیا کر سکتے تھے؟ ہم نے تو بس یہی کیا کہ خاتون کو گاڑی میں بٹھا کر کابل پہنچا دیا......''



پوست کی لعنت کے خاتمے کیلئے طالبان کی کامیاب پالیسیوں کا ایک جائزہ آپ گذشتہ صفحات میں ملاحظہ کر چکے ہیں۔ یہاں ہم چند رپورٹیں اور تجزیے پیش کر رہے ہیں، جن میں طالبان کے بعد افغانستان میں پوست کی کاشتکاری میں زبردست اضافے پر اقوام متحدہ، مختلف حکومتوں اور عالمی میڈیا کی طرف سے تشویش کا اظہار کیا گیا ہے۔

قندھار سے طالبان کے انخلاء کے آٹھ ماہ بعد ۱۹/ اگست ۲۰۰۲ء کو کرزئی حکومت کے زیر انتظام کابل میں افغانستان کا ۸۳واں یوم آزادی منایا گیا۔ اس موقع پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے صدر حامد کرزئی نے دعویٰ کیا کہ طالبان حکومت کے خاتمے بعد افغانستان نے بہت ترقی کی ہے، تاہم اسی روز اقوام متحدہ کے ماتحت منشیات کی روک تھاک کے ادارے نے اعلان کیا کہ افغانستان کی نئی حکومت ملک میں پوست کی کاشت کو ختم کرنے کی کوششوں میں ناکام رہی ہے۔

اقوام متحدہ کے ایک ترجمان ہیکٹر ملیٹا کا کہنا تھا کہ حکومت افغانستان نے اپریل میں اس سلسلے میں جو مہم شروع کی تھی اس کے اثرات نہایت محدود رہے ہیں۔ اقوام متحدہ نے کہا کہ پوست کی پیداوار اب لگ بھگ ۹۰ کے عشرے کے اواخر کی سطح پر ہے، جبکہ طالبان نے پوست کی کاشت مکمل طور پر ممنوع قرار دے دی تھی۔ ہیکٹر ملیٹا نے انکشاف کیا کہ اس صورتحال میں افغانستان میں خوراک کی رسد بھی متاثر ہوئی، کیونکہ پوست کی کاشت کی وجہ سے گیہوں کی کاشت ۱۰ فی صد کم رقبے پر ہوئی ہے۔

طالبان حکومت کے خاتمے کے تقریباً گیارہ ماہ بعد ۲۶/اکتوبر ۲۰۰۲ء کو بی بی سی اردو ڈاٹ کام نے ''افغانستان: پوست کی پیداوار میں اضافہ'' کے عنوان سے اقوام متحدہ کی مندرجہ ذیل رپورٹ جاری کی:

''اقوام متحدہ نے افغانستان میں افیون کی پیداوار سے متعلق سروے رپورٹ میں تصدیق کی ہے کہ ملک میں پوست کی پیداوار میں انتہائی اضافہ ہوگیا ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ۲۰۰۰ء میں ایک اندازے کے مطابق تین ہزار چار سو میٹرک ٹن پوست کاشت کی گئی ہے جو کہ گزشتہ برس ایک سو پچاسی ٹن کے مقابلے میں اٹھارہ گنا زیادہ ہے۔ طالبان نے گزشتہ برس اپنے دور حکومت میں پوست کی کاشت پر پابندی عائد کردی تھی۔ منشیات اور جرائم پر قابو پانے سے متعلق اقوام متحدہ کے ادارے جس نے حالیہ رپورٹ جاری کی ہے، الزام لگایا ہے کہ ملک کے پسماندہ کسانوں نے طالبان حکومت کے خاتمے سے پیدا ہونے والے خلا کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پوست کی پیداوار میں دوبارہ اضافہ کردیا ہے۔ افغانستان میں افیون کی پیداوار میں حالیہ اضافہ برطانیہ اور منشیات پر قابو پانے سے متعلق اقوام متحدہ کے ادارے کے لئے ایک بری خبر ہے کیونکہ دونوں افغانستان میں افیون کے خاتمے کیلئے بین الاقوامی تعاون حاصل کرنے میں مصروف رہے ہیں۔ تاہم اقوام متحدہ نے جو اعداد و شمار اس سال کے شروع میں جاری کیے تھے ان کے مقابلے میں حالیہ رپورٹ میں شائع کیے گئے اعداد و شمار کے مطابق افیون کی پیداوار میں کہیں زیادہ اضافہ ہو چکا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ منشیات کی پیداوار ایک بار پھر اتنی ہوگئی ہے جتنی ۱۹۹۰ء کے عشرے کے آخری حصے میں تھی۔ اس وقت افغانستان دنیا میں تیار کی جانے والی افیون کا ستر فیصد حصہ تیار کر رہا تھا۔ تاہم اقوام متحدہ نے واضح کیا ہے کہ افغانستان کی نئی عبوری حکومت اور خود اقوام متحدہ پوست کی پیداوار میں اضافے کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ کیونکہ اس کے مطابق ملک کے بدحال کسانوں نے طالبان حکومت کے خاتمے کے باعث پیدا ہونے والی لاقانونیت کے نتیجے میں پوست کی کاشت میں دوبارہ اضافہ کیا ہے۔ اقوام متحدہ اب افغانستان کی نئی

حکومت کے ساتھ مل کر پوست کی غیر قانونی پیداوار پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہے۔ فروری ۲۰۰۳ء کے آغاز میں منشیات کی روک تھام سے متعلق اقوام متحدہ کی ایک ایجنسی نے خبردار کیا کہ افغانستان میں حکومت اور بین الاقوامی اداروں کی کوششوں کے باوجود بھی دنیا میں اس وقت سب سے زیادہ افیون افغانستان ہی میں پیدا کی جا رہی ہے۔ ایجنسی کے نئے سروے کے مطابق افغانستان میں بڑے پیمانے پر افیون کی کاشت کو ختم کرنا ایک طویل اور پیچیدہ عمل قرار دیا گیا۔ اقوام متحدہ کی اس رپورٹ میں کہا گیا کہ ۲۰۰۲ء میں دنیا میں جتنی پوست پیدا ہوئی تھی اس کی تین چوتھائی افغانستان میں پیدا ہوئی حالانکہ افغانستان میں منشیات کی پیداوار اور تجارت پر صدر حامد کرزئی نے پوری پابندی عائد کر رکھی ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا کہ یوں تو افغان حکام کے اقدامات منشیات کی روک تھام میں کلیدی اہمیت کے حامل ہیں لیکن ایک ایسے مسئلے کے حل کیلئے مزید بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے جس کی جڑیں برسوں کی خانہ جنگی اور کشاکش کی وجہ سے افغان معاشرے میں بہت گہری ہو چکی ہیں۔ منشیات اور جرائم کے اقوام متحدہ کے شعبے کے ڈائریکٹر انتونیو ماریا کوستا نے کہا کہ افغانستان میں بہت سے ستائے ہوئے لوگوں کیلئے پوست کی کاشت کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں ہے۔ غریب کسان، بیوپاری، عورتیں اور بچے، جنگجو سرداروں اور مجرموں کے بین الاقوامی ٹولوں کے رحم و کرم پر ہیں۔ رپورٹ میں کہا گیا کہ نوکریوں اور تعلیم کے بہتر مواقع، خاص طور سے عورتوں اور بچوں کے لئے پیدا کیے جائیں۔ انتونیو ماریا کوستا نے کہا کہ مسئلے کی علامات کو دور کر لینے سے کام نہیں چلے گا۔ افیم کی پیداوار اور تجارت کا قلع قمع ایک جمہوری نظام، قانون کی عملداری اور ترقی کے تحت ہی ہو سکتا ہے۔''

اسی ماہ کے آخر میں بی بی سی نے اقوام متحدہ کی پوست کی کاشت پر تشویش کے حوالے سے مندرجہ ذیل رپورٹ جاری کی:

''اقوام متحدہ کے منشیات پر قابو پانے والے بورڈ آئی این سی بی نے اپنی

سالانہ رپورٹ میں کہا ہے کہ اسے افغانستان اور پاکستان میں ایک مرتبہ پھر پوست کی کاشت شروع ہونے پر سخت تشویش ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ افغانستان میں ۲۰۰۲ء میں پھر دنیا میں افیون کی پیداوار میں پہلے نمبر پر آ گیا ہے جبکہ پاکستان کے چند قبائلی علاقوں میں پوست کی کاشت کی اطلاعات ہیں۔ انٹرنیشنل نارکانکس کنٹرول بورڈ یا آئی این سی بی اقوام متحدہ کے منشیات کے کنوینشنز پر عمل درآمد کی نگرانی کا ایک آزاد ادارہ ہے۔ اس کی رپورٹ افغانستان میں طالبان حکومت کے خاتمے کے بعد وہاں پوست کی کاشت میں زبردست اضافے پر بین الاقوامی تشویش کی عکاسی کرتی ہے۔ اسلام آباد میں ادارے کی سالانہ رپورٹ جاری کرتے ہوئے اقوام متحدہ کے منشیات اور جرائم کے ادارے کے ایک اہلکار تھامس زینڈل کرونن کا کہنا تھا کہ چونکہ افغانستان میں پیدا ہونے والی منشیات تمام ممالک تک پہنچتی ہیں اس لیے یہ ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ یورپ میں فروخت ہونے والی منشیات کا ۷۵ فیصد حصہ افغانستان سے آتا ہے۔ تھامس زینڈل کا کہنا تھا کہ افغانستان کی صورتحال بورڈ کیلئے کئی برسوں سے وجہ تشویش بنی ہوئی ہے۔ اقوام متحدہ کے مطابق افغانستان میں گزشتہ سال تین ہزار چار سوٹن افیون پیدا ہوئی جس سے یہ ملک ایک مرتبہ پھر دنیا کا منشیات تیار کرنے والا نمبر ایک ملک بن گیا ہے۔ رپورٹ کے مطابق یہ ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے اور اس سے نمٹنے کیلئے افغان حکومت کو بین الاقوامی برادری کی مدد کی ضرورت ہے۔ رپورٹ میں افغانستان کو ایسا کیمیائی مواد کی سمگلنگ روکنے پر بھی زور دیا گیا ہے جو کہ منشیات کی تیاری میں معاون ہوں۔''

۲۹/ اگست ۲۰۰۳ء کو بی بی سی نے اپنے نمائندے عمر آفریدی کا افغانستان اور پاکستان میں پوست کی کاشت کے حوالے سے ایک اہم تجزیہ پیش کیا۔ اس تجزیئے سے طالبان کی پوست کیخلاف کامیاب حکمت عملی اور طالبان کے بعد اس میں زبردست اضافے کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، عمر آفریدی کا تجزیہ ہم یہاں نقل کر رہے ہیں:

''اقوام متحدہ کے انسداد منشیات کے ادارے کا کہنا ہے کہ افغانستان کے دارالحکومت کابل میں ایک محتاط اندازے کے مطابق منشیات کے عادی افراد کی تعداد ۴۹۰۰۰ ہے جس میں سے ۲۴۰۰۰ چرس، ۱۱۰۰۰ افیم، ۷۰۰۰ ہیروئن اور ۷۰۰۰ شراب کی لت میں مبتلا ہیں۔ اس میں صرف شراب باہر سے آتی ہے جبکہ باقی منشیات افغانستان اور پاکستان کے بعض قبائلی علاقوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ جبکہ اس پیداوار کی زیادہ کھپت مغربی ملکوں میں ہوتی ہے۔ منشیات کی پیداوار، تیاری، خرید وفروخت اور استعمال ایک عالمی مسئلہ ہے۔ امریکہ میں غیر سرکاری شعبہ میں قائم ورلڈ واچ انسٹی ٹیوٹ کی ۲۰۰۳ء کی رپورٹ وائٹل سائنز کے مطابق اس وقت عالمی سطح پر تین سو سے پانچ سو ارب ڈالر سالانہ کی منشیات فروخت ہوتی ہیں جبکہ عالمی منڈی میں قانونی ادویات کی تجارت کا تخمینہ تین سو ارب ڈالر لگایا گیا ہے۔ دنیا کے کم سے کم ایک سو بیس ممالک میں چرس، پینتیس میں افیم اور صرف چھ میں کوکا کی پیداوار کی جاتی ہے۔ نوے کی دہائی کے اواخر میں دنیا بھر میں پیدا ہونے والی افیم کا ستر فیصد افغانستان میں پیدا ہوتا تھا تاہم ۲۰۰۱ء میں طالبان نے پوست کی کاشت پر مکمل پابندی عائد کر دی جس کے نتیجے میں افیم کی پیداوار ۳۲۷۶ ٹن سے کم ہو کر ایک ۱۸۵ ٹن تک گر گئی۔ تاہم افغانستان پر امریکی حملہ کے نتیجے میں طالبان حکومت کے خاتمہ کے بعد ۲۰۰۲ء میں افیم کی پیدوار میں زبردست اضافہ ہو گیا اور تین ہزار چار سو ٹن افیم پیدا ہوئی۔ افغانستان میں دو لاکھ سے ڈھائی لاکھ خاندان پوست کی کاشت کرتے ہیں جس سے انہیں اوسطاً تین سے چار ہزار امریکی ڈالر سالانہ کی آمدنی ہوتی ہے۔ افغانستان جیسے غریب ملک میں یہ ایک خطیر رقم ہے۔ طالبان حکومت کے خاتمے کا اثر پاکستان کے قبائلی علاقوں پر بھی پڑا ہے۔ پاکستان میں منشیات کے انسداد اور تحقیق کی کونسل (نارک) کے مشیر ذوالقرنین شاہ کا کہنا ہے کہ قبائلی علاقوں میں بھی آٹھ سو میٹرک ٹن افیم پیدا ہوئی۔ مئی کے مہینے میں وہاں درجہ اول کی چرس نو ہزار روپے فی کلو جبکہ گھٹیا درجے کی چرس کی قیمت ایک سو روپے

فی کلوتھی۔ اسی طرح تریا تازہ افیم کا بھاؤ بیس ہزار روپے کلو اور خشک کا بتیس ہزار روپے کلو تھا۔ اورکزئی ایجنسی کے ماموزی علاقے میں تقریباً دو سال پہلے تک علماء کی وجہ سے بھنگ یا پوست کی کاشت ناممکن تھی مگر اس سال وہاں بھی پوست کی کھیتی ''لہلہا'' رہی تھی۔ مقامی لوگوں کا کہنا تھا کہ افغانستان میں طالبان حکومت کے خاتمے کے بعد یا تو یہاں کے علماء خود کو کمزور محسوس کرنے لگے ہیں یا پھر انہوں نے خاموشی اختیار کر لی ہے۔ ایک کاشتکار جمعہ گل کا کہنا تھا کہ اس سال اکثر لوگوں نے پوست اس لیے کاشت کی ہے کہ ایک تو منڈی میں افیم کا نرخ بہت بڑھ گیا ہے اور مکئی کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ رقم ملتی ہے اور دوسرے یہ کہ یہ منشیات زیادہ تر مغربی ملکوں کو جاتی ہیں۔ اس لیے ان کے نزدیک یہ جائز ہے۔ نارک کے ایک اور رکن ڈاکٹر اقبال آفریدی کہتے ہیں کہ منشیات پر قابو پانے میں ناکامی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ تمام ادارے منشیات کی نقل وحمل پر قابو پانے میں مصروف ہیں جبکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے پیداوار کے مرحلے پر ہی ختم کر دیا جائے۔ انہوں نے بتایا کہ ایم بی بی ایس کے پانچ سالہ کورس میں منشیات کے علاج کے بارے میں کوئی باب موجود نہیں ہے۔ ذوالقرنین شاہ نے بتایا کہ جون ۲۰۰۰ء میں کراچی میں انسداد منشیات پر ایک سیمینار منعقد کیا گیا تھا جس میں نارک نے ''پوپی پرچیزنگ پروگرام یا پی پی پی'' کی تجویز پیش کی تھی۔ اس سیمینار میں اس وقت کے امریکی قونصلر جان بینٹ اور طالبان قونصلر رحمت اللہ کاکازئی بھی شریک تھے۔ پی پی پی کے منصوبے کا مقصد یہ تھا کہ کاشتکاروں سے بھنگ اور پوست کی فصل منڈی کے نرخ پر خرید لی جائے اور اس کے بعد اسے تلف کر دیا جائے۔ کیونکہ اس پر صرف تیس کروڑ ڈالر خرچ ہوں گے جبکہ انسداد کیلئے عالمی اقدامات پر ساٹھ ارب ڈالر سالانہ کی لاگت آتی ہے جس میں سے صرف امریکہ بتیس ارب ڈالر خرچ کرتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ تقریب کے اختتام پر امریکی قونصلر نے ازراہ مذاق کہا: ''یار! کیوں لوگوں کی نوکریوں کے پیچھے پڑ گئے ہو؟'' ذوالقرنین شاہ کہتے ہیں کہ اس کاروبار

کے پیچھے بہت سے لوگوں کے سیاسی مفادات بھی ہیں۔ مثلاً افغانستان میں روسی جارحیت کے خلاف جنگ کے دوران منشیات کا کاروبار زوروں پر رہا کیونکہ اس سے جنگ کیلئے سرمایہ باہم پہنچایا جاتا تھا۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس بار افغانستان کی تعمیر نو میں منشیات کی تجارت کوئی کردار ادا کرے گی؟''

۱۷/ستمبر۲۰۰۴ء کو امریکی صدر نے افغانستان میں پوست کی کاشت میں اضافے پر سخت تشویش کا اظہار کیا۔ صدر بش نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ ''حامد کرزئی کی حکومت افغانستان کے مختلف صوبوں میں منشیات پر کنٹرول حاصل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔'' افغانستان ان بائیس ممالک میں سے ایک تھا، جنہیں بش نے منشیات پیدا کرنے والے ملکوں کی فہرست میں شامل کیا۔ ان بائیس ممالک میں سے چودہ ممالک لاطینی امریکہ اور کیریبین سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن صدر بش کی اس تشویش کے باوجود عجیب بات یہ تھی کہ انہوں نے افغانستان کیخلاف یا کسی بھی دوسرے ملک کیخلاف پابندی کا فیصلہ نہیں کیا، حالانکہ بش انتظامیہ ہر سال منشیات پیدا کرنے والے ممالک کیخلاف پابندیاں لگاتی چلی آرہی تھی:

۲۴ستمبر۲۰۰۴ء کو امریکی وزارت خارجہ نے کانگریس کی ایک کمیٹی کو بتایا کہ افغانستان میں پوست کی کاشت میں تشویشناک حد تک اضافہ ہوا ہے۔ وزارت خارجہ کے انسداد منشیات کے شعبے کے ایک اہلکار رابرٹ چارلس نے کانگریس کی کمیٹی کو بتایا کہ اس سال افغانستان میں ایک لاکھ ایکڑ پر پوست کی کاشت کی گئی۔ انہوں نے کہا کہ یہ گزشتہ سال کے مقابلے میں بیس سے چالیس فیصد تک کا اضافہ ہے۔ رابرٹ چارلس کے بقول یہ اعداد وشمار اقوام متحدہ اور سی آئی اے کی ایک مشترکہ رپورٹ سے لیے گئے تھے جو کچھ دنوں بعد شائع ہونی تھی۔ دریں اثناء افغانستان کے صدر حامد کرزئی نے اعتراف کیا کہ پوست کی کاشت اور منشیات کی اسمگلنگ افغانستان میں جمہوریت کے استحکام اور سیکورٹی کیلئے ایک بہت بڑا خطرہ ہے۔

۱۸ نومبر ۲۰۰۴ء کو امریکہ نے افغانستان میں منشیات کی پیداوار کو ختم کرنے کیلئے ایک نئے منصوبے کا اعلان کیا جس کے تحت امریکہ پوست کی کاشت ختم کرنے پر ۷۸۰ ملین ڈالر خرچ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ایک امریکی اہلکار نے بتایا کہ سات سو ملین ڈالر کے اس پیکج میں پوست کی کاشت ختم کرنے کے علاوہ کاشتکاروں کیلئے متبادل ذریعہ آمدن پیدا کرنے پر خرچ کیے جائیں گے۔ اس امریکی منصوبے کی خبر کے ساتھ بی بی سی نے اپنے تجزیئے میں کہا کہ طالبان کی حکومت کے خاتمے کے بعد

افغانستان میں پوست کی کاشت میں تشویش ناک حد تک اضافہ ہوا ہے۔ ماہرین کے مطابق افغانستان میں پوست کو ملک کی معیشت میں اہم حیثیت ہے۔

فروری ۲۰۰۵ء میں برطانوی وزیر خارجہ جیک اسٹرا نے افغان دار الحکومت کابل کا دورہ کیا تو ان کے دورے کے اہم مقاصد میں سے ایک یہ بھی بتایا گیا کہ برطانیہ افغان حکام سے مذاکرات کر کے منشیات کی اسمگلنگ کی روک تھام کیلئے اہم اقدامات کرنا چاہتا ہے، کیونکہ مغربی ممالک میں استعمال ہونے والی ہیروئن کا نوے فیصد حصہ افغانستان سے ہی جاتا ہے۔

یکم مارچ ۲۰۰۵ء کو پاکستان نے بھی خدشہ ظاہر کر دیا کہ بین الاقوامی برادری کی دہشت گردی کیخلاف مہم سے انسداد منشیات کے اقدامات متاثر ہو رہے ہیں جس کی وجہ سے افغانستان میں پوست کی کاشت میں خاصا اضافہ ہوا ہے اور خطرہ ہے کہ پاکستان میں پوست کو ذخیرہ کرنے کے اسٹور اور ہیروئن کی لیبارٹریاں دوبارہ سے جنم لیں گی۔ اینٹی نارکوٹکس فورس کے سربراہ میجر جنرل ندیم احمد نے ایک پریس کانفرنس میں بتایا کہ افغانستان میں اس سال پوست ایک لاکھ اکتیس ہزار ہیکٹر پر کاشت کی گئی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ۲۰۰۳ء سے پاکستان میں بھی پوست کی دوبارہ کاشت شروع ہوگئی ہے جس میں سے تقریباً اسی فیصد فصل کو تباہ کر دیا گیا ہے۔ تاہم انہوں نے کہا کہ بین الاقوامی برادری کی عدم توجہی اور پاکستان کو اس سلسلے میں قلیل امداد سے اس بات کا خطرہ بڑھے گا کہ پاکستان میں پوست کی کاشت اور افغانستان میں کاشت کی گئی پوست کی پاکستان کے راستے اسمگل کی جائے گی۔

مارچ ۲۰۰۵ء ہی میں اقوام متحدہ کے ادارے ڈرگ کنٹرول کی تیار کردہ رپورٹ میں افغانستان میں افیون کی کاشت کو تشویشناک قرار دیتے ہوئے کہا گیا کہ گزشتہ سال ۴ ہزار ۲ سو میٹرک ٹن افیون کاشت کی گئی تھی جو عالمی سطح پر فروخت ہونے والی منشیات کا ۸۷ فیصد بنتی ہے۔ رپورٹ کے مطابق افغانستان میں امریکہ اور اس کی اتحادی افواج کی جانب سے جنگ کے آغاز کے بعد افیون کی کاشت میں اضافہ ہوا ہے جس کی وجہ سے افغان حکومت اور عالمی برادری نے افغانستان میں منشیات اور پوست کی کاشت کے خاتمہ کو اپنی اولین ترجیح قرار دیا ہے۔ اقوام متحدہ کی اس رپورٹ میں بتایا گیا کہ گزشتہ ۲ سال میں پوست کی کاشت ۷۴ ہزار ایکڑ رقبے سے بڑھ کر ایک لاکھ ۳۱ ہزار ایکڑ رقبے تک پہنچ گئی ہے۔ اقوام متحدہ کے ادارے یو این او ڈی سی کے مطابق افغانستان میں گزشتہ سال افغانستان میں منشیات کے تاجروں نے ۲ ارب ۲۰ کروڑ ڈالر کا کاروبار کیا۔ افغانستان میں اس وقت ۳ لاکھ ۵۶ ہزار خاندانوں سے

تعلق رکھنے والے ۲۳ لاکھ افراد منشیات کی پیداواری سرگرمیوں میں ملوث ہیں جبکہ ۱۵ ہزار افراد منشیات کی ڈیلنگ کر رہے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق منشیات کی خرید وفروخت کیلئے افغان سرحدی صوبہ ننگرہار میں ہول سیل اسٹرکچر قائم کیا گیا اور افغان حکومت منشیات کی فصل کو رضا کارانہ طور پر تلف کرنے میں ناکام ہوگئی ہے کیونکہ کاشتکاروں نے متبادل کے طور پر ساڑھے تین سو امریکی ڈالر فی ایکڑ معاوضہ مسترد کرتے ہوئے ۳ ہزار امریکی ڈالر معاوضے کا مطالبہ کیا ہے جبکہ کئی کاشتکاوں نے معاوضہ وصول کرنے کے باوجود نارسا پہاڑی علاقوں میں افیون کی فصل کاشت کی ہے۔

پوست کی بڑھتی ہوئی پیداوار کے حوالے سے اقوام متحدہ کی اس رپورٹ کے منظر عام پر آنے کے بعد، امریکہ نے افغانستان پر کافی برہمی کا اظہار کیا، چنانچہ امریکہ نے افیون کی کاشت اور منشیات کی اسمگلنگ روکنے میں ناکامی پر افغان حکومت کی امداد روکنے کی دھمکی دے دی۔ اس دھمکی کے ساتھ ساتھ امریکہ نے افغانستان میں منشیات کی پیداوار کے حوالے سے اپنی رپورٹ میں کرزئی حکومت پر برہمی کا اظہار کرتے ہوئے خبردار کیا کہ وہ منشیات کی کاشت والے علاقوں میں اپنی افواج تعینات کرسکتا ہے۔ امریکی وزیر خارجہ کونڈ ولیزا رائس کی جانب سے کانگریس میں پیش کردہ سالانہ صدارتی رپورٹ میں کہا گیا کہ افغانستان میں ۲۰۰۳ء کے مقابلے میں ۲۰۰۴ء میں ایک سال کے دوران پوست کی پیداوار میں تین گنا اضافہ ہوا ہے جو کہ ملکی استحکام کیلئے خطرناک ہے۔ رپورٹ کے مطابق ۲۰۰۴ء میں افغانستان میں ۵ لاکھ ۱۰ ہزار ایکڑ رقبے پر افیون کاشت کی گئی جو ۲۰۰۳ء کے مقابلے میں ۳ گناہ زائد ہے۔ رپورٹ میں مزید کہا گیا کہ صدر کرزئی کی حکومت افغانستان میں منشیات کی تجارت کے خلاف جنگ میں اب تک ناکام رہی ہے اور طالبان حکومت کے خاتمے کے ساڑھے ۳ سال بعد افغانستان کے منشیات کا اڈہ بننے کا خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔ امریکی وزارت خارجہ کی رپورٹ کے مطابق افغانستان میں پیدا ہونیوالی پوست عالمی سطح پر ہیروئن بنانے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور اس کی کاشت سے افغان حکومت کے مخالف گروپوں کو تقویت مل سکتی ہے۔ رپورٹ کے مطابق امریکا کی طرف سے سالانہ لاکھوں ڈالر امداد کے باجود افغان حکومت ہیروئن کی تیاری، افیون اور چرس کی اسمگلنگ روکنے میں بری طرح ناکام رہی ہے۔

اپریل ۲۰۰۵ء میں روسی اداروں نے یہ حیرت انگیز انکشاف کیا کہ افغانستان سے ہیروئن کی اسمگلنگ اور کاشت میں امریکی حکام ملوث ہیں۔ گزشتہ ۳ سال سے امریکی ادارے بعض جنگجو کمانڈروں کے ذریعے ہیروئن یورپ پہنچانے میں مصروف ہیں۔ یہ انکشاف روسی وزارت داخلہ اور فیڈرل سیکورٹی

سروس کی مشترکہ رپورٹ میں کیا گیا۔ روسیوں کی اس رپورٹ کے مطابق افغانستان میں امریکی مداخلت کے بعد پوست کی فصل قابل کاشت رقبے پر ۵۲ فیصد تک پہنچ گئی ہے جبکہ روسی مداخلت کے دوران یہ کاشت صرف ۲۰ فیصد تھی۔ رپورٹ میں روسی حکومت سے اپیل کی گئی کہ وہ وسطی ایشیا کے راستے یورپ کو ہیروئن کی اسمگلنگ روکنے کیلئے مؤثر قانون سازی کرے اور دیگر ممالک سے مشترکہ طور پر ایک ایسا معاہدہ کیا جائے تاکہ امریکی حکام کی جانب سے ہیروئن کی اسمگلنگ کو روکا جاسکے۔ رپورٹ میں کہا گیا کہ روسی سیکریٹ سروس کی تحقیقات کے مطابق شمالی افغانستان کے ۱۵ سے زائد کمانڈر اس سلسلے میں امریکی حکام کی مدد کررہے ہیں۔ یہ کمانڈر طالبان کے خلاف امریکی اتحادی رہے ہیں۔



۱۲

طالبان کیوں یاد آتے ہیں؟

ربِّ رحمان کے بندے طالبان عالی شان، اہل پاکستان کیلئے بلاشک وشبہ اللہ کا بہت بڑا احسان تھے۔ دیمک خوردہ دماغ اور زخم خوردہ روح رکھنے والے ہمارے پالیسی سازوں کو اب اس حقیقت کا احساس ہو رہا ہے کہ وہ کیا متاعِ عزیز تھی جو انہوں نے گم کر دی، وہ کیا شمع تھی جس کے بجھتے ہی سرزمین افغانستان پر پاکستانی مفادات گھٹا ٹوپ اندھیروں میں گم ہو گئے۔ وہ کیا بےلوث سپاہی تھے جنہوں نے بڑے بڑے خطرات کو ہم سے روک رکھا تھا۔ وہ کیا کھرے لوگ تھے کہ بھارت سے صرف اس لیے بگاڑے رکھی کہ وہ پاکستان مخالف ہے۔

گیارہ ستمبر کے خوفناک حملوں نے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کا سارا ملبہ ہماری عقلوں پر ڈال دیا، اسی لیئے تو ہم بھول گئے کہ ملت فروشی اور برادر کشی جیسا المناک رویہ ہمارے ہاتھوں سرزد ہو رہا ہے۔ ہم نے فراموش کر دیا کہ میر جعفر اور میر صادق جیسے کرداروں پر آج ان کی اولاد بھی چار حرف بھیجتی ہے۔ اضطراب اور بےسکونی کے ان دنوں میں جن لوگوں کی کوئی ''سب سے پہلے پاکستان'' پر اٹکی ہوئی تھی، وہ جواب دیں کہ پاکستانی سرحدات طالبان کے دور میں زیادہ محفوظ تھیں یا آج؟ بلوچستان جو آج ہمارے لئے گہری دلدل اور تپتے صحرا میں تبدیل ہو رہا ہے، اس کے پس منظر میں موجود افغان سرزمین پر چار بھارتی قونصل خانے کس کی مدد اور تعاون سے قائم ہوئے؟ اپنے پاؤں پر کلہاڑی چلانے والے عقل وخرد سے عاری لوگ، اب کلہاڑی کو الزام نہ دیں کہ وہ ان کے اپنے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی ہے۔

طالبان ایک حقیقت ہیں۔ ان کا کردار کھلی ہوئی کتاب کی مانند اقوام عالم کے سامنے ہے۔ جو لوگ روز مچھروں کی طرح وجود میں آتے ہیں اور چیونٹیوں کی طرح فناء ہو جاتے ہیں، وہ کیا جانیں کہ

تاریخ کی پیشانی کا حسین جھومر، انسانیت کے چہرے کا غازہ، اعلیٰ اخلاق و کردار کے امین، بلند ہمت، باضمیر اور بامروّت امیر المؤمنین ملا محمد عمر المجاہد جیسے لوگ ہی اپنے نظریے پر حکومت اور ریاست قربان کرنے کی طاقت رکھتے ہیں، ورنہ ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں؟

ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ طالبان کی خارجہ پالیسی کیا تھی؟ وہ امریکہ جیسی طاقت سے کیوں مرعوب نہیں ہوتے تھے؟ انہیں اپنے پڑوس میں روس جیسی مضبوط ریاست کیوں نہیں ڈرا سکتی تھی؟ ہمیں تو بحیثیت ایک مسلمان ہونے کے طالبان سے محبت و عقیدت اس لیے ہے کہ انہوں نے چند روزہ دور حکومت میں قرآن کریم کو گھروں اور مساجد کی الماریوں سے نکال کر عدالت اور بازار میں قانون کا درجہ دے دیا، انہوں نے اللہ کی زمین پر اللہ کا نظام نافذ کر کے ثابت کر دیا کہ جدید دور، اکیسویں صدی، ماڈرن اسلام، عالمی برادری اور انسانی حقوق یہ سب نہ کرنے کے بہانے ہیں اور:

''جو تو ہی نہ چاہے تو بہانے ہزار ہیں''

انہوں نے بامیان کے بت گرا کر ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی بت شکنی کی یاد تازہ کر دی، انہوں نے چیچنیا کی آزاد مسلم ریاست کو سب سے پہلے تسلیم کر کے حق اخوت ادا کر دیا، انہوں نے حاکم اور رعایا کے درمیان فرق کو مٹا کر اس تیسری دنیا کی روایت ہی بدل ڈالی جہاں کے عوام بھوکوں مرتے ہیں اور اراکین پارلیمنٹ بدہضمی کی وجہ سے کوچ کر جاتے ہیں، جہاں رعایا بے گھر اور بے در ہوتے ہیں لیکن صدر اور وزیر اعظم کے ایوان پورے شہر کا منظر پیش کرتے ہیں۔

انہوں نے سیدھا سادھا اور صاف ستھرا عدالتی نظام قائم کیا جہاں انصاف سربلند اور ظلم سرنگوں ہوتا تھا، انہوں نے ایک مسلمان ملک میں عیسائی مشنریوں کے عزائم کو بے نقاب کرتے ہوئے ان کو لگام دی۔ انہوں نے ہمہ وقت حالت جنگ میں ہونے کے باوجود اپنے عوام کی زندگی آسان بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ سچ تو یہ ہے کہ طالبان نے تاریخ کے دھارے کو موڑ دیا۔ دنیا بھر کے مظلوموں کو ظلم کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہونے کا سبق سکھایا اور تہذیب کے خوشنما پردوں میں پوشیدہ عالمی غنڈوں کی ہر بات ماننے سے انکار کر دیا۔

بلاشبہ طالبان نے وہ سب کچھ کر دیا، جو کچھ وہ کر سکتے تھے، اسی لیے تو دنیا بھر کا کفر اور نفاق ان کے مقابلے میں یکسو اور متحد تھا اور ہم نے میڈیا میں یہ مناظر بھی دیکھے کہ امریکی، آسٹریلوی، برطانوی اور فرانسیسی نومسلم بھی طالبان کے شانہ بشانہ برسرپیکار تھے۔ گویا طالبان حق و صداقت کی وہ شمع فروزاں تھے

جن کی طرف فرزندانِ توحید پروانہ وار لپکتے تھے۔

آج کی زندہ حقیقت یہ ہے کہ غیروں کی بمباری اور اپنوں کی ستم رانی کے باوجود طالبان اپنے پورے عزم وحوصلے کے ساتھ موجود ہیں۔ ذرائع ابلاغ میں جگہ پانے والے ان کے حملے ان کی توانائی اور جوانی کی دلیل ہیں۔ وہ بوریا نشین ایسے نہ تھے جنہیں صرف اپنی حکومت اور صدارت بچانے کیلئے ایمان اور غیرت کی قربانی دینی پڑتی، وہ کل قصر شاہی میں تھے تو ان کے بال و پر سلامت تھے اور آج پہاڑوں کی چٹانوں پر بسیرا کر چکے ہیں تو بھی ان میں شاہین کی ساری خوبیاں موجود ہیں۔

طالبان یاد آتے ہیں، ہمیں بھی اور ان کو بھی جو نہ چاہتے ہوئے بھی ان کو چاہتے ہیں۔ آپ اسی کتاب میں ان لوگوں کے خیالات بھی پڑھیں گے جو طالبان کے بدترین نظریاتی مخالف ہیں۔ اقوام متحدہ اب لاکھوں ڈالر خرچ کر کے منشیات کے کاروبار کو کنٹرول نہیں کر سکی تو اب اسے بھی وہ درویش صفت طالبان یاد آتے ہیں، جن کے امیر کے ایک حکم سے منشیات کا دھندا سو فیصد ختم ہو گیا تھا۔

طالبان یاد آتے ہیں اور کیوں نہ آئیں کہ انہوں نے جس طرح وفا کے پھولوں سے زمانے کی مانگ بھر دی اس کے سامنے وفا کی عشقیہ داستانیں بھی ہیچ در ہیچ نظر آتی ہیں۔



